ھما (بیگم اخلاق حسین)

جوئبار

مختلف اشعار۔ غزلیں۔ قصیدے۔ گانے۔ مرثیے۔ سلام۔ نوحے۔ رباعیات۔ مثنویاں۔
مکرنیاں۔ پہیلیاں۔ واکہوس (واسوخت) کا دلپذیر مجموعہ

قیمت بارہ روپے

مکتبہ دانیال

وکٹوریہ چیمبرس۔ عبداللہ ہارون روڈ صدر۔ کراچی۔

جوئبار

کہ تا یکدم بیاسائم زِ دُنیا و شر و شورش

ہما اخلاق حسین

فیروز سنز لمیٹڈ

۶۰ دی مال — لاہور
۳۵ دی مال — پشاور
بندر روڈ — کراچی

مطبوعہ: ناظر پرنٹنگ پریس۔ کراچی

انتساب

انسانیّت کے سچّے وارثوں کے نام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ حال

اس سے پہلے کہ اصل کتاب پیش کروں، یہ عرض کردوں کہ ع "یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے" کہ صحیح معنوں میں جس کو کتاب کہتے ہیں، وہ میں لکھ سکوں۔ کتاب لکھنے کے لئے بڑی علمی قابلیت اور چند خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھ میں نہیں ہیں۔ البتہ ایک خاص جذبہ ضرور ہے جو اس ناچیز کو عملی قدم اُٹھانے کیلئے پورے بھروسے کیساتھ تیار کردیتا ہے۔ بھروسا بھی اپنے اُوپر نہیں بلکہ آپ لوگوں کے اُوپر ہے، وجہ یہ ہے کہ مجھے دنیا کے ہر غیر معلوم شخص پر اعتماد اور ہر انسان سے ایک قسم کی انسانی قربت سی محسوس ہوتی ہے۔ کسی سے یہ ڈر نہیں ہوتا کہ وہ مجھ پر اعتراض کریگا یا مجھے بُرا کہیگا۔ ساتھ ہی یہ بھی لوگوں کا جائز حق سمجھتی ہوں کہ وہ ہر چیز کو نقادی کی نظر سے دیکھیں اور آزادانہ رائے قائم کریں۔ میرا فرض صرف اتنا ہے کہ بخلوصِ نیت و جذبہ جس چیز کو سمجھتی ہوں کہ یہ دنیا کے لئے خوش آیند یا لوگوں کی تفریحِ طبع کا باعث یا سب کیلئے مفید ہوسکتی ہے، اس کو محنت کرکے تحفتہً پیش کردوں اور یہ سوچکر خوش ہوں کہ ع "گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!"

اس کتاب میں باقاعدہ کوئی ادبی نکتے نہیں ہیں۔ کوئی سنجیدہ مضمون نہیں ہے بلکہ کچھ اِدھر اُدھر کے مختلف اشعار، غزلیں۔ قصیدے۔ گانے۔ مرثیے۔ سلام۔ نوحے۔ رباعیات۔ مثنویاں۔ مکرنیاں۔ پہیلیاں۔ واکھت (واسوخت) اکٹھا کردیئے ہیں۔ اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ خیالات کا ستھراپن۔ زبان کا لطف اور اندازِ بیان کی چاشنی جو شاعری کی جان ہیں، اشعار میں موجود ہوں ــــ بے اصل باتوں سے بھی چونکہ میری طبیعت کو لگاؤ

نہیں ہیں اس لئے آپ کو وہ اشعار بھی اس کتاب میں شاید کم ہی ملیں جو فطری کیفیات و جذبات سے دُور ہو کر محض شاعری کی مُبالغہ آمیزیوں کی رَو میں کہے گئے ہوں۔ اس بنا پر ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہو کہ شاعری کی خصوصیات ان اشعار میں کم ہیں مجھے اس کی تردید نہیں کرنا ہے کیونکہ دراصل یہ اشعار تو میری اپنی ہلکی پھلکی پسند ہیں، کسی پر عائد نہیں کرتی ہوں۔ اپنا دل چاہا۔ اپنی پسند یکجا کر لی کہ تھوڑی سی زندگی میں بغیر کسی گناہ کی شمولیت کے اور بلا کسی کو نقصان پہنچائے ہوئے خالص دماغی فرحت نصیب ہو جائے گی۔ اور اگر کسی اور کا بھی خالی وقت اس کتاب کی وجہ سے اچھا گزر جائے تو کیا کہنا۔ اپنے کو خوش قسمت سمجھونگی۔

اس کتاب کے مسوّدے کو اِدھر اُدھر سے پڑھنے کے بعد لکھنؤ کے ایک پڑھے لکھے اور باذاق صاحب نے فرمایا کہ اس انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اِس خامی کے باوجود کہ اس میں پوری غزل یا نظم پڑھنے کی تسلی نہیں ہے وہاں یہ مخصوص اور نمایاں پہلو بھی ہے کہ ایک ہی ردیف، قافیے اور ترنم کے سلسلے سے دماغ کو جو دھوکا ہوتا ہے اُس سے بچا کر یہ پڑھنے والے کو بقدرِ مذاق و صلاحیت نقادانہ ہوش و نظر کی دعوت دیتا ہے یعنی دماغ کو نقادی کی نظر پر باخبر رہنے کا لازمی موقع ملتا ہے۔ یہ نکتہ میری سمجھ میں پہلے سے نہیں آیا تھا اور نہ میں نے اس خیال کے تحت میں انتخاب کیا تھا۔ بلکہ میں نے تو جیسا پہلے بھی عرض کیا کہ جو اپنے کو اچھا لگا وہ لکھا۔۔۔ یا کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر کا کلام مفقود ہونے کی وجہ سے دو ایک اشعار پڑھا دینا پڑے جو میری خاص پسند کے نہ تھے!

افسوس یہ ہے کہ اس انتخاب کو حسب خواہش مکمّل کرنے کے لئے مجھے ضرورت کی کتابیں یہاں نہیں مل سکیں۔ محترمی خواجہ منظور حسین صاحب کی ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے دو ایک کتابیں دیں۔ کئی ایک بڑی جدّوجہد کے بعد ہندوستان سے منگوائیں۔ کچھ میرے والد چودھری محمد علی صاحب نے بھیجیں۔ کچھ

مختلف اشعار شاہ آفاق احمد صاحب ردولوی نے لکھکر بھیجے جن کی بہت ممنون ہوں۔ ہمارے کرمفرما جوش صاحب اور جگن ناتھ آزاد صاحب نے بھی اپنی دو۔ دو کتابیں عنایت فرمائیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ اُس وقت ملیں جب اس انتخاب کی کتابت مکمّل ہو چکی تھی۔ آئندہ کی امیّد پر اُن کو بصد شکریہ رکھے ہوئے ہوں۔

آخر میں نمونتاً اس انتخاب کے کچھ اشعار معہ وضاحت لکھدوں تاکہ انتخاب کس قسم کا ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ پڑھنے والوں کو ہو جائے۔ یہ عرض کرنا بھی مدّعا ہے کہ اس دنیا میں ہر پہلو سے مکمّل چیزیں بہت کم ہیں۔ نہ انسان مکمّل ہے ـــــ نہ اس کا ہر فعل مکمّل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر و بیشتر شاعر کے شعر کا اگر ایک پہلو مکمّل ہے تو دوسرا کمزور پڑ گیا ہے۔ البتہ میر انیس کے یہاں تو مجھے ایک لفظ کا بھی صرف بیجا نظر نہیں آیا اور نہ الفاظ و معانی کا توازن بگڑنے پایا ہے۔

آپ خود ہی دیکھئے ـــــ حکیم جلال لکھنوی ایسے مشہور و معروف شاعر کا شعر ہے:-

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو　　　پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا!

کیا کہنا لفظوں کی سجاوٹ اور آرائش کا! بہت عمدہ ہے لیکن نشست الفاظ کے سامنے جذبات مدّھم ہیں۔

دوسرے شاعر کا ایک بند ہے جس میں جذبات پورے پورے ہیں، مگر آخر میں بیت کمزور ہو گئی ہے:-

اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدّق　　　اے دوش نبی تیرے سواروں کے تصدّق!

کوثر! ترے مختار کے پیاروں کے تصدّق　　　رضواں! ترے گلشن کی بہاروں کے تصدّق!

سمجھیں گے یہ وہ۔ عارف حق۔ بندۂ مومن جو ہیں

نیکوں میں حسینؑ و حسنؑ اللہ کے دو ہیں ـــــ تیسری مثال ہیں

انسانی تعلّقات کی گہرائی تو مسلّم ہے مگر لفظوں کا تال میل خوبصورت نہیں ہے:-

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی　　　کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

اب میر انیس کے یہاں عظمتِ نفس اور سیرت صحیحہ کے کمال کی مکمل تصویر ملاحظہ ہو:-

جب رات عبادت میں بسر کی۔ شہ دیں نے　　　سجدوں میں ہم عشق کی سر کی۔ شہ دیں نے

دیکھا جو سپیدی کو سحر کی۔ شہ دیں نے　　　مڑ کر رُخِ اکبر پہ نظر کی۔ شہ دیں نے

فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا!!

لو اُٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا!

میر تقی میر بھی حقیقت کی تصویر کھینچنے میں بڑے باکمال اُستاد تھے۔ فرماتے ہیں:-

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو　　　ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

یہ شعر صرف ایک پختہ کار اُستاد ہی کہہ سکتا ہے۔ مرزا غالب ..... کی بلندیٔ نظر دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

محابا کیا ہے ہیں ضامن! ادھر دیکھ　　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

دوسرے مقام پر تہذیب اور تمدن کا یوں مظاہرہ کرتے ہیں:-

درخورِ عرض نہیں جوہر بیداد کو جا　　　نگہ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

پیارے صاحب رشید کا دوسرا رنگ ہے۔ انکے یہاں شاعری کے حُسن رنگار اور جذبات کی ملی جلی ہوئی بہت گلکاریاں ہوتی ہیں جو صرف اُنہیں کا حصّہ ہیں۔ سُنیئے:-

پھول کھلنے لگے۔ بلبل کی صدا آنے لگی　　　کی نظر باغ پہ۔ صحرا کی فضا آنے لگی!

غنچے گل ہونے لگے۔ بادِ صبا آنے لگی　　　ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی

بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے　　　زلفیں ہلنے لگیں۔ دامانِ قبا اُڑنے لگے

اسی قسم میں ایک ہلکا پھلکا سا شعر اور سُن لیجئے۔ یہ بھی اپنی جگہ پر مکمل ہے اور خوب کہا ہے :۔

دامن جو چھو گیا ہے کسی گلعذار کا
ملتا نہیں مزاج نسیمِ بہار کا!

یہ تو ہوئے اس قسم کے اشعار جو چوٹی کے کہے جا سکتے ہیں، اور جہاں ہر موضوع میں طرزِ ادا خوب ہے۔ اب آیئے اُن اشعار پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جن میں فکر اور مطالب تو کافی سے زیادہ ہیں مگر شاعری کے مکمل حسن کی خصوصیات کم ہیں۔ مثلاً ہادی سلطانپوری کا کلام ہے :۔

زباں سے جز ثنائے حق کچھ اور کام کم کئے
ہوا محل تو بات کی۔ جو بات کی تو کام کی

دل ایک صفحہ نور کا اور اس پہ لاکھ حُسن سے
عبارتیں ٹنکی ہوئی خدا کے ہر کلام کی

میرا خیال یہ ہے کہ اس میں اخلاقی غور و فکر بہت ہے مگر شاعری کی لطافت کم ہے۔ جیسے کسی کی بہت سگھڑ، سنجیدہ۔ کام کی گھر گرہست مگر غیر دلچسپ بیوی ہو۔ صورت بھی معمولی ہے اور گفتگو بھی شگفتگی لئے ہوئے نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے لامذہب لوگوں کے لئے یہ اشعار دل کی کلی کھلا دینے والے نہیں ہیں۔ یا دوسری مثال ذرا اس سے دبتی ہوئی یوں ہے :۔

رضا! کتنی حسیں اور مختصر شرحِ محبّت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے۔ جو راس آئے تو جنّت ہے

یہ درمیانہ پائے کا بہترین شعر ہے یعنی مطلب مانا ہوا جامع ہے۔ ہر ایک کے سمجھنے اور دل میں اُتر جانے کی بات ہے۔ کہا بھی صاف اور سلیقے سے ہے ـــــ اسی قسم میں ایک اور مثال سنئے :۔

اک نہ اک در پہ جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

اس کے واقعہ ہونے میں کس کو شک ہے۔ بات سچّی ہے۔ مضبوطی سے کہی گئی ہے اور شاعری کے طور طریقے بھی ہاتھ سے جانے نہیں پائے ہیں۔ دوسرا شعر ہے :۔

چلنے والے ذرا سنبھل کر چل — موت بھی زندگی کی راہ میں ہے

اس قسم کے اشعار میں شاعری کا سہاگ نہیں ہے مگر مطالب گراں رکھنے کی وجہ سے میرے خیال میں انکی بھی مخصوص جگہ انسانی دل و دماغ میں ہے۔ کیونکہ زندگی اور کام کرنے کے دن محض تفریح کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں کچھ سمجھنا بھی پڑتا ہے۔

ان اقسام کے علاوہ وہ اشعار بھی اس کتاب میں موجود ہیں جن میں بجائے فنونِ لطیفہ کی سنجیدگی کے زیادہ تر تفریح ہے یعنی کچھ شاعری کا حُسن ہے۔ کچھ حقیقت سے متّصل ہیں۔ ساتھ ہی پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ زندہ اشعار ہیں اور ساتھ ہی زندگی کی دھوم دھام لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً :۔

کسی معشوقِ گل اندام کے آنے کی باتیں ہیں
دلِ پُر آرزو کے آج اترانے کی باتیں ہیں

نگاہِ مست اُس ظالم کی جس پر وار کرتی ہے — غضب کی بےخودی چھاتی ہے اور سرشار کرتی ہے

تیسرا شعر ملاحظہ ہو۔

بانسری بج رہی تھی دُور کہیں
رات کس درجہ یاد آئے تم

غرض مقصد یہ ہے کہ بات کے ہزار پہلو ہوتے ہیں۔ انسانی کیفیات بھی حالات کے ساتھ ساتھ جنم لیا کرتی ہیں اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ اپنی زبان میں جو بھی سچّی بات کہہ جائے، اُس کو سننے میں کیا حرج ہے مثلاً پُرانے زمانے کے کم پڑھے لکھے شاعر کا ایک شعر ہے بس یہ سُن لیجئے پھر قصّہ ختم ہ

یار کی گلیوں میں کیونکر یار جانا چھوڑ دے
کس طرح بلبل چمن سے آشیانہ چھوڑ دے

یہ ہیں حضرت انسان جن کی زندگی کے نہ جانے کتنے کرشمے ہوتے ہیں اور کیا اُن کی بیتی ہوتی ہے، کس طرح وہ سوچتے ہیں اور کیسے اپنا مطلب ادا کرتے ہیں۔ یہ ان کی طرز ادا سے اگر ہم بعینہ سمجھ لیں تو سمجھئے کہنے والا کامیاب ہو گیا۔

آخر میں قارئین سے سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے گذارش ہے کہ اس انتخاب میں اگر کہیں بھول چوک ہوئی ہو تو اس کو ازراہ کرم معاف فرمائیں اور اگر مذاق کی مناسبت کی وجہ سے کسی کو یہ انتخاب پسند آ جائے تو انسانی دل و دماغ کی قدر کرتے ہوئے پہلے گزر جانے والے شعراء کی رُوحوں کو فاتحہ خوانی سے یاد کیجئے۔ جو حیات ہیں اُن کی تعریف سے۔ اگر موقع مل جائے تو ان کو داد دیجئے اور پھر اگر دل چاہے تو میرے لئے دعاہائے صلاح و مغفرت کر دیجئے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔

ہما (بیگم اخلاق حسین)

فہرست

ولی دکنی

تخلص ولی۔ نام شمس الدین محمد ولی۔ والد کا نام محمد شریف۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے۔ وہیں انھوں نے شیخ نورالدین سہروردی سے اکتساب کیا۔ شاعری میں سعداللہ گلشن کے شاگرد تھے۔ غالباً ۱۱۱۲ھ کے قریب جب مکہ معظمہ کا سفر کیا تب ہی دلی آئے۔ وفات ان کی ۴۔ شعبان المعظم ۱۷۴۴ء کو ہوئی۔

ولی کی تصانیف "کلیات ولی"، "رسالہ نورالمعرفت" ہیں۔

ردیف الف

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا　　ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں　　تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ردیف ر

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر　　باعثِ جمعیت جاں بوجھ کر
دل چلا ہے عشق کا ہو جوہری　　لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر
اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار　　تجھ کو اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

ردیف ن

خوب رو خوب کام کرتے ہیں　　یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو　　صبح عاشق کو شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اس کو کہہ سکئے　　جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں
دل لبھاتے ہیں اے ولی میرا　　سرو قد جب خرام کرتے ہیں

●

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا　　جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہونگا

ردیف ہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گلرو سوں　　خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ردیف ی

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے　　ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے
ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر　　مجھے تب نرگستاں یاد آوے
ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے　　بہار سنبلستاں یاد آوے
تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے　　اُسے شمع شبستاں یاد آوے

●

سرود عیش گا دیں ہم اگر وہ عشوہ ساز آوے　　بجاویں طبل شادی کے اگر وہ دلنواز آوے
عجب نئی[1] کر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورت قمری　　ادا سوں جب چمن بھیتر وہ سرو سرفراز آوے
ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی　　مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

●

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے　　مجھے فکر سخن کرنا بجا ہے

---

[1] نہیں۔

غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے — نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

•

زندگی میری خواب کی سی ہے — نقش بر روئے آب کی سی ہے
تیرے ہر ناز میں کرشمے ہیں — دلفریبی سراب کی سی ہے
مصحفِ رخ پہ خال کی صورت — نقطۂ انتخاب کی سی ہے
اُس بتِ سیمتن کے گالوں پر — ساری سُرخی گلاب کی سی ہے
آج ہر بات میر صاحب کی — مست جامِ شراب کی سی ہے

★

آبرو

نام نجم الدین شاہ مبارک تخلص آبرو۔ محمد غوث گوالیاری کی نسل سے تھے۔ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ شروع جوانی میں دلی آئے تھے۔ ان کا کلام لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ تر سبِ غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا تھوڑا سا باقی رہا جس کا ایک چھوٹا مجموعہ چھپ سکا محمد شاہ کے زمانۂ حکومت میں وفات پائی۔

ردیف الف

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا — جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

•

نین سیں نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا

ردیف ر

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کر کمر خون کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھکر

ردیف ی

دیکھو تو جان تم کو منتا ہوں کب ستی بولو خدا کے واسطے ملک لال لب ستی

پانی میں ڈوب آگ میں جل کر مرو ین ایک عاشق نہ ہو پکار کے کہتا ہوں سب ستی

ردیف ے

کیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی میں آویں تسبیح کرے فراموش زنار بھول جاوے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

سراج دکنی

نام سید سراج الدین تخلص سراج حکیم شمس اللہ قادری کا خیال ہے کہ سراج ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ خود ہی اپنے دیوان کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہوں گے انتخاب کیا۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے پھر اردو میں کہنے لگے ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی۔ ان کی مثنوی "بوستانِ خیال" بھی علاوہ اردو فارسی دیوان کے ان کی یادگار ہے۔

ردیف الف

لیا ہے نقدجان بلبلاں یعنی خراج اپنا چلایا خسرو گل نے اسی رنگوں رواج اپنا

لگا کر راکھ جوگن ہوئی قمری باغ کو تج کر مگر کوئی سرو قد کیلئے چھوڑے ہے راج اپنا

ردیف ت

کیا بیاں کیجئے حدیثِ حیات　　چند شکوے ہیں چند الزامات

ردیف ی

نہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب وہ لباسِ برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی جامہ دری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے کروں بیاں　　کہ شرابِ حسرت آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

★

اشرف علی خاں فغاں

نام — اشرف علی خاں تخلص فغاں۔ احمد شاہ بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے اس لئے اندازہ ہے کہ سنہ ۱۱۰۱ء کے لگ بھگ پیدائش ہوگی۔ شاعری میں ندیم کے شاگرد تھے۔ دہلی چھوٹنے کے بعد شجاع الدولہ والئی اودھ کے یہاں کچھ دن ملازمت کی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ نواب نے ایک روز اختلاط میں پیپے سے ہاتھ جلا دیا۔ جس کے بعد وہ چھوڑ کر عظیم آباد چلے گئے۔ احمد شاہ کے زمانۂ حکومت میں پنجہزاری کے عہدہ پر تھے۔ سنہ ۱۷۸۲ء میں لوگ کہتے ہیں کہ وفات پائی۔ "دیوانِ فغاں" انجمن ترقی اردو کی طرف سے سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

ردیف الف

دل بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے　　گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

ردیف ی

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی　　اے عندلیب تو نہ چمن بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سرخ کا　　تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

یقینؔ

نام انعام اللہ خاں تخلص یقینؔ۔ مجدد الف ثانی کے خاندان میں سے تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے۔ ۱۱۶۹ھ میں تقریباً تیس سال کی عمر میں قتل کئے گئے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اسکینڈل تھا۔

ردیف الف

سرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا　　ہمیں ظلِّ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں دھڑکے بہت دیکھے　　ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا

•

تھا جی میں کہ دشوارئ ہجر اس سے کہیں گے　　پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

•

خدا دیتا مجھے گر میرسامانی محبت کی　　تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغباں کرتا

ردیف ن

بن یقیںؔ کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب　　سیرِ گل میں جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

ردیف و

اسیران قفس کی نا امیدی پر نظر کیجیو — بہار آوے تو اے صیاد! مت ہم کو خبر کیجیو

ردیف ہ

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ — چمن میں رہنے پائے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

ردیف ے

فنا ہو کر بھی باقی ہے وہی شوقِ ہم آغوشی — غبارِ قیس اٹھ اٹھ کر لپٹ جاتا ہے محمل سے

•

اگرچہ عشق میں آفت بھی ہے بلا بھی ہے — نرا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
یہ آرزو ہے کہ اس بیوفا سے یہ پوچھوں — کہ میرے بے مزا رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے
یقیں کا شورِ جنوں سن کے یار نے پوچھا، — کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

ضیاءؔ

نام میر ضیاء الدین تخلص ضیاءؔ۔ ان کا انتقال ۱۱۹۴ھ میں ہوا۔

ردیف الف

میں نے کل پوچھا ضیاؔ سے دل کو کیدھر کھو دیا — اسنے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

•

کل کی رسوائی تجھے کیا کم تھی اے ننگِ خیال — اس کے کوچے میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا

•

دیکھیو اے دوستاں چپکا ضیا کیوں ہو گیا　　مر گیا بیتاب ہو یا روتے روتے سو گیا
کیوں گریباں دم بدم کرتا ہے اپنا چاک تو　　ہاتھ سے تیرے ضیا کس گل کا دامن چھٹ گیا
گل جو تو گلشن میں آ کر پھر چمن سے مڑ گیا　　چپ لگی واں بلبلوں کو رنگ گل کا اڑ گیا

ردیف و

کبھی جا گل کو دیکھیں ہیں کبھی دیکھے ہیں نرگس کو　　خدا جانے یہ چشم اپنے پھرے ہیں ڈھونڈتے کس کو

ردیف ے

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے　　کیا ناز و نیاز جاودانی کرتے
گر یار کہے میں اپنے ہوتا تو ہم　　کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

★

سودا

مرزا محمد رفیع نام۔ سوداؔ تخلص۔ ان کی تاریخ پیدائش میں مختلف روایتیں ہیں لیکن گمان غالب یہ ہے کہ ۱۷۱۳ء میں بمقام دلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا محمد شفیع بغرض تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور دلی میں رہ گئے۔ سوداؔ نے کافی بڑے استادوں سے تعلیم حاصل کی چونکہ بچپن سے شاعری کا شوق تھا لہٰذا سلیمان قلی داد، شاہ حاتم اور خان آرزو سے فیض حاصل کیا۔ زیادہ تر دلی میں رہے۔ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان فیض آباد میں آ کر شجاع الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ جہاں میر حسن کے والد میر ضاحک سے اکثر جھگڑے رہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی ہجو کہتے

تھے۔ آصف الدولہ نے جب فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا تو سودا بھی ساتھ لکھنؤ آئے۔ اور آخرکار ۴ رجب المرجب ۱۱۹۵ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

ان کا کلام "کلیاتِ سودا" کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو نے ان کے حالات "سودا" کے نام سے ایک کتاب اور ۱۹۳۶ء میں شائع کی ہے۔

ردیف الف

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو　　خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن　　جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیر لو　　پھر مونہہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا
ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خون سے گذر　　سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا
دامانِ داغِ تیغ جو دھویا تو کیا ہوا　　عالم کے دل سے داغ مٹایا نہ جائے گا

ردیف ت

دیکھے بلبل جو یار کی صورت　　پھر نہ دیکھے بہار کی صورت

ردیف س

گھر اس کا اسی کو ملا زیرِ آسماں　　جس نے جہاں میں آن کے معمار کی ہوس
نے چین روزِ وصل نہ شبِ ہجر کی قرار　　کیا جانے کیا ہے اپنے دلِ زار کی ہوس

ردیف ن

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں　　ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب　　تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

جاب لب جو ہیں اے باغباں ہم — چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
مگر مجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا — اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں — پھر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بناں گھڑیاں
گستھی نکلی ہیں محنت دل سے تار اشک کی لڑیاں — یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں
جس سے پوچھا میں کہ دل خوش ہی کہیں دنیا میں — رو دیا ان نے اور اتنا ہی کہا "کہتے ہیں"

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجیے چشم تر ہرگز — بہت سا ر دئیے ان کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
اے مرغ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول — تو نے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانے میں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل — ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

میری طرف سے دیجو صبا گل کو یہ پیام آؤں قفس کو توڑ کے، پر، بال و پر نہیں

ردیف ی

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

کی عمر عبث ضائع خدمت میں مہوّس کی خاک اپنی ہی جب چھانی اکسیر نظر آئی

وہ مہر وہ وفا وہ عنایات ہو گئی وہ مہرباں گئے وہ مدارات ہو گئی
پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے ۔ ولے دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی

ردیف ے

وہی جہاں میں رموز قلندری جانے بھبھوت تن پہ جو ملبوس قیصری جانے
غلام اس کی میں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے جگر کے خون کو خوانِ تونگری جانے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے دین و دنیا سے جی اچٹتا ہے
غنچہ سمٹے تو سمٹے ممکن ہے دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے

کوئی تو سمجھے ہے اس چہرے کو مہ اور کوئی مہر ہم تو سمجھے ہیں فقط اللہ کا اک نور ہے

اسیری پر مری ناحق یہ دل بیداد کرتا ہے قفس میں ہمنوایانِ چمن کو یاد کرتا ہے

عجب بیداد حسرت پر مری صیاد کرتا ہے — دکھاوے ہے مجھے اس کو جیسے آزاد کرتا ہے
جو وہ پوچھے تجھے قاصد کہ سودا خوش تو رہتا ہے — تو یہ کہیو کبھو رو رو دل اپنا شاد کرتا ہے
عجب احوال کو سودا ستم تیرے سے پہنچا ہے — کوئی معشوق بھی عاشق پہ یوں بیداد کرتا ہے
لبانِ نَے ترے ہاتھوں سے نالاں اس کو دیکھا ہیں — کوئی ٹک منہ لگاتا ہے تو وہ فریاد کرتا ہے

اب کی بھی دن بہار کے یوں ہیں چلے گئے — پھر پھر گل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے
ہے مدتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا — معلوم ہی نہیں کہ دِوانے کدھر گئے

بہار بے سپرِ جام یار گزرے ہے — نسیم تیر سی چھاتی کے پار گزرے ہے
کبھی ہے آج ترے در پہ اضطرابِ نسیم — کہ اس جہاں سے کوئی خاکسار گزرے ہے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
گر ہو شراب و خلوتِ محبوب خوب رُو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

جو طبیب اپنا تھا دل اس پر کسی کا زار ہے — مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

جو دور سے بھی نظر تجھ پہ یار ہم کرتے — ہزار جانِ گرامی نثار ہم کرتے
ترے خیال سے باتیں ہزار ہم کرتے — غمِ فراق کو یوں خوشگوار ہم کرتے
غبارِ راہِ محبت اگر کہیں ملتا — تو اس کو تاجِ سرِ افتخار ہم کرتے

بڑا گناہ کیا ترکِ مے سے شک میں پڑے　　یقینِ رحمتِ پروردگار ھم کرتے

نہ قمری ہوں کہ سیر اس گلشن و گل کی مجھے بھائے
نہ بلبل ہوں کہ دل میرا فضائے باغ لے جائے
میں ہوں طاؤس آتش بار کیسی ہی بہار آئے
نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا میروم از خویش می جوشد تماشائے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی میکشی کو　　شبنم سے کہدے بلبل پیالے گلوں کے دھوئے
ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو　　اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہولے
رہا کرنا ہمیں صیّاد اب پامال کرنا ہے　　پھڑکنا بھی جسے بھولا ہو سو پرواز کیا سمجھے

میر دردؔ

خواجہ میر نام ۔ دردؔ تخلص ۱۷۲۰ء مطابق ۱۱۳۳ھ بمقام دلی پیدا ہوئے ۔ ان کے دادا عالمگیر کے زمانے میں بخارا سے دلی آئے ۔ والد خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ صوفی اور شاعر بھی تھے ۔ خواجہ میر درد کو بھی ورثے میں والد سے یہ دونوں خصوصیات ملیں اور ان کے علاوہ فن موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔ یعنی طبیعت میں صوفیانہ فقیرانہ منش کے علاوہ شاعری اور موسیقی کے رنگ نے مل کر بڑی رنگین شگفتگی پیدا

کر دی تھی۔ ان کے یہاں مشاعرے اور مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں میر اور مرزا بھی شریک ہوا کرتے۔ اور داد سخن پاتے۔ ان کے چھوٹے بھائی میر اثر انہی کے شاگرد تھے۔ میر حسن نے بھی اوائل عمر میں میر درد سے استفادہ کیا۔ طبیعت میں قناعت اور تصوف کی یہ شان تھی کہ جب دلی پر تباہی آئی علم و فضل اور شعر و سخن کا مرکز لکھنؤ بنا اس وقت بہت لوگ وہاں گئے۔ مگر میر درد کے پائے وفا و استقلال دلی سے نہ اٹھے۔ آخر کار ۱۷۸۴ء مطابق ۱۱۹۹ھ میں وہیں انتقال کیا۔

میر درد کی کتابیں تصوف پر ہیں۔ فارسی غزلیات کا دیوان بھی ہے اور اُردو دیوان بھی چھپ چکا ہے۔

ردیف الف

گُل و گلزار خوش نہیں آتا	باغ بے یار خوش نہیں آتا
درد ہم کو یہ رات دن تیرا	نالۂ زار خوش نہیں آتا

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر	درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا	کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہو گا
حال مجھ غم زدے کا جس تس نے	جب سنا ہو گا رو دیا ہو گا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا	آنسوؤں میں کہیں گرا ہو گا

میرے ہونے پہ عبث رکتے ہو	پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

ڈر ہے کہ کہیں سعی کی طاقت بھی نہ چھن جائے	قسمت کو دعا اے دلِ ناشاد دیئے جا

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا	بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا	پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی	ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں	ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں	کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ	کہ جس کو کسو نے کبھی وا نہ دیکھا

حرص کرواتی تھی رو بہ بازیاں سب ورنہ یاں	اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا

موردِ قہر تو یاں ہم ہی ہیں	اور کس پر یہ کرم کیجیئے گا

دل کس کی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا	کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہو گیا
کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کے رات کو	عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

اپنی آنکھوں سے اسے میں دیکھوں	ایسا بھی کبھو خدا کرے گا

ردیف ن

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سرتاقدم زباں ہیں جوں شمع گو کہ ہم — پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار — کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر — مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں
بتوں کے جبر اٹھائے ہزارہا ہم نے — جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں
جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقشِ عبرت نے — سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں

تم کیا گئے کہ رنگِ زمانہ بدل گیا — گویا وہ اب زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

معاذ اللہ یہ مجبوریاں آدابِ الفت کی — کہ اپنے دل کو ہم لذت کشِ بیداد کرتے ہیں
فضا میں کیوں تلاطم ہے ہوائیں کیوں پریشاں ہیں — اسیرانِ بلا کس کو قفس میں یاد کرتے ہیں

صبا جاتا ہوں گریاں میں چمن سے — گلوں کو باغ میں رکھیو تو خنداں

وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں — برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں

ردیف و

خدا جانے کہ کیا انجام ہو پھر کشتۂ غم کا
ذرا ٹھہرو، ٹھہر کر رقصِ بسمل دیکھتے جاؤ

چشمک مری وحشت پہ ہے کیوں حضرتِ ناصح
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

دلِ نالاں کو یاد کر کے صبا
اتنا کہنا جہاں وہ قاتل ہو
نیم بسمل کوئی کسو کو چھوڑ
اس طرح بیٹھتا ہے غافل ہو!

اپنے بندے پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آ جائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

ردیف ی

مسکرایا خوشی سے وہ جس طرح
باغ میں کب کھلی کلی ایسی

ردیف ے

اتنا پیغام درد کا کہیو
گر صبا کوئے یار میں گزرے
کونسی رات آن ملئے گا!
دن بہت انتظار میں گزرے

کس قدر وہ رات بھاری تھی ترے بیمار پر
چارہ گر اٹھ اٹھ کے سوئے آسماں دیکھا کئے

جب نظر سے بہار گزرے ہے
جی پہ رفتارِ یار گزرے ہے

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے　　جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں　　چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

رات کی بات یاد ہے، رات کا پیار یاد ہے
نیند بھری وہ چشمِ مست، اس کا خمار یاد ہے

کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا　　گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

مجھ کو تجھ سے جو کچھ محبت ہے　　یہ محبت نہیں ہے آفت ہے!
لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو　　ہم جو دیکھا بڑی مصیبت ہے!
بند احکام عقل میں رہنا　　یہ بھی اک نوع کی حماقت ہے
ایک ایمان ہے بساط اپنی　　نہ عبادت نہ کچھ ریاضت ہے
آ پھنسوں میں بتوں کے دام میں یوں　　دردؔ یہ بھی خدا کی قدرت ہے

میرے احوال پر نہ ہنس اتنا　　یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے

کہتے نہ تھے ہم دردؔ میاں چھوڑ یہ باتیں　　پائی نہ سزا! اور وفا کیجیے اس سے

جعفر علی حسرت

ان کے حالات وغیرہ مل نہیں سکے۔ اشعار بھی بہت تھوڑے ہی ملے جس میں سے بمشکل دو چار ہی ہیں۔

ردیف الف

بہاریں اب کہاں پر یاد ہے آتنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا
نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رو یا کی — کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا
ہوا لبریز جامِ زندگی جس وقت اے حسرتؔ — دریغ! اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

ردیف ی

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے — لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے
دل لینے کو اوروں سے بھی کہہ دیکھو بھلا کچھ — لا دینگے بجا ہم تو جو ارشاد کرو گے
بیخوابی و حیرانی و طغیانیٔ وگریہ — سب آنکھوں پہ ہم لینگے جو امداد کرو گے

میر تقی میر

میر محمد تقی نام۔ میر تخلص۔ جائے پیدائش آگرہ۔ متفقہ رائے یہ ہے کہ سنہ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا حجاز سے دکن آئے تھے۔ وہاں سے

احمد آباد (گجرات) میں قیام کیا۔ اور آخر کار آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میر کے والد کا نام محمد علی تھا مگر علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم میر کی اپنے والد اور سید امان اللہ کے زیر اثر ہوئی۔ مگر چونکہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے اس لئے ان کو اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے پاس دلی آنا پڑا۔ وہاں بھی بوجوہات زیادہ نہ رہ سکے۔ اور آخر کار نواب سالار جنگ کی سفارش اور آصف الدولہ کے بلانے پر ۱۲ محرم الحرام ۱۱۹۶ھ اور ۲۳ ربیع الاول ۱۱۹۶ھ کے درمیان دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں نوے سال زندگی کے پورے کر کے ۲۰ شعبان المعظم ۱۲۲۵ھ میں بوقت شام وفات پائی۔

"کلیات میر"۔ "نکات الشعراء" اور "ذکر میر" ان سے یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ میر کا مجموعۂ مراثی لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے سال شائع ہوا ہے اور خود ان کی لکھی سوانحعمری بھی "ذکر میر" کے نام سے انجمن ترقیٔ اردو سے شائع ہوئی۔

ردیف الف

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اسکی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

ساعد سیمیں دونوں اسکے ہاتھ میں لے کے چھوڑ دیئے
بھولے اسکے قول وقسم پر ہائے خیال خام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھے کب کا ترک اسلام کیا

جب تک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا
تم گلے سے لگ گئے سارا گِلا جاتا رہا

مرنا تھا جسکی خاطر اس کی طرف نہ دیکھا
میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی — جب سن کے ترا نام وہ بیتاب ہوا تھا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا — جو کچھ کہ یاں ہے سو افسوس ہے جوانی کا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — شام کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

یہ میرؔ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — انداز فغاں کا سبب شور و فغاں تھا

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جھکا بسوئے قدم سرخروی بے جاں کا — زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا

کھلا جو نشے میں پگڑی کا پیچ اس کے میرؔ — سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

رات حیران ہوں کچھ چپ سی مجھے لگ گئی میرؔ — درد پنہاں تھے بہت پر لب اظہار نہ تھا

ردیف ت

چشمک گل کا لطف بھی نہ اٹھا — کم رہا موسم شباب بہت

میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم! — ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

ردیف د

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ — یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی   بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشتِ جنوں   شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

گئے دن ٹکٹکی کے باندھتے کے   اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

ردیف ر

جی میں جو آوے سو کیجو پیارے   ایک ہو تا نہ در پئے آزار

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق   ہے میر! راہ و رسمِ دیارِ وفا کچھ اور

تو آنکھ ہمیں دیکھ نہ یوں مار دیا کر   غمزے ہی بھلا ان کو نہ ستکار دیا کر

موت اک زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ردیف ش

کیا کہئے کیا رکھے ہیں ہم تجھ سے یار خواہش   یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش

ردیف ق

گر بادیہ میں تجھکو صبا لیکے جائے شوق   مجنوں کو میری اور سے کہیو دعائے شوق

ردیف ک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں   ہم جو تم سے بھتے بیشتر نزدیک

مر بھی رہ رات تو بہت رویا　　ہے مری جان اب سحر نزدیک

ردیف ل

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن　　ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال　　پرواز خواب ہو گئے ہے بال و پر خیال

ردیف م

جی میں تھا اس سے ملتے تو کیا کیا نہ کہتے میر　　پر جب ملے تو رہ گئے ناچار جی سے ہم

ردیف ن

خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں　　سرو و قمری نثار ہوتے ہیں
آ ئیا دِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ　　یہ تغافل شعار ہوتے ہیں
صدقے ہو لیویں ایک دم تیرے　　پھر تو تجھ پر نثار ہوتے ہیں

بیکلی ــ بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں　　طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ سی کی　　آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں
ایک سے صورت نہ پکڑی پیشِ یار　　دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
مضطرب ہو کر کیا سب میں سبک　　دل نے آخر خفتیں دلوائیاں
شوقِ قامت میں ترے اے نونہال　　گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

اٹھتے ہو میر دیر سے تو کعبے چل رہو — مغموم کاہے کو ہو! تمھارا خدا نہیں

بُرے حال اس کی گلی میں ہیں میر — جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھّا کریں

چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر — ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

تم کہو میر کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمھیں — اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں — جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں — ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں — شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے — میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں — پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں

تب تھے سپاہی۔ اب ہیں جوگی۔ آہ جوانی یوں کاٹی — ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوئ مہر — چھاتی پتھّر ہے انھوں کی جو وفا کرتے ہیں

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

جاتے ہے جی نجات کے غم میں — ایسی جنت گئی جہنم میں !

یوں ناکام رہینگے کب تک جی میں ہے اک کام کریں — رسوا ہوکر مارے جائیں انکو بھی بدنام کریں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر — پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ جپتے ہیں — سجدہ اس اک تیغ تلے کا ہو تو ہم بھی سلام کریں

ردیف و

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو! اعتماد ہے ہم کو
آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم — شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا — میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

ظالم ہو میری جان پہ ناآشنا نہ ہو — بےمہری اتنی عیب نہیں بے وفا نہ ہو

ہے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد — کھاؤ کسی کی چوٹ کسی کا شکار ہو

ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو — نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

حیرت میں ہوں ہے مدعیٔ معرفت اک خلق　　اب تک تو نہیں پایا ہے ہم نے ترے ڈھب کو

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو　　جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

اکدن تو ہم پہ تیغ کو تو بیدریغ کھینچ　　تا عشق اور ہوس میں تنک امتیاز ہو

شب آنکھ مری لگنے نہیں دیتی ہے بلبل　　اس مرغ کی بیتابی آواز تو دیکھو

ردیف ہ

وصل اس کا خدا نصیب کرے　　میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ!

ردیف ی

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے　　عمر نے ہم سے بیوفائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ　　کس بھروسے پہ آشنائی کی

ہمیں آمدِ میرؔ کل بھا گئی　　طرح اس میں مجنوں کی سب پا گئی
ہوئی سامنے یوں تو ہر ایک کے　　ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی
کوئی رہنے والی ہے جان عزیز　　گئی گر نہ امروز۔ فردا گئی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی | شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ کوچے تھے اوراقِ مصور تھے | جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر | سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
گل بار کرے ہے گا اسبابِ سفر شاید | غنچے کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی | میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا | تم نے پوچھا تو مہربانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل | ابتدا پھر وہی کہانی کی

آج پھر تھا بے حمیت میرؔ واں | کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
موہنہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

یار بن تلخ زندگانی تھی | دوستی مدعی جانی تھی
سر سے اس کی ہوا گئی نہ کبھو | عمر برباد یوں ہی جانی تھی
لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا | کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
شیب میں فائدہ تامل کا | سوچنا تب تھا جب جوانی تھی
میرے قصے سے سب کی نیند گئی | کچھ عجب طور کی کہانی تھی

پھر سخن تشنوی ہے ویسی ہی   رات اک آدھ بات مانی تھی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے   مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی

جو اس سنگ دل کے سبب کھینچے   عمر نے سخت بے وفائی کی

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں   اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی   عمر افسوس کیا شتاب گئی

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار   عقل کی باتیں کیاں۔ کیا ہم سے نادانی ہوئی

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا   پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم   کاہے کو میرؔ کوئی دبے! جب بگڑ گئی

ردیف ے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا   کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو   جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے   کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی ان لبوں کی کیا کہئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں   حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے   درد بے اختیار اٹھتا ہے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے   عمرِ رفتہ کی اک نشانی ہے

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو   جن تک کہ بصد ناز نسیم چمن آوے

میرے تغیرِ حال پر مت جا   اتفاقات ہیں زمانے کے

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے   جان ہے تو جہان ہے پیارے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو۔ اس عہد کو اب وفا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

میر صاحب بھی اسکے ہاں تھے پر — جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

تری چال ٹیڑھی۔ تری بات روکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

وہ گورِ غریباں پہ ہیں آنیوالے — بھلے جینے والوں سے مرجانیوالے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دل جلے ہو جوں رو کے شبنم نے کہا گُل سے — اب ہم تو چلے یاں سے۔ رہ تو جو رہا چاہے
رنگِ گل دیکھنے لگ دم میں ہیں ہوا دونوں — کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے
جنوں کا عبث میرے مذکور ہے — "جوانی دوانی ہے" مشہور ہے

زنداں میں پھنسے طوق پڑے ۔ قید میں مر جائے   پر دام محبت میں گرفتار نہ ہوئے

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے   واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ   آؤ ۔ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

عاشق اپنا جان لیا ہے ان نے شاید میرؔ ہمیں   دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن   سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا ۔ حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لکھتے رقعہ پہ لکھ گئے دفتر   شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی   کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دِوانے نے موت پائی ہے

ہیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے   خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے
نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی ۔ دعا کر میرؔ   کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

چلتے ہیں تو چمن کو چلئے۔ کہتے ہیں کہ بہاراں ہے   پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

نالہ جب گرم کار ہوتا ہے   دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
سب مزے درکنار عالم کے   یار جب ہم کنار ہوتا ہے
جبر ہے قہر ہے قیامت ہے   دل جو بے اختیار ہوتا ہے

بدی میں بھی کچھ خوبی ہوئے گی تب تو   بُرا کرنے کو وہ بھلا جانتا ہے
زمانے کے اکثر ستمگار دیکھے   وہی خوب طرزِ جفا جانتا ہے

وہی سمجھا نہ ۔ ورنہ ہم نے تو   زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ   کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے   کس توقع پہ دل لگائے تھے
میر صاحب رلا گئے سب کو   کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

مانگے ہے دعا خلق تجھے دیکھ کے ظالم   یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گی بلبل   آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے
جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے   اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے   اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جدے جدے تم　　شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

نہیں عشق کا درد لذت سے خالی　　جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے

حیف نہیں پیر تم ۔ کابلی اللہ رے !　　نام خدا ہو جواں ۔ کچھ تو کیا چاہیئے

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت ۔ پر میرؔ　　ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے　　ادھر آبے ابے او چاک گریباں والے

دل میں اک اضطراب باقی ہے　　یہ نشانِ شباب باقی ہے

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب　　ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

آتے کبھی وہاں سے تو یاں رہتے تھے اداس — آخر کو میر اس کی گلی ہی میں جا رہے

پتھر کی چھاتی چاہیئے ہے میر عشق میں — جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے — لوگوں کے پوچھنے کو کوئی کیا جواب دے

ایک تو راہ غلط دوسرے تقدیر کا پھیر — تھے جہاں آپ وہیں ڈھونڈنے والے نہ گئے

میر حسن

میر غلام حسن نام حسن تخلص۔ جد امجد میر امامی ایران سے دلی آئے تھے۔ والد میر ضاحک تھے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ میر حسن فطری شاعر تھے۔ شروع میں میر ضاحک سے اصلاح لیتے رہے بعد میں خواجہ میر درد سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اوائل جوانی میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ پھر لکھنؤ آئے اور ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے لیکن در اصل میر حسن کو میر اور سودا کا رنگ زیادہ پسند تھا۔ شاعری بزرگوں سے میراث میں پائی تھی۔ لہٰذا اپنی زندگی ہی میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی اور بقول آزاد "زمانے نے ان کی سحر البیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا"۔ ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

"شاعر شیریں زبان" سے مصحفی نے تاریخ نکالی (تاریخ پیدائش ۱۱۷۱ھ)

ایک دیوان جو تمام اصناف پر بھاری ہے۔ گیارہ مثنویاں اور فارسی زبان میں تذکرہ شعرائے اُردو "جو ۱۷۷۲ء اور ۱۷۷۸ء کے درمیان لکھا، یادگار ہیں۔ یہاں پر مثنوی "سحرالبیان" کا کچھ انتخاب ہے جس کا قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا، اس کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہوتا تھا۔ مایوسی جب بڑھتی گئی تو ایک روز بادشاہ نے پنڈتوں اور نجومیوں کو بُلا کر اپنا جنم پترا دکھایا اور پوچھا کہ بچہ ہوگا یا نہیں؟ پنڈتوں نے حساب وغیرہ لگا کر خوشخبری دی:

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا　　چندر ماسا بالک ترے ہوئیگا

داستان تولد ہونے شاہزادے بینظیر کے

خوشی سے پلا ساقی مجھ کو شراب　　کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
عجب صاحبِ حُسن پیدا ہوا　　جسے مہر و مہ دیکھ شیدا ہوا
ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر　　رکھا نام اس کا شہ بینظیر
خواصوں نے خواجہ سراؤں نے جا　　کئی نذریں گزرانیاں اور کہا
مبارک تجھے اے شہ نیک بخت　　کہ پیدا ہوا وارثِ تاج و تخت
یہ سنتے ہی مژدہ بچھا جا نماز　　کیے لاکھ سجدے کہ اے بے نیاز
تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار　　نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار
دوگانہ غرض شکر کا کر ادا　　تہیہ کیا شاہ نے جشن کا
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا　　کہ نقار خانے میں دو حکم جا

یہ مژدہ جو پہنچا تو نقّارچی — لگا ہر جگہ بادلہ اور دری
بنا ٹھاٹھ نقّار خانے کا سب — مہیّا کر اسباب عیش و طرب
دیا زیر کو پہلے بم سے ملا — لگی پھینکنے ہر طرف کو صدا
کہا زیر نے بم سے بہرِ شگوں — کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں
دیئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں — مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر — وزیروں کو الماس لعل و گہر
خواصوں کو۔ خوجوں کو جوڑے دیئے — پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیئے
لگے بجنے قانون و بین و رباب — بہا ہر طرف جوئے عشرت کا آب
لگی تھاپ طبلوں کی۔ مردنگ کی — صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی
خوشی کی زبس ہر طرف تھی بساط — لگے ناچنے رس پہ اہلِ نشاط

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے — وہ پاؤں کے گھنگرو جھنکتے ہوئے
وہ دانتوں کی مسّی وہ گلبرگ تر — شفق میں عیاں جیسے شام و سحر
محل میں جو دیکھا تو اک اژدہام — مبارک سلامت کی تھی دھوم دھام
پری پیکروں کا ہر اک جا ہجوم — وہاں بھی پڑی عیش و عشرت کی دھوم

بڑھے ابر ہی ابر میں جوں ہلال — محل میں لگا پلنے وہ نونہال
وہ گل پاؤں سے اپنے جس جا چلا — وہاں آنکھ کو نرگسوں نے ملا
لگا پھرنے وہ سرو جب پاؤں پاؤں — کئے بردے آزاد تب اس کے ناؤں

داستان تیاری میں باغ کے

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شاں | لگے جس میں زربفت کے سائباں
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار | دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر | کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر
سنہری مغرق چھتیں ساریاں | وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں موہنہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر | نشے کا سا عالم گلستان پر
لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں | چمن میں لگیں دیکھنے بھالنے
خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم | محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم
ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں | پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی | اری او سہیلی پکارے کوئی
کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں | کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

پلا ساقیا مجھ کو اک جامِ مل | جوانی میں آیا ہے ایامِ گل
غنیمت شمر صحبتِ دوستاں | کہ گل پنج روز است در بوستاں
پڑی جب گرہ بارھویں سال کی | کھلی گل چھڑی غم کے جنجال کی
کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام | کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
کریں شہر کو مل کے آئینہ بند | سواری کا ہو لطف جس سے دوچند

رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
گیا مژدہ صبح لے ماہتاب — اٹھا سورج آنکھوں کو ملتا شتاب
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

داستان حمام میں نہانے کی لطافت میں

تنِ نازنیں نم ہوا اس کا کل — کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
نہاتے میں یوں تھی بدن کی دمک — برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
وہ گورا بدن اور بال اس کے تر — کہے تو کہ ساون کی شام و سحر
کہوں اس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات — کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات

نہانے میں شہزادے پر گدگدی کا اثر

ہنسا کھلکھلا وہ گلِ نوبہار — لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں پر ہوا — اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے — ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے
دعائیں لگے دینے بے اختیار — کہا خوش رکھے تجھ کو پروردگار
نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح
غرض ہو کے اس طرح آراستہ — خراماں ہوا سرو نوخاستہ

سنہری روپہلی وہ عماریاں — شب و روز کی سی طرحداریاں
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں — اور ان کے دبے پاؤں کی پھرتیاں
وہ ماہیٔ مراتب وہ سرو رواں — وہ نوبت کا دھاکا جیسے سماں
غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
زبس شاہزادہ بہت تھا حسیں — ہوئے دیکھ عاشق کہیں و کہیں
نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اس نے جھک جھک کے اس کو سلام
دعا شاہ کو دی کہ بارِ اللہ — سدا یہ سلامت رہے مہر و ماہ
گیا جب محل میں وہ سرو رواں — بندھا ناچ اور راگ کا واں سماں
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طربناک وہ
قضارا وہ شب بھی تھی شب چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر سمت مہ
کچھ آئی جو اس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

داستان شہزادے کے کوٹھے پر سونیکی اور پری کے اڑا لیجانیکی

جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ دن — مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن
وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ — جوانی کی نیند اور سونے کا رنگ
قضارا ہوا اک پری کا گزر — پڑی شاہزادے پہ اس کی نظر
ہوئی لاکھ جی سے وہ اس پر نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار
غرض لے گئی آن کی آن میں — اڑا کر وہ اس کو پرستان میں

نہ غنچہ نہ گل ۔ نے گلستاں رہا　　فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا

داستان پرستان کی

قضارا کھلی آنکھ اس گُل کی جو　　نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو
نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا　　تعجب سے ایک اک کو تکتا رہا
غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں　　کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں
کبھی یوں بھی ہے گردشِ روزگار　　کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار
وہ محلوں کی چہلیں وہ گھر کا سماں　　رہے روبرو دھیان میں ہر زماں
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے　　تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
اسی غم میں گھل گھل کے مرتا تھا وہ　　سدا شمع ساں آہ کرتا تھا وہ

ماہرخ پری اسکی کیفیت پہچان گئی اور یوں کہا

کہا ایک دن اس نے اے بے نظیر　　مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
تو اک کام کر اک پہر بھر کہیں　　کیا کر ٹک اک سیر روئے زمیں
سرِ شام جاتی ہوں میں باپ پاس　　اکیلا تو رہتا ہے اس جا اُداس
یہ گھوڑا تو کل دوں گی ۔ کل کا تجھے　　ولیکن یہ وے تو چھلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں　　دیا دل کسی سے لگائے کہیں

زمیں سے لگا اور تا آسماں　　جہاں چاہیو جائیو تو وہاں
کہوں کیا میں اس اسپ کی خوبیاں　　پرندوں میں کب ہوں یہ محبوبیاں

بدرِ منیر کے باغ میں بے نظیر کا وارد ہونا

ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر　　سہانا سا اک باغ آیا نظر
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا　　وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو　　ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ تو
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں　　عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طرفہ محل　　چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل
وہ مسند جو تھی موجِ دریائے حسن　　وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن
دیئے کہنی تکئے پہ اک ناز سے　　سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ادھر اودھر تمام　　ستاروں کا جوں ماہ پر ازدحام
وہ بیٹھی تھی یہ دھج بنائے ہوئے　　دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے
وہ کرتی وہ انگیا جواہر نگار　　نیا باغ اور ابتدا کی بہار
وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن　　وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
وہ ہونٹوں کی مسّی وہ مژگاں کی نوک　　کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
جو کچھ چاہیئے ٹھیک نک سک سے انگ　　نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن　　غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن

کسی نے کہا دیکھیو اے بوا
کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا

کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے
کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے

یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں
اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں

شہزادے بینظیر کا حلیہ

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

جواہر کا تکمہ گلے میں بندھا
ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا

وہ موتی کی لٹکن ، زمرد کی ہڑ
لٹک جس کی زیبندہ دستار پر

بدن آئینہ سا دمکتا ہوا
گل باغ خوبی ہمکتا ہوا

یہ عالم جو دیکھا تو غش کر گئیں
وہ جبتی کہ آئی تھیں سب مر گئیں

شتابی سے جا کر کہا واں کا حال
کہ اے شاہزادی صاحب کمال

عجب سیر ہے سیرِ مہتاب میں
یہ عالم تو دیکھا نہیں خواب میں

کہے سے ہمارے نہ مانو گی تم
جو دیکھو گی آنکھوں تو جانو گی تم

نہیں اور کچھ تم نہ کیجیو ہراس
چلی آؤ تم ان درختوں کے پاس

گئی اس جگہ جب وہ بدر منیر
اور اس نے جو دیکھا شہ بے نظیر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل
نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل

رہی کچھ نہ تن من کی سدھ بدھ اُسے
نہ کچھ اپنے تن کی رہی سدھ اسے

بیانِ بدرِ منیر

وہ زلفیں کہ دل جن میں الجھا رہے — الجھنے سے جی جس کے سلجھا رہے
کہوں اس کے عالم کا کیا ماجرا — کہ جوں ہوئے دریا پہ کالی گھٹا
غضب موہنہ پہ ظاہر ولے دل میں چاہ — نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں — میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں — چھپی جا کے اپنے وہ دالان میں
کہ اتنے میں آئی وہ دختِ وزیر — لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر
مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں — ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو — مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو
مئے عیش کا جام اب نوش کر — غمِ دین و دنیا فراموش کر
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش — غفور است ایزد تو ساغر بنوش
کہاں یہ جوانی، کہاں یہ بہار — یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی لوں تو دنیا کے ہیں کاروبار — وہے حاصلِ عمر ہے وصلِ یار
یہ سن سن کے وہ نازنیں مسکرا — لگی کہنے اچھی بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے ادھر — بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش — ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب — بھلا میری خاطر بلا تو شتاب

داستان ملاقات کرنا بدرِ منیر کا بینظیر سے

بہم مل کے بیٹھے ہیں دو رشکِ مہ — قرانِ مہ و مہر ہے اس جگہ
وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
موہنہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینہ پسینہ ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
غرض ہو کے آپس میں راز و نیاز — پیئے دو پیالے بصد امتیاز
جب آپس میں چلنے لگے جام و مُل — مندے غنچہ ساں دل کھلے مثلِ گل
ہوئی کچھ جو پھر تو تفتیشِ حال — لگے ہونے آپس میں قال و مقال
کھلا بند جس دم درِ گفتگو — جہاں نے حقیقت کہی مو بہ مو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا — چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے — زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
یہ سن دل ہی دل پیچ کھا پیچ و تاب — دیا شاہزادی نے اس کو جواب
نہیں اس طرح کا دل لگاتی نہیں — یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے دل کو لگائے کوئی — بھلے چنگے دل کو جلاوے کوئی
یہ رمز و کنایے جو ہونے لگے — تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے

دوسرے روز بینظیر کے انتظار میں بدرِ منیر کے یہاں کی کیفیت اور اس کا سنگار

نہا دھو کے اس روز ایسی بنی — کہ دو دن کی سج پج ہو جیسی بنی

وہ مکھڑے کا عالم وہ کنگھی کا رنگ | شبِ ماہ ہو دیکھ کر جس کو دنگ
وہ مستی وہ اس کے لبِ لعل فام | سوادِ دیارِ بدخشاں کی شام
وہ آنکھوں کا عالم وہ کاجل غضب | کہے تو پڑے نرگستاں میں شب
جو دیکھے وہ انگیا جو ابھر نگار | فرشتہ ملے ہاتھ بے اختیار
کیا اس طرح سے جب اس نے سنگار | ہوئے مہر و مہ اس کے موہنہ پر نثار
فلک تک گئی حسن کی اس کے دھوم | لیا ہاتھ مشاطہ نے اپنا چوم

داستان بینظیر کے آنیکی اور باہم محبت

تڑپتا ادھر تھا جو وہ بینظیر | ہوئی شام بارے تو چھوٹا اسیر
فلک سیر پر ہو شتابی سوار | ہوا آسماں پر ہوا ایک بار
یکایک جو وارد ہوا اس جگہ | کہ جس جا خراماں تھی وہ رشکِ مہ
وہ بیٹھا جو خلوت میں آ بینظیر | اور ادھر سے آئی جو بدرِ منیر
زبس حوصلے نے جو تنگی سی کی | حیا عشق نے خانہ جنگی سی کی

ماہ رُخ پری کا خبر پانا اور خفا ہونا

یہ دو دل کو یک جا بٹھاتا نہیں | کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں
کسی دیو نے دی پری کو خبر | کہ معشوق عاشق ہوا اور پر

یہ سن کر وہ شعلہ بھبھو کا ہوئی
لگی کہنے ہیں یہ بلا کیا ہوئی؟
بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے پڑی
کہا سن تو اے موذی و مدعی!
تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
کہ اس بالزادی کو جوڑا دیا
الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا
یہ اوپر ہی اوپر مزے لوٹنا
مجھ کو کا دیا بھگانہ تو نے یہی؟
بھلا اس کا بدلا نہ لوں تو سہی!
یہ کہہ اور بلا اک پری زاد کو
کہا سنیو اس کی نہ فریاد کو
اسے جا کے اس چاہ میں بند کر
وہی سنگ بھر اس کے موہنہ پر تو دھر
پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر
پڑی بیقراری میں بدر منیر
کئی دن نہ آیا جو وہ رشک مہ
نظر میں ہوا اس کی عالم سیہ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
ادھر اور ادھر ہر طرف تھی نگاہ
کسی کی کوئی جیسے تکتا ہو راہ

نجم النسا بدر منیر کو تسلی دیتی ہے

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

آخر کار نجم النسا جوگن بن کر ڈھونڈنے نکلتی ہے

وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی
تو وہ صاحب خانہ رونے لگی

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے　　کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے
نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی　　نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر　　وہ بستاق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت　　اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے　　خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے نیچے وہ مہ کا ظہور　　گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

نجم النسا کی بین سن کر ایک پریزاد کا آنا اور اس پہ عاشق ہونا

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے　　سدا عشق اور حسن میں لاگ ہے
کہا ہنس کے جوگن نے "ہر بول ہر"　　جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر
کہا تب پریزاد نے واہ جی　　بہت گرم ہیں آپ اللہ جی!
نہ روکھی ہو اتنی بھلا جاؤں گا　　ذرا بین سن کر چلا جاؤں گا
نظر حسن پر گاہ — گہہ بین پر　　سراپا دل اس لعبتِ چین پر
بجاتی رہی بین وہ صبح تک　　یہ رو یا کیا سامنے بے دھڑک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اس نے بین　　اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
پریزاد نے تب پکڑ اس کا ہاتھ　　شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں　　وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں
نہ مانا اور اس نے اڑایا اُسے　　پرستان میں لا بٹھایا اُسے

بہت اس کی تعظیم و تکریم کی جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

نجم النسا پرستان سے کامیاب لوٹی اور بے نظیر کے ساتھ اپنا ایک عاشق پری زاد بھی لائی

وہ رقصِ بتاں اور ستھری الاپ وہ گوری کی تانیں وہ طبلے کی تھاپ

جو ملتے ہیں بچھڑے ہوئے ایک جا انھیں نیند باتوں میں آتی ہے کیا
کٹی رات حرف و حکایات میں سحر ہو گئی بات کی بات میں
شبِ وصل کی جو سحر ہو گئی تو سوتوں کو گویا خبر ہو گئی
وہ جوگن ہوئی تھی جو نجم النسا جمی گرد وہ اپنے تن کی چھڑا
نہا دھو کے نکلی عجب آن سے کہ الماس نکلے ہے جوں کان سے
نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ

بیاہ بدر منیر اور بے نظیر

کدھر ہے تو اے ساقیٔ گل بدن دھری آج اس شمع رو کی لگن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز چڑھا بیاہنے وہ مہِ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار بجے شادیانے بہم ایک بار
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے

تماشائیوں کا جدا اک ہجوم
تپنگے گریں جوں چراغوں پہ جھوم
کوئی پان بیچے۔ کھلونے کوئی
کوئی دالموٹ اور سلونے کوئی
کھڑکنا وہ باجوں کا نوبت کے ساتھ
گرجنا وہ دھونسوں کا ڈنکوں کے ساتھ
وہ ابرق کی ٹٹی وہ مینے کا جھاڑ
کہے تو کہ تختے کی او جھل پہاڑ
جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات
کہوں واں کے عالم کی کیا تم سے بات

دولہا دولہن کا ملنا

عجب طرح کی رنگ رلیاں ہوئیں
کہ باتیں وہ مصری کی ڈلیاں ہوئیں
بہم پھر تو ہونے لگے اختلاط
اچنبے لگے دل سے عیش و نشاط

اشعار از غزلیات

(ردیف الف)

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مر الگ جائیگا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

نہ رہتی کبھی آہیں نہ تھمتے تھے آنسو
حسنؔ تجھ کو کیا رات غم تھا کسو کا؟

حسنؔ سے بات کی پھر تم نے اس نفسِ مسلسل کی — بجے گا آج ساری رات کیوں یہ سلسلہ چھیڑا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

ردیف ب

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یا رب! — آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یا رب!

ردیف ر

دامنِ صحرا سے اٹھنے کو حسنؔ کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

ردیف م

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ — بس آج کی رات سو چکے ہم

مانند حباب اس جہاں میں — کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

ردیف ی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر — بارے تو آج آیا تو بستی نظر پڑی

حسنؔ مت یاد کر ان صحبتوں کو — سدا یکساں نہیں رہتی کسی کی!

آئی تھی رات روتی ہوئی شمع بزم میں — حال اس کا پوچھ پوچھ صبا جان کھا گئی

وہ چشمِ لطف اور وہ عنایات کیا ہوئی — وہ غمزہ وادا وہ اشارات کیا ہوئی

ردیف ے

چلیے اب انتظار کیا کیجے   اب تلک آیا نہ یار کیا کیجے
لاکھ باتیں بھری ہیں دل میں آہ   حسرتوں کا شمار کیا کیجے
خانۂ دل تو ہو گیا ویراں   سیر باغ و بہار کیا کیجے

جان و دل ہیں اداس سے میرے   اٹھ گیا کون پاس سے میرے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے کترا کے کبھی   دل مجھے چھپ کے کہتا ہے ادھر کو چلیے
ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسنؔ   صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلیے

یہ کس کو خبر ہے، اب کے بچھڑے   کیا جانیے، اتنے کب ملیں گے
دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا   یاں لوگ عجب عجب ملیں گے
ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی   ہم یار سے کس سبب ملیں گے

شاہ قدرت اللہ قدرت

نام قدرت اللہ تخلص قدرت دہلی کے رہنے والے تھے۔ بعد میں مرشد آباد بھی جائے قیام کہا جاتا ہے۔ سالِ وفات ۱۲۰۵ھ ہے۔ ان کے حالات یا باقاعدہ کلام کہیں مل نہیں سکا۔

ادھر ادھر سے جو ہاتھ لگ گیا اسی سے تسکینِ خاطر کی ہے ؎

ردیف الف

علاج دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

ردیف ے

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہی ملکِ روم ہے اور سرزمینِ روس ہے

گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجیے زندگی
اس طرف آوازِ طبل اس جا صدائے کوس ہے

صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں کیا تو اپنی آز کا محبوس ہے

لے گئی اکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ مال و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

★

محمد قیام الدین قائمؔ (۱۷۳۰ء - ۱۷۹۴ء)

نام محمد قیام الدین تخلص قائمؔ۔ والد کا نام محمد ہاشم۔ چاند پور کے رہنے والے تھے پہلے ہدایت سے اصلاح لی، پھر میر درد سے، بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے۔ جن دنوں مصحفی ٹانڈہ میں تھے قائمؔ بھی وہیں تھے۔ پھر لکھنؤ اور آخر میں رامپور چلے گئے۔

اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

دیوان ان کا قلمی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے کچھ انتخاب تذکرۂ شعراء (مخزنِ نکات) میں دیا ہے۔

ردیف الف

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند　　کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا　　آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ردیف ت

سچ کہو قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے　　ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

قائمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری　　مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

ردیف ن

ہوس ہے عشق کی اہلِ ہوا کو ہم تو میاں　　سُنے سے نام محبّت کا زرد ہوتے ہیں

کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل　　کہ ہنسے تھا وہ بیوفا بھی یوں ہیں

ردیف ی

ہمنشیں ذکرِ یار کر کچھ آج　　اس حکایت سے جی بہلتا ہے

میر محمدی بیدار

میر محمد علی نام۔ میر محمدی عرف۔ بیدار تخلص۔ اکبر آباد کے سید تھے۔ میر حسن نے سنہ ۱۱۷۴ھ کے قریب انھیں درویشی کے لباس میں دہلی میں دیکھا تھا۔ اندازے سے کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دیوان ان کا جلیل احمد قدوائی نے مرتب کر کے سنہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد سے شائع کیا۔ ان لوگوں کا کلام نہ مل سکنے کی وجہ سے انتخاب اچھا نہیں ہو سکا۔

ردیف الف

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا　　ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا
گر یہی زلف یہی مکھڑا ہے　　غارتِ دیر و حرم کیجیے گا
جی میں ہے آج بجائے مکتوب　　یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا
مہربانی سے پھر اے بندہ نواز　　کہیے! کس روز کرم کیجیے گا

ردیف ن

تیری ہم خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں　　ورنہ یہ نالے تو پتھر پہ اثر کرتے ہیں
بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجیے　　آگے تو جان میاں ہم تو خبر کرتے ہیں

بیاںؔ

جاتا ہے یار کچھ تو بیاںؔ منہ سے بول لے   اے بد نصیب! مانع گفتار کون ہے؟

بیاںؔ کون ہے اب تلک پوچھتے ہو   تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے

اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام   نالاں ہی بیاں میں نے تجھے دیکھا ہے جب بھی

مظہرؔ جانجاں

نام شمس الدین جانجاں تخلص مظہرؔ۔ پیدائش ۱۱۔ رمضان ۱۶۹۸ء تاریخ وفات ۱۷۸۱ء ۷۔ محرم بتائی گئی ہے۔

ردیف الف

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے   اگر ہوتا چمن اپنا۔ گل اپنا۔ آشیاں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر   کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا   لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

ردیف ر

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

ردیف م

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

ردیف ے

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

میر سوز

سیّد تھے۔ میر محمدؔ نام۔ پہلے میرؔ تخلص کرتے تھے پھر سوزؔ کرلیا۔ زیادہ تر دہلی میں رہے آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے۔ مُبتلا کے بیان کے مطابق ۱۲۱۴ھ لکھنؤ میں موجود تھے ۱۷۹۸ء کو وفات پائی۔ جرأت نے تاریخ وفات کہی۔ قلمی دیوان موجود ہے۔ سال پیدائش ۱۷۲۰ء ہے

ردیف الف

جن کو نت دیکھتے تھے۔ اب اُن کا
دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا

یار یوں دور جا بسے — اللہ!
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

وہ مجھ کو ذبح کرتا تھا چھری سے　　میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا　　آہ یارب! رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا　　کہاں کا جان کو میری دھرا تھا
میں کاش اس وقت آنکھیں موند لیتا　　کہ میرا دیکھنا مجھ پر بلا تھا

ردیف ن

کبھی وہ مہر کرتے ہیں کبھی بیداد کرتے ہیں　　کبھی آباد کرتے ہیں کبھی برباد کرتے ہیں
خیال آٹھوں پہر جن کا لگا رہتا ہے یاں دل میں　　نہیں معلوم ہم کو بھی کبھی وہ یاد کرتے ہیں

الٰہی کیا کریں ضبطِ محبت ہم تو مرتے ہیں　　کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے میں اترتے ہیں
جفا پر جان دیتے ہیں ستم پر تیرے مرتے ہیں　　یہ ناکامِ محبت سچ تو یہ ہے کام کرتے ہیں
کہیں کیا ہم یہ جو صدمے گزرتے ہیں گزرتے ہیں　　لگا یا جس گھڑی دل اس گھڑی کو یاد کرتے ہیں
پئے تعظیم اٹھی ہے قیامت کوئے جاناں میں　　اجل کہتی ہے بسم اللہ جہاں ہم پاؤں دھرتے ہیں

ردیف ی

کوئی ایسی سکھی چاترنہ ملی مو سے پیو کے دوارے بٹھا دیتی
میں نے راہ مدینہ بھی دیکھی نہیں موری بہیاں پکڑ کے بٹھا دیتی
پیا سات سمندر پار بسو۔ مورے پگ تو نہ چلنے کا زور رہو
نہیں جاتی مدینہ کوئی ہوا۔ مو سے ملکِ عرب میں اڑا دیتی

میں تو سونی سیج یا بہ تربت ہوں پیا دیس عرب میں بہ راحت ہے
کبھی دیتے جو سپنے میں درس دکھا وہیں چرنوں میں سیس نوا دیتی

ردیف ے

دور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے
میکشوں کے سر پہ یا رب پیر میخانہ رہے

تیرے مستوں کا ہے ہنگامہ پرستش کے لئے
او بت کافر سلامت تیرا بت خانہ رہے

قبر میں پوچھیں نہ مجھ سے پھر وہ کچھ منکر نکیر
مرتے دم یا رب خیالِ روئے جانانہ رہے

حاتم

شیخ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ تاریخ پیدائش ۱۶۹۹ء پہلے سپاہ گری پیشہ تھا۔ ابہام گوئی کی ابتدا کی اور اسی انداز میں پورا دیوان ہے جس کو کہتے ہیں ضائع ہو گیا۔ آخر عمر میں جو سودا میر کے رنگ کا کلام ہے اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا اور جواب تک قلمی ہی ہے ۱۷۹۹ء رمضان کے مہینے میں وفات پائی۔ میر نے اپنے تذکرے میں انھیں "مرد لیست جاہل متمکن" کہا ہے۔

ردیف الف

آیا ہے اٹھ کے نیند سے کچھ رس بسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

خوبانِ جہاں ہوں جس سے تسخیر
ایسا کوئی ہم ہنر نہ دیکھا

اس تیغِ نگہ سے ہو مقابل ایسا کوئی بے جگر۔ نہ دیکھا
جو آب ہے۔ آبرو ہیں حاتم ایسا کوئی ہم گہر نہ دیکھا

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت

نام حکیم ہدایت اللہ خاں تخلص ہدایت۔ ان کا سالِ وفات ۱۲۱۵ھ ہے میر درد کی شاگردی۔

ردیف الف

کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا میں موہنہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا
ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

ردیف و

پہنچے ہے فصل گل کوئی حسنِ نگار کو مکھڑے پہ اس کے صدقے کیا نوبہار کو
اللہ رے کارخانۂ تقدیرِ ذوالجلال یہ اعتبار! ہستیٔ بے اعتبار کا

ردیف ے

وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہے یہی دگرنہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

مرزا قلی خاں آشفتہ

نام مرزا رضا قلی۔ تخلص آشفتہ۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ اور ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ میں تھے۔

ردیف ے

بتاؤں کیا بھلا اہل وطن میں قید کی مدت
ہوا اتنا زمانہ گھس گئے حلقے سلاسل کے
شب غم کاٹ لایا تھا کہ تیور بجھ گئے دل کے
یہ کشتی ہائے ڈوبی اور بہت نزدیک ساحل کے
نہ سمجھی ہچکیوں کا مدعا دنیا نہ کچھ سمجھی
بہت پر کیف تھے پیغام یہ ٹوٹے ہوئے دل کے

ہجر سے قتل۔ وصل سے اچھا
جی میں جو آوے سو حبیب کرے
ہو گیا ایک صبح ہدیہ آشفتہ
موت ایسی خدا نصیب کرے

بھورے خاں آشفتہ

نام بھورے خاں۔ تخلص آشفتہ۔ مائل کے شاگرد تھے اور ۱۲۲۱ھ میں زندہ تھے۔

ردیف ن

مدت سے ہے اختر طالع۔ ماہ جبیں بن گردش میں

کھول تو با ہمن پوتھی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو۔ ہاتھ دکھاؤ۔ فال کھلاؤ کوئی ۔۔۔ پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں
عقل و فراست سلب ہوئے سب ہائے جنوں رے وائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں
جوگ لیا آشفتہؔ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی ۔۔۔
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

حیرت

ردیف ی

یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل
یا ہے وہی نگاہ کہ بیگانہ ہو گئی

اللہ رے اشکباریٔ شمع شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرتؔ کے غم کدے میں خوشی کا گزر کہاں
آپ آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

ردیف ے

فکرِ فردا بھی کریں گے حیرتؔ
پہلے یہ شب تو بسر ہو جائے

انشاء اللہ خاں

سید انشاء اللہ خاں انشا تخلص ۱۷۵۳ء مطابق ۱۱۶۷ھ اور ۱۷۵۸ء مطابق ۱۱۷۲ھ کے درمیان مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے بزرگ نجف اشرف سے آکر دلّی میں بس گئے تھے۔ انشا کے والد میر ماشاء اللہ خاں حیدر بڑے عالم و فاضل اور حاذق طبیب تھے۔ باپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر انشاء اللہ خاں بھی عالم و فاضل طبیب اور شاعر بھی ہوئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے البتہ شروع میں والد سے اصلاح لیتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو ہندی ہر زبان میں نظم پر قدرت تھی۔ ہندوستان کی اور بھی متعدد زبانوں پر حاوی تھے۔ مرشد آباد سے دلّی آئے۔ اور شاہ عالم ثانی کے دربار میں جگہ پائی۔ شعراء کی چشمک اور حالات کی ناسازگاری سے بددل ہو کر ۱۲۰۵ھ کے قریب لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۲۱۵ھ سے ۱۲۲۶ھ تک شاہان اودھ کے دربار سے متعلق رہے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے پھر نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ انشاء اللہ نے اپنی ظرافت، بذلہ سنجی اور شوخ مزاجی سے نواب کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ ان کے بغیر اسے ایک دم چین نہ آتا۔ آخر میں نواب سے کسی بات پر اَن بن ہوگئی۔ دربار سے برطرف ہو گئے۔ گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ آخر عمر میں پاگل ہو گئے۔ اور بالآخر عمر کا آخری حصہ کس مپرسی میں گزار کر بمقام لکھنؤ ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

علاوہ کلیات انشاء کے ان کی دو اور تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک "دریائے لطافت" جو اُردو قواعد کی سب سے پہلی کتاب ہے دوسری "رانی کیتکی کی داستان" جس میں یہ کمال ہے کہ عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا ہے۔

ردیف الف

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا

نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھ اے انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

یہ شب گزشتہ دیکھا کہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا

ہوئے وعدہ پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھا کچھ تماشا! یہ سنو عتاب الٹا

ردیف ر

بھر بھر جہاں بر سست نور
رد بلّیاں ۔۔ دشمن دور

ردیف ی

گر نازنیں کے کہنے سے مانا برا ہو کچھ
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشا سے کیں سہی

ردیف ے

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے؟
وہ تو بیچاری آپ ننگی ہے

ردیف ن

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں، کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی حال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک　　نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا　　غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مصحفی

غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص تھا ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا تحصیل علم کا شوق ۱۱۸۵ء میں مصحفی کو دلی کھینچ لایا۔ اگرچہ اس درمیان میں ایک سال کے لئے لکھنؤ بھی گئے۔ پھر دوسری بار ۱۱۹۸ء میں لکھنؤ گئے۔ جبکہ انشاء سے جھگڑا بھی ہوا۔ جو بقول امیر احمد علوی ۱۲۱۰ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیانی زمانے کا واقعہ ہے۔ وفات لکھنؤ میں ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔

مصحفی کے دو فارسی دیوان۔ دو تذکرے اردو گو شعراء کے "تذکرۂ ہندی" اور "ریاض الفصحاء" اور ایک تذکرہ فارسی شعراء کا "عقد ثریا" فارسی زبان میں ترتیب دیئے گئے۔ علاوہ ان کے آٹھ دیوان اردو کے اور بہت سی مثنویاں یادگار ہیں۔

ردیف الف

فصل گل فصل خزاں دونوں گئیں اے صیاد　　مرغ دل کون سے موسم میں رہا ہوئے گا؟

لطف کرتے تھے مجھ پہ تم ہر دم　　جان من یہ عتاب کس دن تھا؟
حادثے ہوتے تھے زمانے میں　　اس قدر انقلاب کس دن تھا؟

مصحفیؔ! آج تو قیامت ہے دل کو یہ اضطراب کس دن تھا!؟

مہ چار دہ کو عالم میں دکھاؤں گا فلک کو اگر اس نے پردہ موہنہ سے شب ماہتاب اٹھا
میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروزِ عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا
افسوس ہے کہ تم تو رہے مست خواب صبح اور آفتاب عمر لبِ بام آگیا

شیخ! کلیے سے اُٹھ نکل باہر گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
بُت پرستی سے باز آ اے دل بُت کے پوجے خدا نہیں ملتا

گر اس موہنہ سے برقع کبھی کھل گیا تو دیکھو گے مہ خاک میں مل گیا
رہا ہے کہاں ہم میں آرام و صبر وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا
ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے غرض اس گلستاں سے جو گل گیا
وہی رنگ گل ہے وہی چہچہے چمن سے کہاں شور بلبل گیا

خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے ماہ تھا، یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا کیا تجھے کچھ ملال تھا؟ کیا تھا!

خورشید کو سایہ میں زلفوں کے چھپا رکھا چتون کو دکھا خوبی سے کو لگا رکھا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ردیف م

آنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

ردیف ن

ہے یہ عشق۔ آفت و بلا تو نہیں اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

ہم تو اس کوچے میں گھبرا کے چلے جاتے ہیں دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے آتے ہیں

ردیف و

ٹک رحم کرو چاک گریباں پہ ہمارے یارو کوئی اس شوخ کے دامان کو نہ چھیڑو

ردیف ی

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفیؔ اسیر فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

کھینچ کر تیغ ... یار آیا ہے اس گھڑی سر جھکا دیجئے ہی بنی

یار کا صبح پہ ہے وعدۂ وصل   ایک شب اور بھی جئے ہی بنی

دیکھیو! پاؤں رکھ دیا کس نے   آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی

ردیف ے

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا   اس کی بلا سے بوم رہے یا ہُما رہے

اگرچہ ہم بھی ہیں شاکی پہ جی یہ چاہے ہے   ہمارے یار کا ہم سے کوئی گِلا نہ کرے

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے   کون سے شہر میں ہوتا ہے، کدھر ہوتا ہے

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ چمن سے   داماں میں نہ کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے   ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے

راہ میں مجھ کو ہمرہاں میرے   جان کر ناتوان چھوڑ گئے

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے۔ کبھو آہ بھر کے چلے گئے

ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

نظیرؔ اکبر آبادی

سید ولی محمد نام۔ نظیرؔ تخلص۔ بقول فرحت اللہ بیگ سنہ ۱۷۳۵ء مطابق ۱۱۴۷ھ میں اور بقول مفتی انتظام اللہ شہابی سنہ ۱۱۴۸ھ میں بمقام دلی پیدا ہوئے۔ بائیس تئیس سال کی عمر میں جب احمد شاہ ابدالی نے دلی پر حملہ کیا تو نظیر اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ اور وہاں مٹھائی کے پل کے پاس لنڈی دروازہ میں رہائش اختیار کی۔ جہاں پھر تمام عمر بسر کی۔ زندگی کا زیادہ حصہ معلمی میں گزرا۔ اور آخر کار ۲۶ صفر سنہ ۱۸۳۰ھ میں وفات پائی۔

نظم میں ان کی یادگار "کلیاتِ نظیر" اور "دیوان نظیر" ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی زندگی پر شہباز اور مخمور اکبر آبادی نے "زندگانی بے نظیر" اور "روحِ نظیر" کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں۔

پری کا سراپا

خونریز کرشمہ، ناز و ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہی
مژگاں کی سناں نظروں کی انی ابرو کی کھچاوٹ ویسی ہی
قتال نگہ اور ڈوشٹ غضب آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہی
پلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت سرمے کی لگاوٹ ویسی ہی
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہی
بیدرد، ستمگر، بے پروا، بیکل، چنچل، چٹکیلی سی

دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
آنکھوں کی بان ہٹیلی سی، کاجل کی آنکھ کٹیلی سی
وہ انکھیاں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی کچھ پیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہی
تھی خوب دوپٹے کی سر پر سنجاف تمامی کی الٹی
بلدار لٹیں تصویر جبیں، جکڑی مینڈھی، سبز کنگھی
دل لوٹ نہ جاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ نکلے کیونکر جی
وہ رات اندھیری بالوں سے۔ وہ مانگ چمکتی بجلی سی
زلفوں کی کھلت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہی
چہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن چمکتے موتی سے
خوشرنگ پسینے کی بوندیں سو بار جھمکتے موتی سے
ہنسنے کی ادا میں پھول جھڑے باتوں میں ٹپکتے موتی سے
وہ پتلے پتلے ہونٹھ غضب اور دانت چمکتے موتی سے
پاؤں کی رنگاوٹ قہر ستم۔ دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہی
وہ کافر دھج جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے
پازیب، کڑے، پائل گھنگھرو۔ کڑیاں چھڑیاں، گجرے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں ہر ایک قدم پر سو جھمکے
وہ چنچل چال جوانی کی۔ اونچی ایڑی۔ نیچے پنجے
کفشوں کی کھٹک۔ دامن کی جھٹک ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہی

اک شور قیامت ساتھ چلے۔ نکلے کافر جس دم بن ٹھن
بل دار کمر۔ رفتار غضب دل کی قاتل۔ جی کی دشمن
مذکور کروں کیا اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن
کچھ ہاتھ چلیں کچھ پاؤں ہلیں پھڑکے بازو تھرکے سب تن
گالی وہ بلا تالی وہ ستم۔ انگلی کی نچاوٹ ویسی ہی
کہنی مارے چٹکی لے کے چھیڑے سے جھڑکے دیوے گالی
ہر آن جبہ خوش ہر دم اچھا۔ ہر بات خوشی کی چہل بھری
نظروں میں صاف اڑا لے دل اس ڈھب کی کافر عیاری
اور رہٹے جاوے سو کوس پرے گر بات کہوں کچھ مطلب کی
رمزوں کے ضلعے غمزوں کی جگت ٹھٹھوں کی اڑانٹ ویسی ہی
قاتل ہر آن نئے عالم کافر۔ ہر آن نئی جھمکیں..
بانکی نظریں ترچھی پلکیں بھولی صورت میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب جی لینے کی سو سو گھاتیں
ہر وقت پھبن ہر آن سجن دم دم میں بدلے لاکھ سجیں
باہوں کی جھلک گھونگھٹ کی ادا جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہی
کچھ ناز و ادا کچھ مغروری، کچھ شرم و حیا کچھ بانک پنا
کچھ آمد حسن کے موسم کی۔ کچھ کافر حسن رہا گدرا
کچھ شور جوانی اٹھتی کا چڑھتا ہے امنڈ کر جوں دریا
وہ سینہ ابھرا جوش بھرا وہ عالم جس کا جھوم رہا

شانوں کی اکڑ۔ جوبن کی ٹکڑ۔ سج دھج کی سجاوٹ ویسی ہی

بحرِ طویل

ایک دن باغ میں جا کر۔ چشم حیرت زدہ وا کر۔ جامۂ صبر قبا کر۔ طائر ہوش اڑا کر
شوق کو راہ نما کر۔ مرغ نظارہ اڑا کر۔
دیکھی رنگت جو چمن کی۔ خوبی نسرین وسمن کی۔ شکل غنچوں کے دہن کی۔ تازگی لالہ کے تن کی
تازگی گل کے بدن کی۔
کشت سبزہ کی ہری تھی۔ نہر بھی لہر بھری تھی۔ ہر خیاباں میں تری تھی۔ ڈالی ہر گل کی ہری تھی
خوش نسیمِ سحری تھی۔
سرو شمشاد وصنوبر۔ سنبل وسوسن وعرعر۔ نخل میوے سے رہے بھر۔ نفسِ بادِ معنبر
در و دیوار معطر۔ کہیں قمری تھی مطوّق۔
کہیں انگور معلق۔ نالے بلبل کے مدقق۔ کہیں غوغائی کی بق بق۔
اس قدر شاد ہوا دل۔ مثل غنچے کے گیا کھل۔ غم ہوا کشتہ وبسمل۔ شادی خاطر سے
گئی مل۔ خرمی ہو گئی حاصل۔
روح بالیدہ ہو آئی۔ شانِ قدرت دی دکھائی۔ جان سی جان میں آئی۔
باغ کیا تھا گویا۔ اللہ نے اس باغ میں جنت کو اتارا۔

دوسرا مصرع

تا گہاں صحن چمن میں مجمع سرو وسمن میں۔ جیسے ہو روح بدن میں۔ جیسے ہو شمع لگن میں۔

جیسے خورشید کرن میں ماہ پروین دپرن میں ۔ دیکھا اک دلبر رعنا و طرحدار جفاکار دل آزار ۔ نمودار ۔ نگہ ہمسر شمشیر ۔ مژہ ترکش پر تیر ۔ سر زلف گرہ گیر ۔ دل خلق کی زنجیر جبیں نور کی تصویر ۔ وہ رخ شمس کی تنویر ۔ زباں شہد بیاں شیر ۔ نظر روح کی اکسیر دہن غنچۂ خاموش ، سمن برگ سردوش سخن بحر گہر جوش ۔ بدن سرو قبا پوش ۔ چھڑی گل کی ہم آغوش ۔ وفا رحم فراموش ۔ ہر اک آن ستم کوش ۔ عجب حسنِ دلآرا ۔ نہ کبھی مہر نے دیکھا ۔ نہ کبھی ماہ نے دیکھا ۔ نہ کسی وہم میں آیا ۔ نہ تصور میں سمایا ۔ وہ نظر مجھ کو جو آیا ۔ مجھے حسن اپنا دکھایا ۔ دل نے اک جوش اٹھایا ۔ جی نے سب ہوش اڑایا ۔ سر کو پاؤں پہ جھکایا ۔ اشک آنکھوں سے بہایا ۔ اس نے جب یوں مجھے پایا ۔ یہ سخن ہنس کے سنایا کہ تو ہے عاشقِ شیدا ۔ لیکن عاشق نہیں پیدا ۔ ہو وے تجھ پر یہ ہویدا ۔ کہ اگر ہم کو تو چاہے یا محبت کو نباہے نہ کبھی غم سے کراہے ۔ نہ کسی غیر کو چاہے ۔ نہ کبھی گل کی طرف دیکھ نہ سنبل کی طرف دیکھ ۔ نہ بلبل کی طرف دیکھ ۔ نہ بُستاں پہ نظر کر ۔ نہ گلستاں میں گذر کر ۔ چھوڑ دے سب کی مودت ۔ ہم سے رکھ دل کی محبت اس میں ہم بھی تجھے چاہیں ۔ تجھ سے الفت کو نباہیں ۔ ہیں یہی چاہ کی راہیں ۔ گر یہ مقدور تجھے ہو ۔ اور یہ منظور تجھے ہو ۔ تو نظیر آج سے تو چاہنے والا ہے ہمارا ۔

ہولی کی بہاریں

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم۔ شیشے۔ جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز وادا کے رنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ[1] بھرے
کچھ گھنگھرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویّوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتاویں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی۔ کچھ ہاتھ چلیں۔ کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

---

[1] منہ چنگ نام ہے ایک باجے کا جو منہ سے بجایا جاتا ہے۔

لطفِ شباب

کیا عیش کی رکھتی ہے سب آہنگ جوانی　　کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
ہر آن پلاتی ہے مے اور رنگ جوانی　　کرتی ہے کہیں صلح کہیں جنگ جوانی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

رستے میں نکلتے ہیں تو ہوتی ہیں یہ چاہیں　　وہ شوخ کہ ہوں بند جنھیں دیکھ کے راہیں
کھا لیتے ہے کوئی ہنس کے کوئی بھرتی ہے آہیں　　پڑتی ہیں ہر اک جا سے نگاہوں پہ نگاہیں
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

تنتے ہیں اگر اینٹھ کے چلتے ہیں عجب چال　　جو پاؤں کہیں راہ کہیں سیف کہیں ڈھال
کھینچتے ہیں کہیں بال۔ کہیں توڑ لیا گال　　چڑھ بیٹھے کہیں ہاتھ کہیں موہنہ کو دیا ڈال
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

ہنس ہنس کے کوئی حسن کی چھل بل ہے دکھاتی　　مستی کوئی سرمہ کوئی کاجل ہے دکھاتی
چتون کی لگاوٹ کوئی چنچل ہے دکھاتی　　کرتی کوئی انگیا کوئی آنچل ہے دکھاتی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کہتی ہے کوئی رات مرے پاس نہ آئے　　کہتی ہے کوئی ہم کو بھی خاطر میں نہ لائے

کہتی ہے کوئی کس نے تمہیں پان کھلائے　　کہتی ہے کوئی گھر کو جو جائیے ہمیں کھائے
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کیا تجھ سے نظیرؔ اب میں جوانی کی کہوں بات　　اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
محبوب پری زاد چلے آتے ہیں دن رات　　سیریں ہیں بہاریں ہیں تواضع ہے مدارات
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

عالمِ پیری

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا　　اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا　　ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جب تلک ایام جوانی کے ہرے رو کھ　　محبوب وہ ملتے تھے نہ ہو دیکھ جنھیں بھوک
بیٹھے تھے پرند آن کے جب تک تھا ہرا روپ　　اب کیا ہے جو پت جھڑ ہوا اور جڑ ہی گئی سوکھ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مجلس میں جوانوں کی تو ساغر ہیں چھلکتے　　چہکے ہیں بہاریں ہیں پریرو ہیں جھمکتے

ہم ان کے تئیں دور سے ہیں رشک سے تکتے   وہ عیش و طرب کرتے ہیں ہم سر ہیں پٹکتے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

خوباں میں اگر جاویں تو ہوتی ہے یہ پھکڑی   کھینچے ہے کوئی ہاتھ کوئی پکڑے ہے لکڑی
مونچھیں کہیں بتی کیلئے جاتی ہیں پکڑی   داڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ناچ میں جاویں تو یہ حسرت ہے ستاتی   جو ناچے ہے کافر وہ نہیں دھیان میں لاتی
پھیکی سی پرانی سی لگاوٹ ہے جتاتی   پر ہم کو تو کافر وہ انگوٹھا ہے دکھاتی

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر جائیں طوائف میں تو لگتی ہیں سنانے   کیا آئے ہیں حضرت ہمیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے   ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں کئے دھوم دھڑکے   ویسے ہی بڑھاپے میں چھُٹے آن کے چھکے
سب اڑ گئے کافور وہ نظارے وہ جھمکے   اب عیش جوانوں کو ہیں اور بوڑھوں کو دھکے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بوڑھے ہوئے پر حسن کی چاہت نہیں چھٹتی آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھٹتی
اور دل سے بھی محبوب کی الفت نہیں چھٹتی سب چھٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھٹتی
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

محفل میں وہ مستی سے بگڑنا نہیں بھولے ساقی سے پیالوں پہ جھگڑنا نہیں بھولے
ہنس ہنس کے پریزادوں سے لڑنا نہیں بھولے وہ گالیاں وہ بوسوں پہ اڑنا نہیں بھولے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموت

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مرگیا دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مرگیا
عاقل تھا وہ۔ جو آپ کو سمجھا کے مرگیا بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مرگیا
دُکھ پا کے مرگیا کوئی سُکھ پا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

پڑھ کر نماز کوئی رہا پاک باوضو کوئی شراب پی کے پھرا مست کو بکو
ناپاکی۔ پاکی موت کے ٹھہری نہ روبرو کوئی حبادتوں سے مرا ہو کے سرخرو
ناپاک روسیاہ بھی پچھتا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

کیا کالی پیلی شکل کے کیا گورے گلعذار　　عاشق کوئی ہے اور کوئی معشوق طرحدار
عاقل ۔ حکیم ۔ جاہل و فاضل رسالدار　　پنڈت ۔ نجومی ۔ بیدچہ ناداں چہ ہوشیار
دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

رہے نام اللہ کا!

دنیا میں کوئی خاص نہ کوئی عام رہے گا　　نہ صاحبِ مقدور نہ ناکام رہے گا
زردار نہ بے زر نہ بد انجام رہے گا　　شادی نہ غمِ گردشِ ایام رہے گا
نہ عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اب دل میں بڑے اپنے جو کہلاتے ہیں عیار　　سو مکر و دغا کرتے ہیں اک آن میں تیار
جب آ کے فنا ڈالیگی سر کے اوپر اک وار　　اک وار کے لگتے ہی یہ ہو جائینگے سب پار
نے مکر نہ حیلہ نہ کوئی دام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ٹک غور کرو اب ہیں کہاں مجنوں و فرہاد　　لیلیٰ کہاں شیریں کہاں وہ نازوہ بیداد
جو پھول کھلے واہ وہ سب ہو گئے برباد　　ہم تم بھی غنیمت ہیں سن او یار پریزاد
واں حسن نہ یاں عشق کا ہنگام رہیگا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

تنبیہ الغافلین

جہاں ہے جب تلک یاں سیکڑوں شادی و غم ہونگے ہزاروں عاشقِ جانباز اور لاکھوں صنم ہونگے
کنار و بوس اور عیش و طرب بھی دم بدم ہونگے مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہونگے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہونگے
میاں اک دن وہ آویگا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

بنجارا نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونی پلّا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
گر تو ہے لکھی بنجارا۔ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر۔ مصری۔ قند۔ گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ۔ منقہ۔ سونٹھ۔ مرچ۔ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ملہ پلا۔ ٹاٹ کا بڑا تھیلا جس میں غلہ وغیرہ رکھتے ہیں

یہ بدھیا لادے۔ بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتہ کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت بھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے موہنہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بغچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں　　سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں　　ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا　　گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا　　باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات اور پھسلن

برسات کا جہان میں لشکر پھسل پڑا — بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا
جھڑیوں کا مینھ بھی آ کے سراسر پھسل پڑا — چھتّا کسی کا شور مچا کر پھسل پڑا
کوٹھا جھکا اٹاری گری۔ در پھسل پڑا

دیکھو جدھر ادھر کو یہی غل پکار ہے — کوئی پھنسا ہے اور کوئی کیچڑ میں خوار ہے
پیادہ اٹھا جو مر کے تو پھپڑا اسوار ہے — گرنے کی دھوم دھام یہ کچھ بے شمار ہے
جو ہاتھی رپٹا اونٹ گرا۔ خر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلتی زمین خوار — عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار — گرنے کا مکر کر کے اچھل کود ایک بار
اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا — پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حسن کی مینھ برسا ناز کا — پھسلن جب آئی ایسی تو پھر کچھ نہ بس چلا
آخر کو واں نظیرؔ بھی آ کر پھسل پڑا

مذمت اہل دنیا

کیا کیا فریب کہیے دنیا کی فطرتوں کا — مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست مل کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا — پھر کس زباں سے شکوہ اب کیجے دشمنوں کا

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

اس راہ میں جو آیا اسوار گہہ کے گھوڑا — ٹھگ سے بچا تو آگے قزاق نے نہ چھوڑا
سویا سرا میں جا کے تو چور نے جھنجھوڑا — تیغا رہا نہ بھالا، گھوڑا رہا نہ کوڑا

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

نکلا ہے شیر گھر سے گیدڑ کا گوشت کھانے — گیدڑ کی دھن لگا وے خود شیر کو ٹھکانے
کیا کیا کریں ہیں باہم مکر و دغا بہانے — یاں وہ بچا نظیر اب جس کو رکھا خدا نے

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

مذمتِ بخل

صدائے درویش

زر کی جو محبت تجھے پڑ جاوے گی بابا — دکھ اس میں تری روح بہت پاوے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترساوے گی بابا — دولت جو ترے یاں ہے نہ کام آوے گی بابا

پھر کیا تجھے اللہ سے ملواوے گی بابا

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھرے گا — ہے یہ تو یقیں آخرش اک دن تو مرے گا
پھر بعد ترے اس پہ جو کوئی ہاتھ دھرے گا — وہ ناچ مزا دیکھے گا اور عیش کرے گا

اور روح تری قبر میں گھبرائے گی بابا

تسلیم ورضا

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں — ہر کام میں ہر دام میں ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں — بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں ۔ اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

حکمت

کوڑی کی فلاسفی

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں — کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن میں نہایت مہین ہیں — سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

روٹی کی فلاسفی

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا

دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہئے یہ ہے دل کا نور کیا اس کے مشاہدہ میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا کشف القلوب اور یہ کشف الصبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

پیٹ کی فلاسفی

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لئے سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لئے
سیکھا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لئے پھرتا ہے کوئی بے سر و پا پیٹ کے لئے
جو ہے سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لئے

بیٹھے ہیں مسجدوں میں مصلے بچھا بچھا جبے پہن کے ہاتھ میں تسبیح کو پھرا
واعظ کے ہر سخن میں ہے کھانے کا مدعا عابد بھی دعوتوں کی عبادت ہے کر رہا
زاھد بھی مانگتا ہے دعا پیٹ کے لئے

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے شاہ مسرور غنی شاد۔ گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اُسے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے ۱

آدمی کی فلاسفی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں — اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی — اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی — چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی بجا تالیوں کو یار — اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اتار
ننگا کھڑا اچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار — سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ — قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ — دوڑے ہیں آدمی ہی مشعلیں جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ — پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ[۱] — سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

۱؎ طرحدار۔

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چوہوں کا اچار

پھر گرم ہوا آن کے بازار چوہوں کا ہم نے بھی کیا خوانچہ تیار چوہوں کا
سر پاؤں کچل کوٹ کے دو چار چوہوں کا جلدی سے کچومر سا کیا مار چوہوں کا
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

سوکھے جسے ترکاری سے تلنے کے ہوں درکار تو سوکھے بھی کھونٹی پہ لٹکتے ہیں کئی ہار
کچھ تیل کے، کچھ پانی کے، کچھ چٹنی ہے تیار کس طرح کی لذت ہے تو چکھ دیکھ مرے یار
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

دیمک کی مرچ لال سڑی نیبوں کی رائی دم، ٹانگ، نلی، کھوپڑی نس نس ہے سڑائی
اور جس پہ سڑی موری کی کیچڑ ہے ملائی جب ایسی بنی زور مزے دار کھٹائی
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

کچھ کیچوے کچھ بچھو ہیں کچھ ناگ ہیں کالے بھونے ہوئے چیونٹے بھی کئی سیر ہیں ڈالے
[illegible] کچھ مکھیاں کچھ مکڑی کے جالے اور ان کے سوا کتنے مصالحے ہیں جو ڈالے
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

کچھ اس میں اکیلے نہ چبے سیر پڑے ہیں گھونس اور چھچھوندر کے کئی ڈھیر پڑے ہیں

جوں لستو۔ مچھر اور کئی سیر پڑے ہیں　　اور کھاٹ کے کھٹمل بھی سوا سیر پڑے ہیں
کیا زور مزیدار ہے آچار چہوں کا

چوہوں کا جدا۔ چوہوں کی موچھوں کا جدا ہے　　دُم کا وہ جدا کان کا آنکھوں کا جُدا ہے
لوٹے میں سڑی کھال کا، بالوں کا جدا ہے　　پیالی میں نری سوت کی آنتوں کا جُدا ہے
کیا زور مزیدار ہے آچار چہوں کا

جب دانت تلے کھوپڑی بھرتی ہے چرا کے　　کھل جاتے ہیں لذّت کے دلوں بیچ بھنبا کے
چکھتے ہی زباں بھرتی ہے اس ڈھب کے تڑا کے　　شبرات میں جس طرح سے چھٹتے ہیں پٹا کے
کیا زور مزیدار ہے آچار چہوں کا

پاچن کے اُپر اب تو یہ چورن کا چچا ہے　　جو کھاوے تو پھر پیٹ کا پتھر بھی پچا ہے
ترشی میں کھٹائی میں یہ اب ایسا رچا ہے　　جو آم کا بابا ہے تو لیموں کا چچا ہے
کیا زور مزیدار ہے آچار چہوں کا

از غزلیات

وہ چین خود رو کٹیلے ابرو وہ چشم جادو نگاہیں آہو　　وہ پلکیں کج خو کہ جن کا ہر مو جگر کے اندر کھٹک رہا ہے
لب دہاں بھی وہ نرم و نازک مسی و پاں بھی وہ قہر و آفت　　سخن بھی کرنیکی وہ لطافت کہ گویا موتی ٹپک رہا ہے
وہ کان جوبن میں چھک رہے ہیں جواہر و نگیں جھمک رہے ہیں　　ادھر کو جھمکے جھمک رہے ہیں ادھر کا بالا چمک رہا ہے

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں　　دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

؎ بھنبا تھا ۔ بڑا سوراخ جو آر پار ہو جائے۔

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل　　اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو　　یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچے سے　　الٰہی! راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

ناز اٹھائیں جفائیں تو اٹھائیں لیکن　　لطف بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانے ہے

جرأت

شیخ قلندر بخش نام۔ جرأت تخلص۔ حافظ امان دہلوی کے فرزند تھے۔ پرورش فیض آباد میں ہوئی لیکن پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اور سلیمان شکوہ کے دربار میں کافی رسوخ حاصل کیا۔ موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے۔ جوانی میں چیچک نکلی تھی۔ اس میں جرأت کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لکھنؤ محلہ رستم نگر میں آخر وقت تک رہے اور ۱۸۱۰ء کو وفات پائی۔

ان کا دیوان چھپ چکا تھا۔ مگر اب نایاب ہے۔ جرأت پر دو سال ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی ایک کتاب اردو مرکز کی طرف سے چھپ چکی ہے سال پیدائش ۱۷۴۵ء ہے

ردیف الف

میری اور اس شوخ کی صاحب سلامت جوں ہوئی　　صبر و طاقت نے کہا لو ہم نے تو مجرا کیا
وہ گیا اٹھ کر جدھر کو میں ادھر حیران سا　　اس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

ردیف ن

کیونکہ تم پاس سے ہم جائیں بھلا اور کہیں　　جی تو لگتا ہی نہیں یاں کے سوا اور کہیں

کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اس کا　　تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں
کبھی اس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے　　تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کیدھر کو میں جاتا ہوں

مناسب گرچہ جانا بار بار اس جا نہیں جرأت　　ولے کیا کیجیے بیتابی سے ہم لاچار جاتے ہیں

نالہ و آہ و فغاں سب مرا دم بھرتے ہیں　　آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

ردیف ی

کون رخصت ہو کے یہ ہم سے گیا یارب جو آہ　　صبر نے مجرا کیا رخصت شکیبائی ہوئی
دوڑ دوڑ آنے سے جرأت کے رکو مت کیا کرے　　اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

ردیف ے

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے ہیں آپ آئے ہوئے　　کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
آپ سے ہیں تو نہ جاتا یہ کروں کیا کہ کہیں　　دل بیتاب لئے جاتے ہے دوڑائے ہوئے
گھر میں بے یار ہے شکل اپنی یہ دل کے ہمراہ　　دو گنہ گار ہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے
آگئے تم دست پہ قبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا　　سر تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں ہنوڑائے ہوئے

نہ تنہا دل خرام ناز پر ہر آن لوٹے ہے　　ترا دامن بھی قدموں پر ترے اے جان لوٹے ہے

گیا ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم — وہ منظر کیا درونِ خانۂ ویران لوٹے ہے
کرے ہے چاندنی کی سیر جب وہ بیٹھ کشتی میں — تو کیا کیا موج پر عکسِ مہِ تابان لوٹے ہے

کیا ہجومِ بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے — جب یہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے
لے گیا اک راہ چلتا دین و دل صبر و قرار — اب وہ یاد آتا ہے تو بس جی ہی نکلا جائے ہے
کیا کہوں اے ہمنشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی — جوں کسی کا قافلہ رستے میں لوٹا جائے ہے
اشکِ خونی دیکھ چہرے پر مرے بولا وہ شوخ — دن بہ دن رنگ اب تو جرأت کا چمکتا جائے ہے

اثر دہلوی

میر محمد نام۔ اثر تخلص۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاگردی بھی انہی کی اختیار کی۔ اور مرید بھی انہی کے ہوئے۔ میر درد کی وفات کے بعد میر اثر سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے مفصل حالات نہیں مل سکے۔

"مثنوی خواب وخیال" اور دیوان اثر ان کی یادگار ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق صاحب نے اس میں محنت کی ہے۔

ردیف الف

آئیے گا غریب خانے میں — یا مجھے اپنے ہاں بلائے گا؟!
منہ تو اس خوبرو کا دیکھا تم — لیک خو بو بھی آزمائے گا

تیرے وعدوں کا اعتبار کیا — جھوٹی ناحق قسم نہ کھائیے گا
اس کی صحبت میں غیر آنے لگے — اے اثرؔ اب وہاں نہ جائیے گا

تیرے آنے کا احتمال رہا — مرتے مرتے یہی خیال رہا
غم ترا دل سے کوئی نکلے ہے — آہ ہر چند میں نکال رہا

کیا بتائیں کہ اس چمن کے بیچ — کہیں اپنا بھی آشیانہ تھا
کبھو کرتے تھے مہربانی بھی — آہ وہ بھی کوئی زمانہ تھا
ہوشیاروں سے مل کے جانو گے — کہ اثرؔ بھی کوئی دوانہ تھا

جس وقت کہ تو نے اسے پیغام دیا تھا — قاصد! بخدا اُن نے مرا نام لیا تھا؟
اب تو ملے بن جی ہی اثرؔ کا نہیں رہا — وعدوں نے ترے کوئی دنوں تھام لیا تھا

تو نہ آیا و لے اثرؔ کے تئیں — مرتے مرتے بھی انتظار کیا

چارۂ کار ہی اثرؔ نہ رہا — کوئی اپنی خوشی سے صبر کیا!

خیر سے موسمِ شباب کٹا — چلو اچھا ہوا عذاب کٹا!

اب توقع کسے بھلائی کی — دل نہ ہوتا تو کچھ بھلا ہوتا!
کچھ اثر کا علاج کرتے ہم — رات کی رات گر جیا ہوتا

تصویر تیری آنکھوں میں آ کر پھرے ہے آہ — مذکور جب چلے ہے کسی کے جمال کا
اللہ جانے آن پھنسا کیونکہ دام میں — میں تو نہ تھا فریفتہ کچھ خط و خال کا

سب طرح کچھ گھلا ہی جاتا ہے — شمع کی طرح دل کو چور لگا
تیرے مکھڑے کو یوں تکے ہے دل — چاند کے جوں رہے چکور لگا

پہلے سو بار ادھر ادھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

بس رفع اب خیالِ مے و جام ہو گیا — ساقی بیک نگاہ مرا کام ہو گیا
بلبل کرے ہے نالہ و گل ہے جگر فگار — شاید کہ باغ میں وہ گل اندام ہو گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ — پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا
منت رہے گی حشر تلک تیری اے اجل — گو جی گیا پر ہم کو تو آرام ہو گیا

ردیف ب

دل ہے زندہ نہ جی ہی جیتا ہے — زندگی بدتر از ممات ہے اب
جیتے جی تو رہا وصال محال — مر چکے پر توقعات ہے اب
کچھ نہ پوچھو اثر کی بے چینی — نے سکونت ہے نے ثبات ہے اب

ردیف ن

نہ رہے دل میں بس کوئی خواہش　　آرزو اس سوا کچھ اور نہیں
ایک تیرے لئے ہیں ساری عمر　　سب کی باتیں ہزار ہا تو سہیں

جی میں ہے از سر نو جور ترے یاد کریں　　تو سُنے یا نہ سُنے نالہ و فریاد کریں
ہم اسیروں کی اسے چاہیئے خاطر داری　　اور الٹی نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں
تو اثر سے نہ ملے رشک چمن، اور ہم !　　صحبتیں بلبل و گل، قمری و شمشاد کریں

بیوفا تجھ سے کچھ گلا ہی نہیں　　تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس یا بتاں کے پاس　　دل کبھو اپنے ہاں رہا ہی نہیں

ہے مرا حال تو زباں زدِ خلق　　میں نہ مانوں تجھے خبر ہی نہیں
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے　　اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینے　　ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں
بیوفا کچھ تری نہیں تقصیر　　مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے　　پر اثر کی نہیں تو آس نہیں

منفعل تیغِ یار کے ہاتھوں　　مر گئے انتظار کے ہاتھوں

ایک عالم پڑا ہے گردش میں — گردشِ روزگار کے ہاتھوں
کام اپنا اثرؔ تمام ہوا — اس دلِ نابکار کے ہاتھوں

کر کے دل کو شکار آنکھوں میں — گھر کرے ہے تو یار آنکھوں میں
چشمِ بد دور! ہو نظر نہ کہیں — ہے نپٹ ہی بہار آنکھوں میں
کیا کہوں کچھ کہی نہیں جاتی — باتیں ہیں بےشمار آنکھوں میں
یار تیرے لئے یہ گوہرِ اشک — تھے برائے نثار آنکھوں میں
دیکھنا ٹک اثرؔ سے نظریں ملا — کیا ہوتے تھے قرار آنکھوں میں

ردیف و

جو سزا دیجے ہے بجا مجھ کو — تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو
وہی میں ہوں وہی اثرؔ دل ہے — اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ردیف ی

ہردم فزوں ہیں کج رویاں روزگار کی — کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی
مانا اثرؔ کہ وعدۂ فردا غلط نہیں — لیکن کٹے نہ آج یہ شب انتظار کی

ٹک آ کے سیر کر جگرِ داغدار کی — ہوتی ہے یہ بہار کہیں لالہ زار کی
ہم سے شکستہ بال اسیروں کے روبرو — ناحق خجستہ لا کے سناؤ بہار کی

دن انتظار کا تو کٹا جس طرح کٹا — لیکن کسو طرح نہ کٹی رات رہ گئی

کیا کروں آہ! اور کس کے حضور — نیند کس بات پر نہیں آتی
ہر دم آتی ہے گرچہ آہ پر آہ — پر کوئی کارگر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن — رات کٹتی نظر نہیں آتی
حالِ دل مثلِ شمع رکھتا ہوں — گو مجھے بات کر نہیں آتی
ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا — بات تجھ کو اثرؔ نہیں آتی

کس کس کا آج دیکھئے خانہ خراب ہو — بے طرح کچھ طرح ہے اب اس کی نگاہ کی
چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثرؔ — معلوم ہوں گے جو کبھی ان نے نگاہ کی

تیرے داغوں کی اے غمِ اُلفت — خوب ہم نے بھی باغبانی کی
اثرؔ اس حال پہ بھی جیتا ہے — کیا کہوں اس کی سخت جانی کی

نہ قصد اپنا کہ دل دیجے نہ قصد اس کا کہ جی لیجے — مصیبت کیا بیاں کیجے بلائے ناگہانی کی
حقیقت جب کھلی دل پر ہوا معلوم تب ہم کو — کدھر کا عشق وے باتیں ترنگیں تھیں جوانی کی

ردیف ے

دل جو یوں بیقرار اپنا ہے — اس میں کیا اختیار اپنا ہے
جو کسو کا کبھو نہ دوست ہوا — وہی قسمت سے یار اپنا ہے

اثرؔ کا حال بھلا ٹک تو کچھ سنا ہوتا — ابھی تو اس کی بہت داستان باقی ہے

نہ سنا تو نے۔ کیا کہیں ظالم — ورنہ ہم عرض حال رکھتے تھے
جوہرِ آب نین دکھلایا — سادہ رو جو کمال رکھتے تھے
آہ وہ دن کدھر گئے کہ ہم بھی اثر — دل کو اپنے سنبھال رکھتے تھے

اثر کیجیے کیا۔ کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے
کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی — تری کون سی بات پر جائیے
اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہے — پھر اس بے مروت کے گھر جائیے

ہاتھ سے اپنے بات جاتی ہے — باتوں ہی باتوں رات جاتی ہے

اثر اب تک فریب کھاتا ہے — تیری باتوں کو مان جاتا ہے
دل کڑا کر کے تجھ سے کچھ تو کہوں — جی میں سو بار یہ ہی آتا ہے
میں بھی ناصح اسے سمجھتا ہوں — گو بُرا ہے پہ مجھ کو بھاتا ہے
تیرے در پر میں کب آتا ہوں — دل مجھے بار بار لاتا ہے
کیا کروں آہ میں اثر کا علاج — اس گھڑی اس کا جی ہی جاتا ہے

جی میں اپنے جو ہے سو ہے پیار سے — فائدہ کیا تجھے جتانے سے
یار غصہ تری بلا کھاوے — کام نکلے جو مسکرانے سے

کسی کو مجھ سے نے مجھ کو کسو سے کام رہتا ہے — مرے دل میں سوا تیرے خدا کا نام رہتا ہے
کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے — اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے
کلیجہ پک گیا ہے کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے — ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام رہتا ہے

کب کب تری گلی میں ہم بیقرار آئے — سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے — دل تجھے اعتبار آتا ہے
دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا — دشمنی پر تو پیار آتا ہے
تیرے کوچہ میں بیقرار ترا — ہر گھڑی بار بار آتا ہے
زیر دیوار تو سُنے نہ سُنے — نام تیرا پکار آتا ہے
حال اپنے پہ مجھ کو آپ اثر — رحم بے اختیار آتا ہے

اتنا بتلا کہ غم غلط پیارے — کونسی تیری بات پر کیجے

آج ادھر کدھر کو بھول پڑے؟ — سچ کہو کیا یہ جی میں آئی ہے؟!

اب اثر ہمیں بہت نہیں باقی — آن کی آن ٹک رہو بیٹھے

دلدہی سب کی میری دل شکنی — بارے اتنا تو اعتماد رہے
نشۂ عشق سہج ہے پینا — لیکن اس کا سنبھال مشکل ہے

ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ ۱۷۸۷ء مطابق ۱۲۰۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں پرورش پائی۔ ان کے خاندانی حالات کا پتہ نہیں چل سکا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی دولت مند سوداگر نے ان کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ تعلیم و تربیت بھی اسی نے دی۔ البتہ عربی فارسی کی تعلیم علمائے فرنگی محل لکھنؤ نے دی۔ سپاہی وضع آدمی تھے۔ شاعری میں کسی کی شاگردی نہیں کی۔ مگر ۱۸۲۹ء تک شعراء میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور اکثر مرزا جعفر کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے تجارت بھی کرتے تھے۔ شیفتہ نے ناسخ کا کچھ مفصل حال لکھا ہے۔ ان کی وفات لکھنؤ میں ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔

دو دیوان اور ایک مثنوی ان کی یادگار ہیں۔

ردیف الف

اڑائے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا — ہمیں رکاب میں او شہسوار لیتا جا

دیا ہے سر جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے — گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جام سے — یہ میکدہ مقام نہیں ہے غرور کا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے — آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

ردیف م

عقل کھودی تھی اے ناصح جنون عشق نے — آشنا سمجھا کئے اک عمر بیگانے کو ہم

ردیف ن

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں — ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لئے پھرتے ہیں
تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت — ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

مجھ کو اب ساقیٔ گلفام سے کچھ کام نہیں — مے سے کچھ کام نہیں جام سے کچھ کام نہیں
دل میں خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پُر خار — اب کسی سرو و گل اندام سے کچھ کام نہیں
خانہ برباد ہوں صحرائی بگولوں کی طرح — سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں
طائر روح رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں — اب تو صیاد ترے دام سے کچھ کام نہیں
اتنی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا — مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

دورِ روز ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں — وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

ردیف ی

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی — ساقیا جلد آ ہوا بدلی

ردیف ے

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

ذوق

نام محمد ابراہیم ذوقؔ تخلص۔ دلی کے رہنے والے تھے وہیں ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۱۸۹ھ کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو ایک غریب سپاہی تھے۔ ابتدائی تعلیم غربت کی وجہ سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ لیکن خود ذوق نے کثرت کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنی فطری صلاحیتوں کو خوب جلا دی۔ شروع میں حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لی، بعد میں شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اکبر شاہ ثانی نے بڑی قدر کی اور خاقانیٔ ہند کا خطاب عطا کیا بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد رہے۔

غدر سے دو سال پہلے ۱۸۵۴ء کو انتقال کیا۔ "دیوانِ ذوق" ان کی یادگار ہے۔

ردیف الف

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارا کو گر مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشم بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

ردیف ر

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر

ردیف ن

جھکائے ہے سرِ تسلیم ماہِ نو ۔۔۔ پر وہ
غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں

ہاں متامّل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں
خلشِ خار کا کھٹکا ہے دلوں میں موجود
دیکھ گل! دعوئ نازک بدنی خوب نہیں

ردیف و

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

دیکھا دمِ نزع دلآرام کو
عید ہوئی ذوق و لے شام کو

ردیف ی

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ردیف ے

پھول تو دو دن بہار رجا نفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

آتش

خواجہ حیدر علی نام آتش تخلص ۔ کہتے ہیں کہ دلی کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۷۶۸ء میں آتش پیدا ہوئے۔ چونکہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے معقول تعلیم نہ ہو سکی۔ میدان شاعری میں انشا اور مصحفی کے معرکوں نے ان کو بھی شاعری کا شوق دلایا۔ ۲۹ سال کی عمر تک اردو شعر گوئی کی مشق کرتے رہے۔ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور بڑے بانکے طرز کے استاد کہلائے۔ شاعری میں ناسخ سے اکثر معرکے رہتے تھے۔

تمام عمر خودداری اور فقیرانہ منش کے ساتھ گذاری۔ آخر کار ۱۸۴۶ء بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ دیوان ان کا کئی مرتبہ مختلف مطابع سے چھپ چکا ہے۔

ردیف الف

جانے دے آتش اگر اہلِ جہاں تجھ سے پھریں
مرد پیچھا نہ کریں بھاگے ہوئے لشکر کا

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا
سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

اسیر ہونے کا اللہ رے شوق بلبل کو
جگایا نالوں سے صیاد کو جو خواب آیا

شبِ فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا
جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا

چکور حسنِ مہ چاردہ کو بھول گیا
مُراد پر جو ترا عالمِ شباب آیا

عدم میں ہستی سے جا کر یہی کہوں گا میں
ہزاروں حسرتِ زندہ کو گاڑ داب آیا

انساں کو چاہیئے کہ نہ ہو ناگوارِ طبع — سمجھے سبک اسے جو کسی پر گراں ہوا

آستانِ یار سے اٹھنے کا قصد آتش نہ کر — چھوڑ کر اس در کو سر دیوار سے ٹکرائے گا

فرو غصہ کیا جس نے پچھاڑا دیو کو اس نے — اُسے رستم کہیں گے ہم جو ایسا پہلواں ہوگا
قدم بھاری ہمارا ہوگا ہم پر باغِ عالم میں — وہ ٹہنی پھٹ پڑیگی جس پر اپنا آشیاں ہوگا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہوا ایسے سنبلستاں کا
خیالِ تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر — نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

فریب جس سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا — خدا کی یاد بھولا شیخ ۔ بت سے برہمن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک — نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش — لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

کئے ہیں شکر کے سجدے جفائے یار پر کیا کیا — رہا ہے دل مرا راضی رضائے یار پر کیا کیا

وعدہ خلاف یار سے کہیو پیامبر! — آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

کہے جاتے ۔ وہ سنتے یا نہ سنتے — زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا!

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا — وہ پہلو میں تھے اور خدا مہرباں تھا
مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی — سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی — زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
بیاں خواب کی طرح جو ہو رہا ہے — یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا — تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

سوزشِ دل سے زباں کو نہ ہوئی آگاہی — اُف کیا مونہہ سے نہ ہم نے نہ کھلا راز اپنا

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبر پر آتش نہ یار — دو ہی دن میں پاسِ الفت اس قدر جاتا رہا

سحر ہوئی تو ستاروں نے ساتھ چھوڑ دیا — نظر ملی تو نظاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
کھلے جو پھول بہاروں نے ساتھ چھوڑ دیا — شگفتگی کے اشاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
دعائیں مانگ کہ سیلاب بے نیاز نہ ہو — یہ مانتا ہوں کناروں نے ساتھ چھوڑ دیا
طبیعت اور الجھتی ہے بوئے گل سے مری — میں کیا کروں گا جو خاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
تری تلاش میں ایسی بھی منزلیں آئیں — کہ خاص خاص سہاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
مآلِ عشق کے خطروں میں مجھ کو پہنچا کر — تمام تجربہ کاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

وہی ہے جام وہی بزم ہے مگر آتشؔ — پرانے بادہ گساروں نے ساتھ چھوڑ دیا

ردیف ت

تار تارِ پیرہن میں بس رہی ہے بوئے دوست — مثلِ تصویرِ نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست
واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا — پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے موئے دوست
داغِ دل پر خیر گزرے تو غنیمت جانئے — دشمنِ جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست
دو مریں گے زخمِ کاری سے تو چتون سے ہزار — چار تلوار و نہیں شل ہو جائینگے بازوئے دوست
فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب — خشت زیرِ سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست
اُس بلائے جاں سے آتشؔ دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

ردیف ج

ہمنشیں کہتے ہیں ذکرِ عیش نصفِ عیش ہے — میں کہوں تُو سُن جمالِ یار کا افسانہ آج

ردیف م

رسائی جس کی نہیں اے صنم در دل تک — یقیں ہے اس کو ترا آستاں نہیں معلوم

ردیف ن

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو — نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں — حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں
وہ آب و رنگ کہاں روئے یار کا گل پر — ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں

کیا کہوں یار سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے — حضرتِ دل جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

خارِ مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں — بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں

دل میں خیالِ حسنِ محبوب روز و شب ہے — اترا ہوا ہے یوسف مہمان سرائے تن میں
دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دُنیا — بوئے شبِ عروسی مہماں ہے پیرہن میں
صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی — سا کھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں

خدا محفوظ رکھے دل کو ان زلفوں کے سودے سے — گرفتارِ بلا یہ سلسلے آزاد کرتے ہیں
خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو — طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں
قدم رہتا ہے ثابت جن کا اس سختیٔ دوراں میں — بہادر ہیں وہی سر قلعۂ فولاد کرتے ہیں
کوئی ذرہ تو اس کا تا بہ دامن اڑ کے پہنچے گا — یہ مشتِ خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں
عجب نعمت عطا کی ہے خدا نے اہلِ غیرت کو — عجب یہ لوگ ہیں غم کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں

فقر کے کوچے میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں — ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے ٹھکرا کے

سرخ پوشاک پہنتا ہے تو کہتا ہے وہ ترک — آنکھ مریخ لڑاوے تو لڑاتا ہوں میں

آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹ اے خیالِ یار — تجھ سے عزیز کوئی دمِ واپسیں نہیں

صبح نزدیک ہے بیدار ہو۔ مل لے غافل — زہرہ و مشتری و ماہ و سہا جاتے ہیں
رنج یاں جن کو ہے آتش انھیں واں راحت ہے — اے خوشا حال جو دنیا سے خفا جاتے ہیں

آتی ہے باغ سے جو صبا پوچھتا ہوں میں — کتنے شگوفے آئے ہیں کس کس نہال میں؟

ردیف و

تصور لالہ و گل کا رہا کرتا ہے آنکھوں میں — قفس میں بھی سلام شوق کر لیتے ہیں گلشن کو

نسیم نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں — تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ
ملیں وہ راہ میں ابھی تو کہتا ہوں جو ہو سو ہو — دکھا دو گھر مجھے اپنا مرا گھر دیکھتے جاؤ
نہ پھیرو اس سے موہنہ آتش جو کچھ درپیش آجائے — دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدر دیکھتے جاؤ

ردیف ہ

تنگدستی نے زمانے میں یہ پایا ہے رواج — یوسف اس عہد میں تکتا ہے خریدار کی راہ
غیر حق کو میں سمجھتا ہوں خیال باطل — آتش اک دل میں نہیں ہوتی ہے دو چار کی راہ

ردیف ی

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری — خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری
یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں — سُنا ہے جا ہے قریب رگ گلو تیری
شب فراق میں اک دن نہیں قرار آیا — خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری
دماغ اپنا بھی اے گلبدن معطر ہے — صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری
پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں ختم ہے قرآں کی — جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے   نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری
کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن   فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بہ کو تیری

باغِ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک   عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

بو پار کی سنگھا کے صبا نے اُڑائے ہوش   بادِ مراد نے مری کشتی تباہ کی

ردیف ے

کب تک وہ زلف دیتی ہے آزار دیکھئے   کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تار دیکھئے!

ناگوار کو جو کرتا ہے گوارا انساں   سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل   بادشاہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

کوئی زمانے سے جاتا ہے کوئی ہے آتا   کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے   دو روزہ عمر کو انساں نہ رائیگاں رکھے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے   ہم اور بلبلِ ناشاد گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا   زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم   اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

یاد آئی بوئے پیرہنِ یار باغ میں
پھروں ہی بد دماغ رہے ہم شمیم سے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
تکلف سے بَری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

شیشے شراب کے رہیں آٹھوں پہر کھُلے
ایسا گھِرے کہ پھر نہ کبھی ابرِ تر کھُلے
رنگریز کی دکاں میں بھرے ہوں ہزار رنگ
طرہ وہ ہے جو یار کی دستار پر کھُلے
کوتہ ہے اس قدر مرے تن پر ردائے عیش
ڈھانکوں جو پاؤں تو یقیں ہے کہ سر کھُلے
فصلِ بہار آئی ہے چلتا ہے دورِ جام
مغ کی دکان شام کھلے یا سحر کھُلے
چلنا پڑے گا یار کی خدمت میں سر کے بل
سمجھے ہو کیا جو بیٹھے ہو آتش کمر کھُلے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشے میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کئے ناتواں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
تری کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوشرو جواں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے
مشتاقِ مددِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے — خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے — بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

شباب تک نہیں پہنچا ہے عالمِ طفلی — ہنوز حسنِ جوانیٔ یار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے — فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی — بہت سا گرد بہت سا غبار راہ میں ہے

پتہ یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد — بجائے سنگِ نشاں اک مزار راہ میں ہے

چلا ہے تیر و کماں لے کے صیدگاہ وہ ترک — خوشا نصیب وہ جو جو شکار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتشؔ — گلِ مراد ہے منزل پہ خار راہ میں ہے

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے — اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں کے نہ تھے — زمیں سے دب گئے۔ دبتے جو آسماں سے نہ تھے

مُرغِ دل کو ہدفِ ناوکِ مژگاں کرتے — کسی ابرو کی کماں پر اسے قرباں کرتے

تری ابروئے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے — کسی استاد شاعر کا یہ شعرِ عاشقانہ ہے

کفن دزدوں میں قبرِ اہلِ دولت کا فسانہ ہے — تمامی کی ہے چادر بادلے کا شامیانہ ہے

پھر آتا ہے عبث واعظ سر اپنا بک کے رندوں سے — تکلف برطرف یاں لااُبالی کارخانہ ہے

عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
کہاں سے ہم کہاں بگڑے ہوئے بیکار میں آئے

یقیں ہے کچھ نہ کچھ رحمت مزاجِ یار میں آئے
ادب سے ہاتھ باندھے ہم ترے دربار میں آئے

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

عدم کے جانیوالو بزمِ جاناں تک اگر پہنچو
ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر جو دربار میں آئے

نہ مانگو بوسہ اسے آتش بگاڑے مونہہ وہ بیٹھے ہیں
قیامت ہے اگر بل ابروئے خمدار میں آئے

گیسوئے شکیں رخِ محبوب تک آنے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے

فصلِ شراب آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلےٰ اٹھائیے

مومن

نام مومن علی یا مومن خاں تخلص مومن۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں بمقام دلّی پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی تھا۔ دادا حکیم نامدار خاں شاہ عالم کے زمانے میں کشمیر سے دلّی آئے۔ اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے۔ مومن کی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی کے زیر اثر بھی ہوئی۔ اسی وجہ سے باپ اور دادا کا علم طب اور حکمت حاصل کرنے کے علاوہ علم نجوم میں بھی بہت مہارت حاصل کی۔ شطرنج خوب کھیلتے تھے اور بڑے شوقین مزاج تھے۔ عطر کا استعمال اس حد تک ہوتا تھا کہ جس راستے گزر جاتے تھے گلیاں مہک جاتی

تھیں ۔

صاحب جی امۃ الفاطمہ ایک شاعرہ تھیں ان سے مومن کو عشق ہو گیا جس کے بعد بڑے رنگین اور معرکہ آرا اشعار مومن نے کہے۔

مومن نے سنہ ۱۸۵۱ء مطابق سنہ ۱۲۶۸ھ بمقام دلی انتقال کیا۔ تصنیفات میں کلیاتِ اُردو۔ دیوانِ فارسی اور انشائے فارسی یادگار ہیں۔

ردیف الف

کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن — کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

نہ مانوں گا نصیحت ۔ پر نہ میں سنتا تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
بت کدہ جنت ہے ۔ چلیئے بے ہراس — لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومنؔ　　صنم آخر خدا نہیں ہوتا

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں　　جیسے کچھ اختیار ہے اپنا

ردیف م

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم　　پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم　　مونہہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

ردیف ن

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی　　ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں

پہنچے ہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع　　مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں؟

یقین ہوتا ہے برگشتگیٔ قسمت کا　　پھری ہوئی جو تمھاری نگاہ دیکھتے ہیں

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا　　اپنا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ردیف و

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر　　مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں　　وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی　　کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم　　گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا ۔ سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا ۔ میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ردیف ھ

الٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ ۔ بےطاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی ۔ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ردیف ی

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی ۔ خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی
پھر ابکی لاتے قربان جاؤں جذبۂ دل ۔ گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی ۔ چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں ۔ یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
وصالِ یار سے دانا ہوا عشق ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
پلایا زہرِ الفت او مسیحا ۔ مریضِ عشق کی اچھی دوا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ۔ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ردیف ے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے ۔ نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے
منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے
ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا — اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے
تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے
عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

صبرِ وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل — نامہ بر راہبر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
اے قیامت! نہ آئیو جب تک — وہ مری گور پر نہ ہو جائے
مومن! ایماں قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

مومن اور دیر خدا خیر کرے — طور بےڈھب نظر آتے ہیں مجھے

مزا یہ شکوے میں آیا کہ بے مزا ہوئے وہ — ہیں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لئے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر آج — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یہ دعا دے کے دربار سے ہم رات چلے — خانہ آباد کہ مشتاقِ ملاقات چلے
عشق میں بھی تو نہ جاگے کبھی ۔ تم کیا جانو — کہ شبِ غم کوئی کس طرح بسر کرتا ہے

★

وزیر لکھنوی (سالِ پیدائش سنہ ۱۷۹۵ء)

نام خواجہ محمد وزیر۔ تخلص وزیر۔ لکھنؤ ان کا وطن تھا۔ وہیں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۲۔ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ دیوان ان کا مرنے کے بعد چھپا۔

ردیف الف

سر مرا کاٹ کے پچھتایئے گا — جھوٹی پھر کس کی قسم کھایئے گا؟
کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے — ادھر اے دستِ جنوں آیئے گا
آپ کہتے ہیں کہ جاتا ہوں — پر اکیلے بھی تو گھبرایئے گا
تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے — ابھی پہلو سے نہ اٹھ جایئے گا

یار پیشانی و ابرو پہ جو سینے گا افشاں — آج محرابِ عبادت میں چراغاں ہو گا
بزمِ صنم میں رات تھا چرچا شراب کا — روشن ہوا تھا شب کو چراغ آفتاب کا

ردیف د

وصل میں رفتارِ معشوقانہ دکھلاتی ہے نیند — آج کن اٹھکیلیوں سے آنکھوں میں آتی ہے نیند

دکھایا پھول سا رُخ کس نے اور سرو سا قد ۔۔۔ کہ نالے بلبلیں کرتی ہیں قُمریاں فریاد
زباں پہ آتے ہی اب بے صدا ہے رنگ نفس ۔۔۔ ہوئی ہے برسوں میں اپنی مزاجداں فریاد

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر ۔۔۔ زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے ۔۔۔ اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر
کیا قتل اس نے غیروں کو ہوئے ہم رشک کے مارے ۔۔۔ اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر
ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو ۔۔۔ ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

ردیف ن

نہ کر عوض مرے جرم و گناہِ بے حد کا ۔۔۔ الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں، کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج ۔۔۔ یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

صباؔ لکھنوی (سال پیدائش ۱۷۹۳ء)

نام میر وزیر علی تخلص صباؔ۔ وطن لکھنؤ۔ پیدا بھی لکھنؤ میں ہوئے۔ آتشؔ کی شاگردی کی۔ ۱۸۵۵ء میں گھوڑے سے گرے اسی میں انتقال ہوا۔ ان کا دیوان "غنچۂ آرزو" کے نام سے مشہور ہے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔۔۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا
ایسی ہوا چلی مری آہوں کی زات کو سب آسماں پہ خرمنِ انجم بکھر گیا
اچھا ہؤا جو ہو گئے وحدت پرست ہم فتنہ گیا۔ فساد گیا۔ شور و شر گیا
کعبہ کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا
پھر سیرِ لالہ زار کو ہم اے صبا چلے آئی بہار داغِ جنوں پھر ابھر گیا

ردیف ب

جورِ گلچیں عشقِ گل خوفِ خزاں ایذائے خار لاکھ آفت میں پھنسی ہے ایک جانِ عندلیب

ردیف ے

تری طرف سے دل اے جانِ جاں اٹھا نہ سکے بہت ضعیف تھے بارِ گراں اٹھا نہ سکے
ہزار بار بہار آئی لیکن اے صیاد نگاہ ہم طرفِ بوستاں اٹھا نہ سکے
اسیرِ زلف جو مرتے ہیں اب وہ کہتے ہیں ذرا بھی صدمۂ قید گراں اٹھا نہ سکے
سنیں جو یار کی باتیں غش آگیا ہم کو یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اٹھا نہ سکے

بہادر شاہ ظفر

نام ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تخلص ظفر۔ آخری تاجدار مغلیہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم کے پوتے تھے۔ ۲۶ شعبان المعظم ۱۷۷۵ء کو غروب آفتاب کے وقت پیدا ہوئے۔ ۶۲ سال کی عمر میں ۱۱ جمادی الثانی کو میر احمد علی امام جامع مسجد دہلی کے ہاتھ تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا۔

شہزادگی کے زمانے میں شاعری اور خطاطی کا خاص شوق ہوا۔ پہلے ذوق سے مشورہ لیتے تھے پھر غالب کے شاگرد ہو گئے۔ غدر میں باغیوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے جس کا مفصل حال ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" اور پرسی ویل اسپیر کی "Twilight of Delhi" میں موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان پر مقدمہ چلا اور رنگون میں نظر بند کر دیئے گئے۔ جہاں گمنامی کی حالت میں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔

ان کی تصانیف "کلیات ظفر"، جس میں غدر سے پہلے کا کلام ہے چار جلدوں میں نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا مگر اب مشکل سے ملتا ہے۔ "دیوانِ ظفر" وغیرہ ہیں۔

ردیف الف

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے ‏ کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو ‏ عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے ‏ کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ‏ ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا   کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق   کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ   رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ
نبھے کیونکر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ   وہ بے پروا میں سودائی وہ سنگیں دل میں دیوانہ
گزر یارب گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا   کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ
مجھے آنا ملے کیونکر تری محفل میں جانانہ   مری صورت فقیرانہ ترا دربار شاہانہ

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی   جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار   بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا   اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
میں نے دل دیا میں نے جان دی مگر آہ تو نے نہ قدر کی   کسی بات کو جو کبھی کہا اسے چٹکیوں میں اڑا دیا

تم نظر آجاؤ شاید اس ہوس میں آج ہم   صبح سے تا شام سوئے رہگذر دیکھا کئے

یار تھا گلزار تھا بادِ صبا تھی میں نہ تھا   لائقِ پابوسِ جاناں کیا حنا تھی میں نہ تھا

مرزا غالب

نام اسد اللہ خاں۔ تخلص اسدؔ اور غالبؔ۔ لقب مرزا نوشہ۔ خطاب نجم الدولہ۔ دبیر الملک اور نظام جنگ۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ ترک نسل سے تھے اور کسی طرح سلسلۂ نسب تور بن فریدوں شاہِ ایران تک پہنچا ہے مگر پھر بھی اصلیت کا صحیح پتہ نہیں ہے ۱۷۹۶ء مطابق ۱۲۱۱ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ ہی میں مشہور استادوں سے ہوئی۔ باپ کی وفات کے بعد چچا نصر اللہ بیگ کے زیر سایہ رہے۔ لیکن وہ بھی جلد ہی ۱۸۰۶ء میں فوت ہو گئے۔ تاہم آگرہ ہی میں پروان چڑھے اور مولوی محمد معظم سے کسب سعادت کیا۔ عمر کا زیادہ حصہ یوں گزرا کہ ہر قسم کی پریشانیوں کا شکار رہے۔ ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲۔ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ بروز دوشنبہ دوپہر ڈھلتے انتقال کیا۔ ان کے خطوط اور کلام کون نہیں جانتا۔

ردیف الف

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا | اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
موہنہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں | زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے موہنہ پر کھلا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا | زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک | ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید۔ اچھا۔ یوں سہی | یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا۔ برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا۔ گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی　　در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا۔ یعنی　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال　　دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی　　کیوں ترا راہگذر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ　　اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں　　کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ردیف د

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا — نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

ردیف ر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا — یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

جلتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ردیف ز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے — ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو — ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

ردیف س

مژدہ اے شوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں افسوس — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

ردیف ک

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ردیف گ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ردیف ن

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شوقِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — اور عناصر میں اعتدال کہاں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ — ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب | یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا | یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے | دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں | طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے | کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں۔ بزم میں وہ بلائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

جن ارمانوں کی حسرت جانفزا تھی　　اب ان کو روح فرسا دیکھتا ہوں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اسقدر آباد نہیں
وائے مظلومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا　　جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب　　تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے باگ پر ہے ہاتھ نہ پا ہے رکاب میں

ردیف و

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو　　نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں　　سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے اے غالب　　ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

دے مجھ کو تڑپنے کی اجازت کہ ستمگر کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاشکہ تم مرے لئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ کوئی دن اور گر جیئے ہوتے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نکتہ چیں ہے غمِ دل کو اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند　　کس کی حاجت روا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزمائے عمر　　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ردیف ے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ　　مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں　　مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا　　رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ　　ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار / رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے / رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے / اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق / وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی / فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب / رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے / حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل / میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم / میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا / تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے / ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں / سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں / پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر / کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام / ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے
پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

پُر ہوں یوں شکوے سے میں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہئے — جس میں ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ردیف ی

ہم ہی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں — وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں یاد کر کے اپنی شرما جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو — ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی — اسے یوسفؑ کے بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے
باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی — جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں نام حسرتی اور شیفتہ تخلص۔ عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں بمقام دلی پیدا ہوئے۔ شاعری میں مومن کے شاگرد ہوئے۔ حج بھی کیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

ان کی تصنیفات میں "گلشنِ بے خار" فارسی زبان میں شعرائے اردو کا تذکرہ۔ فارسی اور اردو کے دو دیوان ہیں۔ مگر ان میں سے سب ہی آجکل نایاب ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شاید کچھ نشانات مل جائیں۔ ورنہ یوں کہیں سے ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ دو چار

اِدھر اُدھر سے سنے سنائے جو مل گئے وہی لکھ دیئے۔

ردیف الف

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر؟ کیا کوئی اور ستم یاد آیا؟

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی تھام لینا وہ تری محمل کا!

ردیف ن

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی! لے گئیں مجھے یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ردیف ی

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایک حالت پر نہیں رہتا کوئی اب وفا ہو بیوفائی ہو چکی!

ردیف ے

کیا پوچھتے ہو لطف کروں تجھ پہ کس قدر؟ اذنِ غرور و نازِ تمہیں جس قدر ملے

ایامِ مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

ضد تو دیکھو تشنہ کام شوق مجھ کو جان کر | قتل کرتا ہے ستمگر خنجر بے آب سے

دیا شنکر نسیم

نام دیا شنکر تخلص نسیم ۔ ذات کشمیری پنڈت ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۷ھ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے والد ان کے پنڈت گنگا پرشاد کول تھے۔ نسیم ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اردو فارسی کی تعلیم بھی اچھی خاصی پائی تھی۔ بڑھ کر آتش کے شاگرد ہو گئے۔ اس زمانے میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" لکھنؤ میں بڑی جگہ پائے ہوئی تھی۔ ہر جگہ اسی کے چرچے تھے۔ نسیم کو بھی یہ طرز ایسا پسند آیا کہ ۱۸۶۸ء میں (میر حسن کے پچاس سال بعد) "مثنوی گلزار نسیم"، نظم کی۔ اور بھی بہت سی مثنویاں اردو زبان میں نظم کیں مگر گلزار نسیم والی مقبولیت نسیم کی دوسری مثنویوں کو نہیں ہوئی۔ نسیم ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۶۰ھ میں بمقام لکھنؤ عین عالم شباب میں انتقال کیا۔

از مثنوی گلزار نسیم

شہزادی بکاؤلی کا پھول اس کے باغ سے چوری جاتا ہے اس پر بکاؤلی کی پریشانی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل | جھنجلائی کہ کون دے گیا جل!
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟

ہاتھ اس پر اگر پڑا نہیں ہے　　بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل　　سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا　　شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون　　بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا　　اوپر کا تھا کون آنے والا
بولی وہ بکاولی کہ افسوس　　غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں　　اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا　　غنچے کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل　　مُشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا　　خوشبو ہی سُنگھا پتہ نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے　　گل تو ہی مہک۔ بتا کدھر ہے

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا　　جو برگ تھا، ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا لگا غرض بدلنے　　گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی　　دست آویز اس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی۔ نام کی نشانی　　انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا، کیا کہ ہیہات　　خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

گھر بار سے کیا فقیر کو کام　　کیا لیجے چھوڑے گاؤں کا نام

تاج الملوک گلچیں کو شہزادی بکاؤلی کے سامنے پکڑ کر لایا جاتا ہے

آیا تو وہ منتظر تھی خونخوار اندیشے سے کانپ اٹھا گنہ گار
واں غصہ بھری غضب وہ چتون پلکوں سے یہاں نظر پہ چلمن
واں سرمۂ چشم گرم تسخیر یاں قطرۂ اشک تر گلوگیر
دل پھانسنے کو بلا وہ گیسو یاں تابِ سخن نہیں سرِ مُو
بولی وہ پری بصد تامّل کیوں جی بھتیں لے گئے تھے وہ گل؟
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے ہے کونسا گل؟ چمن کدھر ہے؟
دی اس نے دعا کہا بصد سوز فرخ ہوں شہا میں ابنِ فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

ایک روز شہزادی بکاؤلی کی ہاں جمیلہ پری آ جاتی ہے اور تاج الملوک اور بکاؤلی کو ایک ساتھ دیکھتی ہے

آکر جو ہے دیکھتی جمیلہ روشن تھے چراغ اور فتیلہ
وہ شعلۂ آتشیں لپک کر بجلی سی گری چمک دمک کر
دونوں کی رہی نہ جان تن میں کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
شہزادہ پہ اس نے مار چنگال دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ جھلّا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تو نے لٹوائی بہارِ باغ تو نے

شہزادی بکاؤلی قید میں ہے دوسری پریاں اس کو سمجھاتی ہیں مگر محبت کی دیوانی سمجھتی نہیں ہے

سمجھانے سے تھا نہیں سروکار — اب مان نہ مان تو ہے مختار
غم - راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے — دکھ - بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے
سوجھی وہ کہ یہ نہیں سمجھتی — ہے بلکہ برنگِ زلف اُلجھتی
بیماریٔ عشق لا دوا ہے — اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

ایک روز راجہ اندر محل رقص و سرود میں بکاؤلی کو پوچھتا ہے

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے — شہزادی بکاؤلی کدھر ہے؟
مونہہ پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک — ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

شہزادی بکاؤلی راجہ اندر کے دربار میں ناچنے کے لئے آتی ہے، ساتھ ہی چپکے سے تاج الملوک بھی تخت کے ایک پائے میں چپک کے دربار میں پہنچ جاتا ہے

محفل میں جو آئی شمعِ محفل — پروانوں کے ہاتھ سے گیا دل
جو گاتی تھی میٹھی مثلِ آواز — مجرے کو اٹھی وہ صورتِ ناز

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی　　خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی
رقص اس کا اگرچہ خوشنما تھا　　سنگت کا بھی کا وجی ٹھکا تھا
شہزادہ نے دیکھ دائیں بائیں　　لیں طبلہ نواز کی بلائیں
آہستہ کہا "کہو تو آؤں　　فرماؤ تو بندگی بجاؤں؟"
اس نے جو پکھاوج اس کو دیدی　　کیفیت اتفاق نے دی
تھا سم پہ یہ اس پری کا نقشہ　　سب آنکھ ملا کے کہتے تھے آ
محظوظ کیا جو سب کو اک بار　　بخشا راجہ نے نولکھا ہار
انداز سے لیکے اس نے مالا　　کاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا
لے ہار وہ شاہزادہ فی الفور　　پنہاں ہوا زیر تخت اسی طور
بادِ سحری چلی جو سن سے　　وہ شمع سدھاری انجمن سے
خورشید سے پہلے اٹھ کر آئی　　تاروں کی چھاؤں میں گھر آئی

انتخاب از غزلیات

روحِ رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں　　جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا
گزرا جہاں سے میں تو کہا سن کے یار نے　　قصہ گیا۔ فساد گیا۔ دردِ سر گیا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ　　بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

ردیف ر

بل پڑنے لگا ابروئے خمدار کے اوپر	آجائے نہ آفت کہیں دو چار کے اوپر

منزل سے دور رکھتا ہی خوابِ سحر نسیم	کھول آنکھ۔ دیکھ باندھ چلے ہمسفر کمر

ردیف ی

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی	کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے	بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا	شاخِ گل اک روز جھونکا کھائے گی

ردیف ے

گل ہوا کوئی چراغِ سحری او بلبل	ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہے

کیوں خفا رشکِ حور ہوتا ہے	آدمی سے قصور ہوتا ہے
خاکِ عاشق سے جو درخت اُگا	طور ہوتا ہے، نور ہوتا ہے

فراق دیدہ ہوں میں وصلِ یار باقی ہے	خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے
بتوں کے قہر سے رحم کو مقام یاس نہیں	امیدِ رحمتِ پروردگار باقی ہے

اب تو جاتے ہیں اس گلی میں نسیم	ہو رہے گا جو کچھ مقدر ہے

لائے اس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

منت دلا کسی کی نہ احسان اٹھائیے   مر جائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے   جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے   جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے

امیر مینائی

نام منشی امیر احمد مینائی۔ امیر تخلص۔ چونکہ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تھے اس لئے مینائی کہلائے۔ وطن خاص لکھنؤ تھا۔ وہیں ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۴ھ ۱۶ شعبان کو نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ مولوی کرم احمد مینائی کے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا مفتی سعداللہ وغیرہ سے حاصل ہوئی۔ نجوم اور جفر میں دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں امیر لکھنوی سے اصلاح لی جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں واجد علی شاہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ غدر کے بعد نواب فردوس مکاں نے رام پور بلا لیا۔ جہاں وہ عدالت دیوانی میں مفتی ہو گئے۔ اور خلد آشیاں کے شاعری میں استاد ہوئے۔ ۱۹۔ جمادی الآخر ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو حیدرآباد دکن میں انتقال ہوا۔

امیر مینائی کے دو دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" ہیں اور مجموعۂ واسوخت "گوہر انتخاب" اور مضامین "دل آشوب" کے نام سے چھپے ہیں۔ ایک دیوان غدر کے زمانے میں غائب ہو گیا۔

ردیف الف

چودھویں کا بھی چاند صدقے تھا　　ہائے عالم تری جوانی کا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا　　کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا
دنیا میں پریزاد دیئے خلد میں حوریں　　بندوں سے وہ اپنے کبھی غافل نہیں ہوتا
تم کو تو میں کہتا نہیں کچھ حضرتِ ناصح　　پر جس کو ہو یک ایسی وہ غافل نہیں ہوتا

بولے وہ سینے پہ رکھ کے میرے ہاتھ　　کہئے اب تو اضطراب دل گیا؟
تیغِ قاتل ہے اسے بادِ بہار　　جب چلی وہ غنچۂ دل کھل گیا
کوچۂ گیسو نہ ہاتھ آیا مجھے　　کالے کوسوں سیکڑوں منزل گیا
مرحلے طے کنجِ عزلت میں کئے　　بیٹھے بیٹھے سیکڑوں منزل گیا
برہمن کو بت مجھے تو اے صنم　　جس نے جو مانگا خدا سے مل گیا
اٹھ کے جا بیٹھا جو اُن کے پاس میں　　بولے کچھ مل بیٹھنے سے مل گیا
مسکرانے میں کھلا کیا وہ دہن　　غنچۂ تصویر گویا کھل گیا
آئی جب صحرا میں خوش چشموں کی یاد　　سامنے نرگس کا تختہ کھل گیا

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا — سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا
سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی — وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولا جاتا رہا
جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا — تم گلے سے مل گئے سارا گلا جاتا رہا
آنکھ کیا ہے موہنی ہے سحر ہے اعجاز ہے — اک نگاہِ لطف میں سارا گلا جاتا رہا

آہوں سے سوزِ عشق مٹایا نہ جائے گا — آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
کبھی کاجل کبھی آنکھوں میں لگایا سرمہ — رات تھا کونسا جادو کہ جگایا نہ گیا

کرتا نہیں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع — جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا

جھونکا ادھر نہ آئے نسیمِ بہار کا — نازک بہت ہے پھول چراغِ مزار کا
شاخوں سے برگِ گل نہیں جھڑتے ہیں باغ میں — زیور اتر رہا ہے عروسِ بہار کا
ہلتی ہیں ہوا سے چمن میں یہ ڈالیاں — منہ چومتے ہیں پھول عروسِ بہار کا

رات اپنی ہے ٹھہریئے تو زرا — آئیے بیٹھیے ؛ گھر جائیے گا !

حریمِ کوچۂ قاتل کی راہ گر لینا — سمندِ عمر سے او شہسوار اتر لینا
امیر جاتے ہو بت خانہ کی زیارت کو — پڑے گا راہ میں کعبہ سلام کر لینا

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا　　درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا
کہتے ہیں کیا میں کروں سُن کے فسانہ دل کا　　وہی جھگڑا وہی دکھڑا ہے پرانا دل کا
آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا　　آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا
پھیر کر منہ مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں　　رُخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانا دل کا

کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے　　ہائے اس وقت مرا گیسوؤں والا ہوتا

عمرِ برق وشرار ہے دُنیا　　کتنی بے اعتبار ہے دُنیا

اُٹھو گلے سے لگا لو مٹے گلہ دل کا　　ذرا سی بات میں ہو تم ہے فیصلہ دل کا
خدا ہی ہے جو کڑی چتونوں سے جان بچے　　ہے آج دلشکنوں سے مقابلہ دل کا
بدل کے یار نے چتون مٹا دیئے جھگڑے　　نہیں رہا نہ رہا دل نہ وہ گلہ دل کا

فلک ہم تو تیرا ابھی شکوہ نہ کرتے　　مگر تجھ کو ڈھب ہی نہ آیا جفا کا

دلبری سے کام ہے ہم کو دلآزاری سے کیا　　یار کی یاری سے مطلب اس کی عیاری سے کیا

باڑھ رکھی ہے اس نے خنجر پر　　ہائے اس وقت مجھ میں دم نہ ہوا
قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیونکر　　جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

ردیف د

بلبل نثارِ گل ہے پروانہ شمع پر ذرّے کو مہر ہم کو ہے وہ ماہرو پسند
سب آفتوں سے چھوٹ گیا کرکے ترکِ حرص کیونکر نہ ہو مجھے دلِ بے آرزو پسند

ردیف ر

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کونسی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
اپنی گردش پہ بہت ہے تجھے اے چرخ گھمنڈ جب میں جانوں کہ شبِ غم کی سحر پیدا کر

حیا آتی ہے کیا منزل پہ جاؤں کہ کانٹے روکتے ہیں پاؤں پڑ کر

ردیف ض

مکان سے ہے نہ کچھ ہم کو لامکاں سے غرض جہاں حضور ملیں ہم کو ہے وہاں سے غرض
حرم سے کام نہ مطلب ہے دیر سے ہم کو سرِ نیاز کو ہے تیرے آستاں سے غرض

ردیف ل

واہ کیا خوب پر و بال نکالے بلبل اڑتے ہی پڑ گئی صیاد کے پالے بلبل
باغباں رحم سے واقف نہیں گلچیں بیدرد ایک ہم ہی ترے پہچاننے والے بلبل
اک دن آئیگی خزاں دو دن کی کیسی یہ امیر چار دن باغ میں بے پر کی اڑالے بلبل

عبادت کا اگر ہے شوق یہ بھی شرط ہے زاہد جبیں سجدے کے لائق ہو زباں تکبیر کے قابل

پھولوں سے بھرا ہوا ہے گلشن   خالی ہے امیر جائے بلبل

ردیف ن

ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں   اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں

چوٹ کھانا دل حزیں کہیں نہ کہیں   درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں
مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے   آج بجلی گری کہیں نہ کہیں
نہ تڑپ اس قدر دل بیتاب   سہم جائے وہ نازنیں کہیں نہ کہیں

ہو گئی کچھ اور آ کر خانۂ صیاد میں   یہ مزہ آگے نہ تھا بلبل تری فریاد میں

غمزے کا بانکپن صف مژگاں میں دیکھئے   کس نوک کا جوان ہے یہ اس سپاہ میں

عدم کے جانے والے راستے میں کب ٹھہرتے ہیں   جہاں یہ نکلے گھر سے جا کے منزل پر اترتے ہیں
مرا خط پھینک کر قاصد کے منہ پر طنز سے بولے   خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں

بہت سنبل چمن میں آج پیچ و تاب کھاتا ہے   کسی محبوب کے شاید کہیں گیسو سنورتے ہیں

باعث تڑپ کا شوخ ستمگر سے کیا کہیں   دل تو ہی کچھ بتا دے کہ دلبر سے کیا کہیں

چلا ہے دلہن بن کے کیا تیغ قاتل　　عروسِ اجل کے یہ چالے ہوئے ہیں

وہ گلعذار کہ ٹہلتے تھے روز پھولوں میں　　انھیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں

یار کے اٹھتے ہی برہم ہوگیا سامانِ عیش　　مے کہیں مینا کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں!

اپنی محفل سے اٹھاتے ہیں عبث ہم کو حضور　　چپکے بیٹھے ہیں الگ آپ کا کیا لیتے ہیں
بت بھی کیا چیز ہیں اللہ سلامت رکھے　　گالیاں دیکے غریبوں کی دعا لیتے ہیں

ردیف و

غیر سے آنکھیں چار کرتے ہو　　جاؤ بھی کس کو پیار کرتے ہو
بن کے انجان مجھ سے کہتے ہیں　　سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو؟

کچھ تسلی دلِ زار کو کرتے جاؤ　　تم نہ آؤ مگر اقرار تو کرتے جاؤ

سوزِ دل چہرے سے عیاں ہے مہر　　پیار کس شمع رو کو کرتے ہو

صورت بھی پیاری پیاری ہے باتیں بھی خوب ہیں　　پھر بھی یہ ڈر لگا ہے کہ بیداد گر نہ ہو

ردیف ی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ　　آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

جاں بلب حسرت میں پاتی ہے جو مجھ ناشاد کو ۔۔۔ کیا ہنسی پھرتی ہے ان ہونٹوں پہ اترائی ہوئی
گھم رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی ۔۔۔ ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی
ٹھوکریں کھلوائے گی یہ چال اٹھلائی ہوئی ۔۔۔ کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اترائی ہوئی
وصل کی شب واہ ری بیتابیٔ شوقِ وصال ۔۔۔ شرم بھی نیچی نگاہوں سے تماشائی ہوئی
غمزہ و ناز و ادا سب میں حیا کا ہے لگاؤ ۔۔۔ ہائے رے بچپن کہ شوخی بھی ہے شرمائی ہوئی
وصل میں خالی ہوئی اغیار سے محفل تو کیا ۔۔۔ شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی
میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے ۔۔۔ جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

نظر بھر کے دیکھا یہ کس مست نے ۔۔۔ کہ سرشار محفل کی محفل ہوئی

تجھ سے اے بادِ صبا مجھ کو یہ امید نہ تھی ۔۔۔ چار پھولوں کو ترس جائیگی تربت میری
مل گئیں ہم سے نگاہیں یار کی ۔۔۔ ہو گئیں آپس میں باتیں پیار کی
دل میں رہیے خواہ آنکھوں میں حضور ۔۔۔ جلوہ گاہیں دونوں ہیں سرکار کی

ادا اس کی کیا کیا ستم ڈھا گئی ۔۔۔ قضا کے گلے مجھ کو سلوا گئی
صدا خاکِ لیلیٰ سے آئی کہ قیس ۔۔۔ مجھے تیری دیوانگی کھا گئی
مرے عشق کی وجہ ناصح نہ پوچھ ۔۔۔ طبیعت ہی تو ہے ادھر آ گئی
صبا کو یہ کیا موج آج آ گئی ۔۔۔ کہ پھولوں سے تربت مری چھا گئی
نئے رنگ کے کھل گئے گل (امیر) ۔۔۔ طبیعت جہاں رنگ پر آ گئی

کہتا ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار سے وہ شوخ　　اس شکل پر حضور کو سوجھی ہے چاہ کی

خبر ہے نعش پہ کس بے وفا کے آنے کی　　کہ جاں ابھی سے ہے مشتاق جا کے آنے کی
ہزار برق نے چل پھر کے مشق کی لیکن　　ادا نہ آئی تم سے مسکرا کے آنے کی
گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر　　ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

فرقت میں مجھ کو موت ٹھکانے لگا گئی　　کیسے نصیب جاگ اٹھے نیند آ گئی

کیوں سوئے کمر ہاتھ بڑھاتے ہے وہ کاکل　　لیلیٰ کبھی مجنوں کی بلائیں نہیں لیتی

نہ اٹھو نزع میں حسرت یہ ہے　　یار پھر کاہکو محبت ہوگی

یاد آئے اگر مجھ کو چمن کنج قفس میں　　دامن میں لئے پھول نسیم سحر آوے

سو چمن صدقے کئے دامان گلچیں پر امیر　　ذکر پھولوں کا یہاں باد صبا رہنے بھی دے

نہ سنے درد دل مرا نہ سنے　　میں کہوں گا سنے وہ یا نہ سنے
یوں وہاں چل کہ پاؤں کی آہٹ　　پاسباں کیا ہے نقش پا نہ سنے
پھول آہستہ توڑ اے گلچیں　　دیکھ ظالم کہیں صبا نہ سنے

حال پھولوں کا جو خزاں نے کہا — کہیں بلبل وہ ماجرا نہ سُنے
میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو — بت ہی کس سن لیں اگر خدا نہ سُنے
بہت اے دل وفا وفا نہ پکار — کہیں وہ دشمنِ وفا نہ سنے
میں تو سُنتا ہوں تو جو کہتا ہے — اے ستمگر مگر خدا نہ سُنے
رات تھوڑی سی حسرتیں بے حد — کیا کرے کیا سنے وہ کیا نہ سُنے
ناز اٹھواتی ہے قضا مجھ سے — کہیں اس شوخ کی ادا نہ سُنے

لگا چاہتی ہے کوئی آگ تازہ — شرارت سے ان کی حیا مل رہی ہے
الٰہی انھیں راس آئے یہ زینت — لہو میں ہمارے حنا مل رہی ہے
بہار آئی ہے چہچہاتے ہیں بلبل — قیامت صدا سے صدا مل رہی ہے

پھول جھڑتے نہیں خزاں میں امیرؔ — روٹھے جاتے ہیں گل گلستاں سے

یہ وقتِ مرگ لیلےٰ کی دعا تھی — الٰہی خوش رہے مجنوں جہاں ہے

آ کے غربت میں ہمیں عیشِ وطن بھول گئے — لطف اٹھایا یہ قفس میں کہ چمن بھول گئے
نجد میں پھرتے ہیں کیوں چار طرف سرگرداں — کیا نشاں مرقدِ مجنوں کا ہرن بھول گئے
اب تو بھولے سے بھی کرتا نہیں تو یاد ہمیں — جتنے وعدے تھے سب اے عہد شکن بھول گئے
قید میں طول کھنچا یہ کہ اسیرانِ قفس — شکلِ گل بھول گئے رنگِ چمن بھول گئے

سالہا سال ہوئے ہیں نہیں آئی ہچکی — کیا غریبوں کو عزیزان وطن بھول گئے

تیغ کھینچے جو یار آتا ہے — اور بھی مجھ کو پیار آتا ہے
بال کھولے جو یار آتا ہے — گھر کے ابر بہار آتا ہے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — لوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے
کون ویرانے میں دیکھے گا بہار — پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے
صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر — بھیجتے تحفہ مؤذن کے لئے

تند مے اور ایسے کمسن کے لئے — ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے
وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا — ہم برے سب سے ہوئے جن کے لئے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے
جھاڑتی ہے کونسے گل کی نظر — بلبلیں پھرتی ہیں کیوں تنکے لئے

تیر قضا کو ناز ہے کیا اپنے توڑ پر — اتنا اثر تو یار کی سیدھی نظر میں ہے
ساقی مئے طہور میں کیفیتیں سہی — پر وہ مزا کہاں ہے جو تیری نظر میں ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اے چرخ حسینوں کی جفا اور ہی کچھ ہے — معشوق کی چھیڑوں میں مزا اور ہی کچھ ہے
رنگ آج تو پھولوں کا صبا اور ہی کچھ ہے — آمد ہے جو اس گل کی ہوا اور ہی کچھ ہے
عادت تو امیرؔ اچھی ہے فریاد و دعا کی — پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

تیرے کوچے سے گھر کو کیا نسبت — ایسی غربت پہ سو وطن صدقے

نئے رنگ کے کھل گئے گل امیرؔ — طبیعت جہاں رنگ پر آگئی

صبا آتی ہے اٹھلاتی ہوئی آج — کوئی پیغام لائی ہے کہیں سے

ہمیں دھڑکا ہے ایسا اسکے اٹھ جانیکا محفل سے — بدل جاتا ہے رنگ اپنا جو وہ زانو بدلتا ہے

دردِ دل کہیے تو کہتا ہے وہ شوخ — ایک ہی تم کو کہانی یاد ہے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے — نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے
جہاں نام آتا ہے ان کا زباں پر — تو لیتی ہے بوسے زباں کیسے کیسے
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے — ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

ڈھنگیں تر نگیں جوانی ہی تک بھتیں　　رہے رات بھر میہماں کیسے کیسے

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے　　ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
پھول پھل ہوں کہ نہوں چھاؤں گھنی ہو جس میں　　ہر مسافر کی نظر میں وہ نہال اچھا ہے
دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بیتابی کو　　ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

بہت جلدی نہ کر قاتل دم ذبح　　یہی تو حاصلِ عمر اک گھڑی ہے

پاک من ہو تو ارمانِ وصال اچھا ہے　　اچھی نیت ہو تو اچھوں کا خیال اچھا ہے
روز آتا ہے مرے دل کو تسلّی دینے　　تجھ سے اے دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے

جب آنکھ اس شاہِ خوباں پر پڑی ہے　　نگہ تقدیر بن بن کر لڑی ہے
کلی کو باغ میں چھیڑا ہے کس نے　　صبا یہ موہنہ لپیٹے کیوں پڑی ہے

یہاں تو مری جان پر بن رہی ہے　　تمہیں جانِ من دل لگی سوجھتی ہے

کسی واماندہ حسرت زدہ کو یاد کرتا ہے　　سنو اے قافلے والو جرس فریاد کرتا ہے

نیرنگیٔ عالم ہی کا شاکی ہے تو اے دل　　ناداں ابھی نیرنگِ محبت نہیں دیکھے

دل میں رہیئے خواہ آنکھوں میں حضورا جلوہ گاہیں دونوں ہیں سرکار کی!

جو ہے بہار اس کو خزاں کا خطر بھی ہے اے باغباں بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے؟

امیؔن جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

جلیل حسن مانکپوری

نام جلیل حسن۔ تخلص جلیلؔ۔ خطاب جلیل القدر فصاحت جنگ۔ ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ اپنے وطن مانکپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم تھا۔ تعلیم فارسی عربی کی لکھنؤ میں حاصل کی۔ بیس سال کے تھے جب امیرؔ مینائی کی شاگردی اختیار کی اور انھیں کی ہمراہی میں حیدرآباد دکن گئے۔ وہاں داغؔ کی وفات کے بعد نواب محبوب علی خاں کی استادی کا عہدہ ملا۔ بعد میں میر عثمان علی خاں خسرو دکن کی بھی استادی کا شرف ملا۔ یعنی وہ بھی اپنے کلام میں جلیلؔ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ آخر کار ۱۹۴۶ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

ردیف الف

فرقت میں ہے خیال کسی گلعذار کا میری خزاں میں رنگ ہے فصل بہار کا

وہ آئے یا نہ آئے کچھ اس سے غرض نہیں
آنکھوں کو پڑ گیا ہے مزا انتظار کا

وعدے کا اعتبار تو اے یار ہے مگر
کیا اعتبار زندگی مستعار کا

صیاد ! مجھ کو آپ اسیری کا شوق ہے
اتنا ٹھہر کہ ختم ہو موسم بہار کا

ان گل رخوں کا دور ہوا جب سے اے جلیلؔ
نقشہ بدل گیا چمنِ روزگار کا

دیر میں آیا تو کیا قاصد شتاب آیا تو کیا
اُن کو آنا چاہیئے خط کا جواب آیا تو کیا

آنکھ بھی ساقی ملانا جا خدا کے واسطے
دَور میں خالی اگر جامِ شراب آیا تو کیا

رات کو سونا نہ سونا سب برابر ہو گیا
تم نہ آئے خواب میں آنکھوں میں خواب آیا تو کیا

شرم کا دعویٰ ہے بیجا اپنی چتون دیکھئے
شوخیوں کے ساتھ آنکھوں میں حجاب آیا تو کیا

رندؔ

نواب سید محمد خاں نام۔ رندؔ تخلص۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۱۹۷ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ نوابینِ اودھ سے قرابت تھی۔ بہو بیگم کو خاص تعلق ان سے تھا لہٰذا جب وہ فوت ہوئیں تو رندؔ فیض آباد سے ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ آئے۔ فیض آباد میں میر خلیقؔ کے اور لکھنؤ میں آکر آتشؔ کے شاگرد ہوئے۔ اُن کے دو دیوان گلدستۂ عشق کے نام سے یادگار ہیں۔ سالِ وفات ۱۸۵۵ء ہے

ردیف الف

نازِ بیجا اٹھائیے کس کے — اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

ردیف ل

دیدِ گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل — پڑ گئی جب کسی صیاد کے پالے بلبل
پھر وہی کنجِ قفس ہے وہی صیاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل
ایک دو گل سے جو تسکین نہ ہوئے تیری — باغ کا باغ ہی سر پر نہ اٹھالے بلبل
چہچہے بند کرے گا تو یہ ہو جائے گی بند — کہہ دو گلچیں! کہ زباں اپنی سنبھالے بلبل

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ردیف ن

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں — اے شہِ حسن فقیر دل کی دعا لیتے ہیں

کبھی خوفِ خزاں ہے اور کبھی صیاد کا کھٹکا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیاں میں اس گلستاں میں

لطفِ گلگشتِ چمن کنجِ قفس میں بھولے — اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں

سرو کٹتے ہیں اکھڑتے باغ سے شمشاد ہیں — ناز پروردانِ گلشن موردِ بیداد ہیں

ردیف ی

ظلم بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی — سب گوارا ہے اگر سنتے رہو فریاد بھی
تجھ سے مل کر او بتِ بے پیر عقدہ کھلا — بھولی بھالی شکلوں والے ہوتے ہیں جلاد بھی

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے تو او بتِ کافر فقط تڑپانا آتا ہے

صراحی قہقہہ بھرتی ہے مینا مسکرا تا ہے
ہمارا یار جس دم جانب میخانہ آتا ہے

بچھا کر دام گیسو رخ پہ وہ صیّاد یوں بولا
یہ وہ پھندا ہے جس میں مرغِ دل بیدانہ آتا ہے

ساقیا جھوم کے بدلی جو کبھو آتی ہے
حسرتِ ساغر و صہبا و سبو آتی ہے

کیا ملا عرضِ مدعا کر کے؟
بات بھی کھوئی التجا کر کے!

تعشق

نام سید میرزا تعشق تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ باپ کا نام میرزا محمد انس۔ ایک مدت تک کربلا میں مقیم رہے پھر ہندوستان آگئے۔ بڑے قابل اور نازک خیال استاد مانے جاتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں بھی شہرۂ آفاق ہوئے۔ ان کا کلام پتہ دیتا ہے کہ شگفتگی مضامین اور جدتِ خیال ان کا خاص حصہ تھا۔ ۱۸۹۶ء میں بمقام لکھنؤ انتقال ہوا۔ ان کا غزلوں کا دیوان بھی ہے اور مرثیے بھی موجود ہیں۔ سب سے پہلا شعر جو تعشق نے باپ (یا بڑے بھائی) کے سامنے بہ نظرِ اصلاح پڑھا اور جس کا مصرع طرح تھا ع

بیمارِ محبت کبھی اچھا نہیں ہوتا

وہ تھا:

محشر ابھی اس واسطے برپا نہیں ہوتا
تم نے جسے مارا ہے وہ زندہ نہیں ہوتا

ردیف الف

نہاں جب ہوا ماہِ کامل ہمارا
تڑپتا رہا دیر تک دل ہمارا

نہ چونکے حضور آپ سوتے تھے غافل
پکارا کیا رات بھر دل ہمارا

شہِ حسن ہو تم خیال اتنا رکھو
کہ خالی نہ پھر جائے سائل تمھارا

بس دم اس منزل میں اب یہ حوصلہ جاتا رہا
جس کے ساتھ آئے تھے ہم وہ قافلہ جاتا رہا

عشق کی وہ شورشیں وہ ولولہ جاتا رہا
اک جوانی کیا گئی سب حوصلہ جاتا رہا

بعد میرے ظالموں نے ہاتھ کھینچے ظلم سے
آسماں کو بھی جفا کا حوصلہ جاتا رہا

اے جنوں بیڑی پہنانے تھے ہم ان کو ہر برس
جب سے منت بڑھ گئی وہ سلسلہ جاتا رہا

گنج گوہر بھی جواب ہاتھ آئے تو کس کام کا
اے جنوں میرا دلِ پُر آبلہ جاتا رہا

اب ملاقات مہینوں نہیں ہوتی اُن سے
یاد آتا ہے زمانہ مجھے یکجائی کا

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائیگا
ہم جہاں ہونگے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے عرش سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا
موتیوں کی آبرو پر آج پانی پھر گیا

گر پڑے آنسو عروجِ ماہِ کامل دیکھ کر
میری نظروں میں ترا عہدِ جوانی پھر گیا

کہتے ہو کہ آج آنکھ پھڑکتی ہے ہماری
بیتاب بہت ہے دلِ بیمار کسی کا

لب تک کبھی آنے نہ دیا حرفِ شکایت   دل ہے مرے پہلو میں طرفدار کسی کا

نقشِ پا ہیں ہوسِ نام و نشاں خاک نہیں   ہم تو اٹھنے کے لئے بیٹھے ہیں مسکن کیسا
تھا کبھی دور اسیرانِ قفس اے صیاد   اب تو اک پھول کو محتاج ہیں گلشن کیسا

کاش یہ جمشید کو معلوم ہوتا جام میں   کاسۂ سر کاسۂ دستِ گدا ہو جائیگا

گاہ وحشت میں ہنساتا تھا۔ رلاتا تھا کبھی   دل نہیں جاتا رہا اک مشغلہ جاتا رہا

دلِ پُر داغ کا میں حال کہوں کیا تم سے   پھول دیکھا ہے کبھی لالۂ صحرائی کا

ردیف ب

ہے خزاں باغوں میں روتے ہیں یہ کہہ کر باغباں   گل یہاں تھے اس جگہ تھا آشیانِ عندلیب

ردیف ت

قتل گہ میں اپنے اپنے کام میں تھے حسن و عشق   اس کی آنکھیں تیغ پر تھیں میری آنکھیں سوئے دوست

خونِ ناحق کا عوض آخر ہوا کس حسن سے   ہم سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست
اے تعشق اب سرِ شوریدہ ہے اور سنگ ہے   وصل کے ایام میں تھی عادتِ زانوئے دوست

خموشی ہو گئی طوقِ گلو آج   کسی کی یاد آئی گفتگو آج
اکیلا ہوں شبِ فرقت میں اے دل   بہل جاؤں کرے باتیں جو تو آج
ہوا ترکِ محبت پر نہ راضی   رہی تا دیر دل سے گفتگو آج
تعشق دیکھتا ہے کس کی تو راہ   لگی ہیں دونوں آنکھیں چار سو آج

ردیف د

وحشتِ دل یہ بڑھی چھوڑ دیئے گھر سب نے
تم ہوئے خانہ نشیں ہو گئیں گلیاں آباد

مٹ گئے داغِ جگر حسنِ رخِ یار گیا
کل کی ہے بات کہ تھا کیا یہ گلستاں آباد

ردیف ر

فنا کے بعد بھی اٹھنے کو جی نہ چاہے گا
عجیب لطف کا سایہ ہے آپ کے در پر

بخیہ جراحتِ دلِ نازک مزاج کا
موقوف ہے حضور کے تارِ نگاہ پر

ردیف ن

وہ کھڑے کہتے ہیں میری لاش پر
ہم تو سنتے تھے کہ نیند آتی نہیں

چھڑا لینے کی اب تو پوچھتے پھرتے ہیں تدبیریں
کبھی یہ فکر تھی ہم کو کہ کیونکر دل لگاتے ہیں

نئے آج ان کے چلن دیکھتے ہیں
ہمارے وہ داغِ کہن دیکھتے ہیں

ملاتے ہیں جا جا کے دریا میں آنسو
جو میلا ترا پیرہن دیکھتے ہیں!

سنے گا بھلا کون یہ سخت باتیں
حضور اپنا طرزِ سخن دیکھتے ہیں!

خیالِ رخ و زلف میں کیوں نہ روئیں
کہ پانی میں سورج گہن دیکھتے ہیں

ترے حسن کا رعب ایسا ہے اے گل
کہ چھپ چھپ کے مرغِ چمن دیکھتے ہیں

تعشق نے آنا کیا ترک شاید
اُداس آپ کی انجمن دیکھتے ہیں

ردیف و

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اداس بیٹھے ہو
یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو

مجھی کو ناز سے دیکھا جلا جو پروانہ
تم ایک بزم میں مردم شناس بیٹھے ہو

جنھیں لگاتے تھے تیغیں وہ مر گئے شاید
کہ ہاتھ ہاتھ پہ رکھے اداس بیٹھے ہو

ردیف ی

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا — کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری
تمام رات رہا دل سے ذکرِ خیر ترا — گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری
صدائے نغمۂ بلبل سے دل پہ چوٹ لگی — کہ یاد آگئی کانوں کو گفتگو تیری
مرا پیام صبا میرے گل سے کہہ دینا — چلی گئی مجھے بیہوش کر کے بو تیری

آج کس پر رحم آیا کس کو روئے ہیں حضور — ہے نصیبِ دشمناں آواز بھاری آپ کی

اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں — دردِ دل اتنے دنوں سے ہے کہ عادت ہو گئی
ہم وہ بلبل تھے اٹھایا جب چمن سے آشیاں — باغباں کو باغ کی صورت سے نفرت ہو گئی

ردیف ے

نخلِ امید میں پھول آئے ہیں بار آتا ہے — آمد فصلِ بہاری ہے کہ بار آتا ہے
رُخ ترے تیر کا ہوتا ہے جدھر کو صیاد — جان و دل سے اسی پہلو پہ شکار آتا ہے
یوں جلاتا ہے فلک گورِ غریباں پہ چراغ — کوئی جگنو کبھی بالائے مزار آتا ہے

شب کو کیا کیا باغ میں جلوے تمہارے ہو گئے — چاندنی کے پھول جو توڑے ستارے ہو گئے
بڑھتے بڑھتے آتشِ رخسار کو دینے لگے — رفتہ رفتہ کان کے موتی شرارے ہو گئے

پاؤں آہستہ سے رکھ اے غافل — دیکھ تو کون خواب میں ہے
روک اے شہسوار توسن کو — روح مجھ زار کی رکاب میں ہے

چھوٹ جائیں ہم عذابِ ہجر سے — اب تو ایسی کوئی صورت کیجئے
دور جانا ہے کہ ہے قصدِ عدم — مہرباں اب ہم کو رخصت کیجئے
کی صفائی عاشقوں کی مرگ نے — دور اب دل سے کدورت کیجئے
قبر میں لاشہ کوئی پھینک آئے گا — آپ کیوں ناحق کی زحمت کیجئے
موت ہے غارت گری کی تاک میں — جمع کیا اسبابِ راحت کیجئے
اے تعشق چار دن ہے زندگی — دشمنوں سے بھی محبت کیجئے

جھنجلا کے باغباں نے مجھے ذبح تو کیا — اب رو رہا ہے منہ کو قفس پر دھرے ہوئے
اللہ رے پاس الفت پروانہ بعد مرگ — روتی ہے شمع سامنے لاشہ دھرے ہوئے
بھی نہ ہوش میں ہم اے خیالِ یار آئے — کسی کے در پہ گئے جب تجھے پکار آئے
ہماری خاک پڑی ہے تمہارے کوچے میں — ذرا نسیم سے کہہ دو نہ بار بار آئے
کہیں پہ چھوٹ گیا دل کہیں پہ رہ گئی روح — ہم اس قدر ترے کوچے سے بیقرار آئے
ہمارے بعد یہ ہے حال ہمصفیروں کا — اس آشیاں میں صدا دی ادھر پکار آئے
خفا نہ ہو جو تمہاری گلی میں دفن ہوئے — ہزار بار سب آئے ہم ایک بار آئے

ایسی دل سوز حسینوں کی پلک ہوتی ہے — سانس لینے سے کلیجے میں کھٹک ہوتی ہے

نہ گھر میں اور نہ آتا ہے اس گلی میں قرار — عجیب شکل دمِ اضطراب ہوتی ہے

گیا شباب مگر رہ گیا تعلقِ عشق — دل و جگر میں چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

فرماتے ہیں مرے دلِ نازک کو توڑ کے　　دیکھیں تو شیشہ گر اسے کیونکر بنائیں گے

نجد سے جانبِ لیلیٰ جو ہوا آتی ہے　　دلِ مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
جا کے دیتا ہوں یہ آواز میں اُس کوچے میں　　کس کو دردِ دلِ عاشق کی دوا آتی ہے
آئے ہیں کون سے عاشق کے گلے مل کے حضور　　آپ سے آج مجھے بوئے وفا آتی ہے
بھر رہا ہے نفسِ سرد مرا دل شاید　　ٹھنڈی ٹھنڈی ترے کوچے سے ہوا آتی ہے
روندتے ہیں جو وہ خونی جگروں کے دل کو　　پاؤں پڑنے کو گلستاں سے حنا آتی ہے
ہم کو مل جاتی ہے اپنے دلِ وحشی کی خبر　　ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے
کہتے ہو کیوں ہے تعشق ترے منہ پر زردی　　ہجر میں نیند کم اے ماہ لقا آتی ہے

کہیں پژمردہ نہ ہو جائے یہ ڈر رکھتی ہے　　پاؤں سبزے پہ تکلف سے نظر رکھتی ہے

انتخاب از مرثیہ - صبح کا سماں

بلبلیں لاتی تھیں سر کو قدمِ گل کے جو پاس　　مسکراتے تھے یہ غنچے کہ خدا لائے راس
تازگی دیکھے جو سبزہ کی تو جاتی رہے پیاس　　اوس کھائے ہوئے سبزے کی وہ ٹھنڈی بوباس
کہیں پژمردہ نہ ہو جائے یہ ڈر رکھتی ہے
پاؤں سبزے پہ تکلف سے نظر رکھتی ہے
ڈالیوں پر وہ خوش الحانیٔ مرغانِ سحر　　وجد میں جھومتے تھے سارے بیاباں کے شجر
خرمن و سبزہ و شاخ گل تر برگ و ثمر　　کوئی ہو، بحر ہو یا بر ہو شجر ہو کہ حجر
بندگی کا جو طریقہ ہے ادا کرتے ہیں
سب کے سب ایک زباں حمد خدا کرتے ہیں

میر انیسؔ

میر ببر علی نام انیس تخلص۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ جب دلّی تباہ ہوئی تو فیض آباد آئے اور یہیں میر انیس ۱۲۱۶ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فیض آباد میں اور اس کی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ بیالیس سال کی عمر میں بہ عہد امجد علی شاہ لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کیا۔ ان کی اور ان کے گھرانے کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ ابتدا میں غزل گوئی کی طرف مائل تھے لیکن باپ کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ اور اس میں چار چاند لگا دیئے۔ حتیٰ کہ ان سے پہلے۔ یا ان کے بعد فن مرثیہ گوئی میں کوئی اس کمال کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ —— زبان کی چاشنی واقعہ نگاری۔ محاورات کی برمحل بندش۔ سلاستِ زبان اور تنوع کے ساتھ رزم بزم میں وہ دلکش انداز اختیار کیا کہ لوگوں نے انکو فردوسیٔ وقت مان لیا۔ مرزا دبیر لکھنوی ان کے ہمعصر تھے اور مدِّ مقابل سمجھے جاتے تھے۔ ۷۴ سال کی عمر پائی اور لکھنؤ میں اپنے مکان میں دفن ہوئے۔ سالِ وفات ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء ہے۔

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم ۔۔۔ مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم ۔۔۔ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو بہتا دیکھ کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کا نپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

کیا فوج تھی حسینؑ کی اس فوج کے نثار
ایک ایک آبروئے عرب فخر روزگار
جرار و دیں پناہ نمودار و نامدار
لڑکوں میں سبز رنگ کوئی، کوئی گلعذار
فوجیں کوئی سماتی تھیں ان کی نگاہ میں
وہ سب پلے تھے بیشۂ شیر الٰہ میں

میدانِ کربلا میں حضرت علی اکبرؑ کا اذان دینا اور انصارِ حسینؑ کی نمازیں

یہ کہہ کے بڑھے پھر تیمم شہ صفدر
جنگل میں اذاں دینے لگا دلبرِ سرور
وہ صوتِ حسنؑ اور وہ خوش الحانی اکبرؑ
ہر شخص کو یاد آگئی آوازِ پیمبرؐ
ہر نخل کو اک وجد تھا اُس ظلم کے بن میں
تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

کیا فوجِ حسینیؑ کے جوانانِ حسیں تھے　　کیا زاہد و ابرار تھے کیا صاحبِ دیں تھے
آگاہ دل اہلِ وفا اہلِ یقیں تھے　　غنچہ دہن و مہر لقا ماہ جبیں تھے
اک ایک کے مرقد پہ فدا ہوتی ہے زہراؑ
عاشور سے بس آج تلک روتی ہے زہراؑ

حضرت عباسؑ کی شہادت پر زوجۂ عباسؑ کے بین

دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تم کو بھا گئی　　جاگے تمام رات کے تھے نیند آ گئی
صورت تمہیں عروسِ شہادت دکھا گئی　　کیا خوش نصیب تھی کہ اجل تم کو پا گئی
ہم تیرہ بخت ہجر کی راتوں میں روئیں گے
جاگے نصیب قبر کے آپ اس میں سوئیں گے

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر　　راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر　　نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ کی حالت

ہر دم پکارتے تھے کہ اکبرؑ کدھر گئے　　اے نورِ چشم بانوئے بے پر کدھر گئے
مرتا ہے باپ اے مرے دلبر کدھر گئے　　آواز دو شبیہ پیمبر کدھر گئے

اے میرے شیر کیا کسی جنگل میں چھپ رہے
اے میرے چاند کون سے بادل میں چھپ رہے

اکبرؑ ہماری آنکھوں میں اب تیور آتے ہیں ہاتھوں کو تھام لو کہ قدم تھرتھراتے ہیں
کھوئے گئے ہیں خود کہ نہیں تم کو پاتے ہیں کیا جانے اضطراب میں کس سمت جاتے ہیں

اکبرؑ سنبھال لو کہ نہایت نحیف ہیں
بیٹا ابھی جوان ہو تم ہم ضعیف ہیں

اے میرے لمبے گیسوؤں والے ترے نثار اے باپ کی ضعیفی کے پالے ترے نثار
کھائے جگر پہ زخم کے بھالے ترے نثار بابا کو پاس اپنے بُلالے ترے نثار

فرزندِ فاطمہؑ کی بےکسی پہ رحم کر
اے نوجواں پدر کی ضعیفی پہ رحم کر

جی چاہتا ہے پھر تمہیں اک بار دیکھ لوں محبوبِ حق کا آخری دیدار دیکھ لوں
موہنہ پر لٹکتے گیسوئے خمدار دیکھ لوں ڈوبے لہو میں چاند سے رخسار دیکھ لوں

اکبرؑ گلے سے لپٹو تو بابا کو کل پڑے
اب ہے یقیں کہ موہنہ سے کلیجہ نکل پڑے

آئی کسی طرف سے نہ اکبرؑ کی جب صدا اعدا کو تب پکارے شہنشاہِ کربلا
سبطِ نبیؐ کے حال پہ اب رحم کی ہے جا بتلاؤ کس طرف ہے مرا لال مہ لقا

برچھی ستم کی کھا کے وہ پیارا کدھر گیا؟
اے فوجِ شام چاند ہمارا کدھر گیا؟

جب قطع ہوئے نخلِ گلستانِ علیؑ کے سر کٹ گئے تیغوں سے جوانانِ علیؑ کے
بےدم ہوئے دلدار دل و جانِ علیؑ کے عاشق نہ رہے یوسفِ کنعانِ علیؑ کے

خاک اڑنے لگی پنجتنِ پاک کے گھر میں
لُوٹا گیا زہراؑ کا چمن تیغ پہ سر میں

شمشادِ بوستانِ رسالت حسینؑ ہے
مفتاح بابِ گلشنِ جنت حسینؑ ہے
ابرِ عطا و آیۂ رحمت حسینؑ ہے
نقشِ نگینِ مُہر نبوت حسینؑ ہے
ہر جا ظہورِ حق ہے انھیں کے ظہور سے
سب خاک سے بنے ہیں یہ خالق کے نور سے

مدینے سے روانگی کے وقت حضرتِ صغراؑ سے رخصت

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
اکبرؑ کو بلاؤ علیؑ اصغر کو بلاؤ
آئے علی اکبرؑ تو کہا شاہ نے آؤ
روٹھی ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغراؑ مری تقصیر؟
چلانے لگی چھاتی پہ سو منہ رکھ کے وہ دلگیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبرؑ
چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبرؑ
یاد آئیگی یہ جسم کی خوشبو علی اکبرؑ
ڈھونڈیں گی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبرؑ
دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا

حضرت صغراؑ کے رونے پر حضرت بانوؑ فرماتی ہیں

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
اصغرؑ مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تپ سے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

کربلا میں ورود

اترا یہ کہہ کے کشتیٔ امت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرتؑ نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا!!
اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند
کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراب ہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے!

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اترا مہ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا سے اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ایک ایک بیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکاب سبز قدم سر گروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا
کہہ دو کہ اہلبیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے لختِ دلِ سید البشر
آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

یزیدی لشکر کا جواب

ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضے پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم؟
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کئے ہوئے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
باندھے تھے نیزہ دار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر
تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظ لشکر بد خو پہ آگیا
غصے سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

بولے اٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر
بس اب سزائیں انکی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر
بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر
آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں

کثرت پہ اپنی بھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جناب قاسم ذی شاں نے آستیں ۔ قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسیں
بولے پکڑ کے نیچے زینبؑ کے مہ جبیں ۔ شیروں سے کیا تراہی کو لینگے یہ اہل کیں
کہئے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباسؑ ذی حشم ۔ بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم
تیغیں جو تولتے تھے ادھر بانی ستم ۔ کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

شور سن کر حضرت زینبؑ پریشان ہوتی ہیں اور فرماتی ہیں

ہمشیر کو نثار امام اُمم کرو ۔ لوگو دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا ۔ بلوہ کنار نہر ہے اے بنت مرتضیٰؑ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا ۔ قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

لشکر یزیدی میں حضرت حُر حضرت امام حسینؑ کی تعریف کرتے ہیں

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں ہیں سخی ابنِ سخی بات پہ سر دیتے ہیں
پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں
اس مجرم کی گنہ گار کی امید ہیں یہ
ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمر سعد شریر یہ تو ہے صاف طرفداریٔ شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر اللہ اللہ یہ اوصاف، یہ مدحِ شبیرؑ
سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
اُلفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں نہ وہ تیور نہ وہ چتون نہ مزاج سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

حُر پکارا کہ زباں بند کر او نا ہموار قابلِ لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
ابنِ زہراؑ ہے جگر بندِ رسولِ مختارؐ میرا کیا منہ جو کروں مدحِ امامِ ابرار
اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

باغ جو مجھ کو دکھایا اُسے کیا جانیگا تو راحتِ روح ہے جس باغ کے ہر پھول کی بو
مجھ کو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں خوشرو کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو
نام کوثر کا نہ لے تو مجھے جوش آتا ہے
انھیں چھینٹوں سے تو بیہوش کو ہوش آتا ہے

عملِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس ہی کونین کا مالک ہے یہی راس و رئیس

کیا مجھے دے گا ترا حاکمِ ملعون خسیس — کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
اے ستم گر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار — سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آیا اک بار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار — پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار
غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہے
لو طرفدارِ حسینِ ابنِ علیؑ جاتا ہے

حر نے نعرہ کیا یا حیدرِ صفدر مدد دے — وقتِ امداد ہے یا فاتحِ خیبر مدد دے
روحِ زہرا مدد اے نفسِ پیمبر مدد دے — بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد دے
تنِ تنہا ہے غلام اور بہت اظلم ہیں
آئی آواز کہ اے حر ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہِ خدا واہ رے اقبال ترا — پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جرم ماضی ہوئے سب عفو خوش احوال ترا — جلد جا جلد کہ شائق ہے مرا لال ترا
مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہوئے
ہاں بہادر تری توفیق زیادہ ہوئے

منتظر ہیں ترے سب فوجِ حسینی کے جواں — درِ فردوس پہ مشتاق کھڑا ہے رضواں
راہ تکتی ہیں تری دیر سے حورانِ جناں — شور کوثر پہ ہے شبیرؑ کا مہماں ہے کہاں
فوجِ قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہے
فاطمہؑ آج ترے حق میں دعا کرتی ہے

سن کے یہ باگ جو لی اسپِ سبک تاز اڑا — ڈر سے رنگِ عمر[1] شعبدہ پرداز اڑا

[1] عمر سعد۔

کیا اڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اڑا | دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا
باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہے
غل تھا دربارِ سلیماں میں پری جاتی ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند | حُر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گردِ سمند
کٹتے تھے شرم سے وہ لیکے جو دوڑے تھے کمند | یہ چھلاوا تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند
کیا سبک سوئے چمن بادِ بہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے واں حُر کی سواری پہنچی

واں ہوئے علمِ امامت سے شہِ دیں آگاہ | ہنس کے عباسؑ سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ
میرے لشکر کی طرف آتا ہے رخ حُرِ ذی جاہ | سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
میرا مہماں مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار | الغیاث اے جگر و جانِ رسولِ مختارؐ
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جسکے شمار | عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیضِ غفار!
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے

اے مددگارِ معین الضعفا ادرکنی | اے خبرگیرِ گروہِ غربا ادرکنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا ادرکنی | ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اے عقدہ کشا ادرکنی
دیجیے حُر کو سندِ نار سے آزادی کی
آئیے جلد خبر لیجیے فریادی کی

استغاثہ کیا یہ حُر نے جو بادیدۂ نم | جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ امم | حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اس دم

شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
لے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حضرتِ حُرؑ کے اظہارِ تشکر پر

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب — دے کسی شخص کو بندے ہیں یہ مقدور ہے کب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب — وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
اپنے کیسہ سے نہ دام اور نہ درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے — دستِ فولاد دبا جاتا تھا دو شانوں سے
برچھیوں اڑتا تھا دب کے فرس رانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
خود رومی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی
چشمِ خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

میدانِ جنگ میں حضرتِ حرؑ زخمی ہو کر گرتے ہیں امام حسینؑ دوڑ کر وہاں پہنچتے ہیں اور ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تشفی و دلداری کرتے ہیں

نیم وا چشم سے حر نے رخِ مولا دیکھا — زیرِ سر زانوئے شبیرؑ کا تکیہ دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا — شہ نے فرمایا کہ اے حرِّ جری کیا دیکھا؟
عرض کی حسنِ رخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں　　پڑھیے لیٰسین کہ اب ہے یہ دم بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہ عرش نشیں　　لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیرؑ کے لی انگڑائی　　آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی　　چل بسے حرؑ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پُتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

صبح کا منظر

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا اگلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور　　وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک　　شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک　　ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار　　پھولوں پہ جابجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

عاشورۂ محرم کا ذکر

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار — پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل بھی گلوں کا ہار — جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار
راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا — کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا
گھر لٹ گیا جناب رسالت پناہ کا — خاک اڑ رہی تھی حال یہ تھا بارگاہ کا
بھائی نہ وہ رفیق نہ وہ نورعین تھے
دو بہنیں رونے والیاں تھیں اک حسین تھے
ڈیوڑھی وہ صبح تک تھے دورستہ جہاں سوار — خادم ہے واں کوئی نہ کوئی ہے رفیق دیار
نہ تو وہ دوپہر کی تپش اور وہ غبار — پردہ ہوا سے سر کو پٹکتا تھا بار بار
آفت تھی بیکسی تھی مصیبت تھی یاس تھی
بے فوج بادشاہ تھا ڈیوڑھی اداس تھی

حضرت امام حسین آخری رخصت کے وقت حضرت زینب کو یوں سمجھاتے ہیں

جو معرضِ قضا میں ہوں کیا اُن کا آسرا | میں ہوں تو کیا ہوں مالک و مختار ہے خدا
اٹھ جائیں بھائی بھانجے یا ہوں پسر جدا | صابر ''اسی'' سے صبر کی کرتے ہیں التجا
وہ قید میں نہ گھر کی بتاہی میں لڑھتے ہیں
روتے ہیں گر تو خوفِ الہٰی میں روتے ہیں

حضرت بانوؑ پریشان ہو کر یوں پکارتی ہیں !

منجدھار میں ہے ناؤ تلاطم ہے آشکار | موجیں ستم کی آتی ہیں طوفاں ہیں بار بار
اے ناخدائے کشتیٔ اُمت ترے نثار | بیکس کا ڈوبتا ہوا بیڑا لگا دے پار
رحم اب کہ بیقراری بسمل کا وقت ہے
حلّالِ مشکلات یہ مشکل کا وقت ہے

امام حسینؑ روانہ ہونے کیلئے آتے ہیں اور گھوڑا جھک جاتا ہے

پھیلا کے دونوں ہاتھ جھکا وہ سوئے زمیں | گھوڑے پہ جلوہ گر ہوا حیدرؑ کا نازنیں
پُر نور ہو گیا رخِ انور سے صدرِ زیں | مرکب پہ تھے حسینؑ کہ خاتم پہ تھا نگیں
شورِ درود غرب سے تا شرق ہو گیا
بیٹھے جو تن کے آپ فرس برق ہو گیا

بوئے بہشت لیکے نسیمِ سحر چلی | آگے فرس کے فتح تو پیچھے ظفر چلی
خود سر پہ چتر بن کے ضیائے قمر چلی | گھوڑا اچھلا کہ فتح کی گویا خبر چلی
غرفوں سے حوریں دیکھتی تھیں شہسوار کو

پریاں طبق لئے تھیں سروں پر نثار کو

ہاتھوں پہ زرہیں سب گل خوشرو لئے ہوئے
دوڑی صبا بہشت کی خوشبو لئے ہوئے
تیغ و سپر جو ہیں شہ خوشخو لئے ہوئے
غل ہے کہ ہاں نجات کا پہلو لئے ہوئے

شبیر تو امام ہے ابنِ امام ہے
گر غیظ آگیا تو یہ دنیا تمام ہے

نمازِ عصر کا وقت ہے حضرت تنہا لڑتے لڑتے چور ہو چکے ہیں

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر
چلّائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر
اکبرؑ اٹھو کہ گھوڑے سے گر تا ہے اب پدر
سوئے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر

بھولے پدر کو نیند ہیں قربان آپ کے
آؤ، نماز عصر پڑھو ساتھ باپ کے

عباسِ نامدار ترائی سے اُٹھ کے آؤ
ٹھنکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
چھڑکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ
چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ

ہم سب کے کام آتے ہیں پیٹے ہیں روتے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوتے ہیں

کیا بافضا یہ سرد ترائی ہے اب اٹھو
ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اٹھو
نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اٹھو
عباس دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اٹھو

غفلت کی تم کو نیند ہے شبیر کیا کرے!
میری طرح کسی کو نہ بیکس خدا کرے

تم جب سے چھوٹے ساعد و بازو میں درد ہے
گردن میں سر میں آنکھ میں ابرو میں درد ہے

دل ہی کمر ہی سینے ہی پہلو میں درد ہے — رگ رگ ہی کیا ہر ایک بُنِ مو میں درد ہے
ہر مرتبہ لٹے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نوجوانوں کے لاشے اٹھائے ہیں

حضرت علی اکبرؑ کے غم میں امام حسینؑ کا صبر و تحمل

پیری پہ مری رحم کر اے خالقِ ذوالمنن — طے جلد ہو اب مرحلۂ خنجر و گردن
قتلِ علی اکبر کی خوشی کرتے ہیں دشمن — تجھ پر مرے اندوہ کا سب حال ہے روشن
مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروح جگر ہوں
تو صبر عطا کر مجھے یارب کہ بشر ہوں

پھر لاشۂ اکبر نظر آئے تو نہ روؤں — برچھی جو کلیجے میں در آئے تو نہ روؤں
دل دردِ محبت سے بھر آئے تو نہ روؤں — سو بار جو منہ تک جگر آئے تو نہ روؤں
شکوہ نہ زباں سے غمِ اولاد میں نکلے
دم تن سے جو نکلے تو تری یاد میں نکلے

بانو سے کہا رو کے خوشا حال تمھارا — صرفِ رہِ معبود ہوا مال تمھارا
مقبول ہوئی نذر یہ اقبال تمھارا — سجدے کرو پروان چڑھا لال تمھارا
دل خون ہے کلیجے پہ سناں کھا کے پھرے ہیں
ہم اس کی امانت اسے پہنچا کے پھرے ہیں

قاتل جو چھری خشک گلے پر مرے پھیرے — خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے
کٹتے میں رگوں کے یہ سخن لب پہ ہو میرے — قربان حسین ابن علی نام پہ تیرے
بہنوں کی نہ ہو فکر نہ بچّوں کی خبر ہو

اس صبر سے سر دوں کہ مہم عشق کی سر ہو

فرما کے یہ ہتھیار سجے آپ نے تن پر
غل پڑ گیا شاہِ شہدا چڑھتے ہیں رن پر
احمدؐ کی قبا آپ نے پہنی جو کفن پر
پیدا ہوا اک جلوۂ نورِ ختنِ بدن پر
اللہ ری خوشبو تنِ محبوبِ خدا کی
پھولوں کی مہک آگئی کلیوں سے قبا کی

حضرت امام حسینؑ کی رخصت کے وقت حضرت سکینہؑ روتی ہیں اور حضرت امام یوں سمجھاتے ہیں

دنیا یہ ہے یہ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام
راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کبھی آغاز کا انجام
وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس چھاتی پہ آرام
ضد کر کے نہ اب رات کو رویا کرو بی بی
جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرہ کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحرِ مواج فصاحت میں تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرّے کو انجم کر دوں
گنگ کو ماہر اندازِ تکلم کر دوں
دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مدّاح — جدِّ اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مدّاح
باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح — عمِّ ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مدّاح
جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

تول لے عقل کے میزاں میں جو فہمیدہ ہے — بات جو مونھ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

دشت و غا میں نورِ خدا کا ظہور ہے — ذرّوں میں روشنیِ تجلّیِ طور ہے
اک آفتابِ رخ کی ضیا دور دور ہے — کوسوں زمین عکس سے دریائے نور ہے
اللہ رے حسن طبقۂ عنبر سرشت کا
میدان کربلا ہے نمونہ بہشت کا

صبحِ صادق کا ظہور

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر — دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرّد پہ بچھائے تھے گہر — لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں — اس طرف طبل بجے یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلّی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں — وہ نمازی کہ جبینیں کہ تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں

عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز
اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز

سر تو سجادوں پہ تھے عرشِ معلّٰی پہ نماز
شیر دل، منتخبِ دہر، وحید و ممتاز

چاند شرمندہ ہو چہرے سے تجلّی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلّی ایسے

آخرکار یزید سے اجازت لیکر ہند اہلبیتِ رسول کے پاس قید خانے میں جاتی ہے

باتیں یہ کر کے بیبیاں روتی تھیں زار زار
سینے میں تھا مگر نہ دلِ ہند کو قرار

کہتی تھی دیکھ کر رخِ اقدس کو بار بار
کس ملک کا رئیس ہے یارب یہ ذی وقار

آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی
تصویر ہے حسین علیہ السلام کی

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مارلو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

امام حسینؑ کا عجز و نیاز بارگاہِ معبود میں

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِ غفور
تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور

کرتے ہیں یہ مجھے بےجرم و خطا تیغوں سے چور
ہاتھ امت پہ اٹھانا نہیں مجھ کو منظور

جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہوں میں

اب اگر ہے یہ تری مصلحت اے ربِ قدیر　　ہو رواں حلق پہ اس پیاسے کے آبِ شمشیر
میرے مولا بسر و چشم ہے حاضر شبیر　　حکم حاکم میں یہ طاقت ہے کروں میں تاخیر
جلد گردن پہ رواں خنجرِ براں ہووے
اے خوشا وہ جو تری راہ میں قرباں ہووے

غم نہیں کچھ مجھے گو بیکس و بے یار ہوں میں　　زیرِ شمشیر گلا رکھنے کو تیار ہوں میں
تو مددگار ہے مختار ہے لاچار ہوں میں　　وقت مشکل ہے عنایت کا طلب گار ہوں میں
تیرے سجدے میں یہ سر تن سے جدا ہو جائے
عہدِ طفلی کا جو وعدہ ہے وفا ہو جائے

رحم کر رحم کہ شرمندہ ہوں اے بارِ خدا　　بندگی کا تری جو حق تھا ادا ہو نہ سکا
خوفِ محشر سے بدن کانپتا ہے سر تا پا　　ہوگی اعمال کی پرسش تو کہوں گا میں کیا
کوئی تحفہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ
ہاتھ خالی ترے دربار میں آتا ہے حسینؑ

میں تری راہ میں مظلومی سے ہوتا ہوں فدا　　تو ہے آگاہ کہ دو دن کا ہوں بھوکا پیاسا
چاہتا ہوں میں یہی اپنی شہادت کا صلا　　مغفرت امتِ عاصی کی ہو اے بارِ خدا
ہے گوارا مجھے جو کچھ کہ اذیت ہووے
ان کو دنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی راحت ہووے

عرض کرتے تھے یہ خالق سے شہِ بندہ نواز　　یک بیک عالمِ بالا سے یہ آئی آواز
اے مرے شیر کے فرزند نبیؐ کے دم ساز　　تجھ سے ہم خوش ہیں پذیرا ہے ترا عجز و نیاز
مرد ہے عاشقِ کامل ہے وفادار ہے تو

جو کہا وہ ہی کیا صادق الاقرار ہے تو
تو بھی مقبول ہے اور تیری عبادت بھی قبول
یہ اطاعت بھی ہے مقبول یہ طاعت بھی قبول
عاجزی بھی تری مقبول شہادت بھی قبول
تیری خاطر سے ہے بخشش امت بھی قبول
ہم نے خیلِ شہدا کا تجھے سردار کیا
امتِ احمد مختار کا مختار کیا

یہ صدا سن کے ہوئے شاد شہ ہر دوسرا
آگئی از سر نو جسم میں طاقت گویا
جھک کے سجدے کی طرف عجز سے رو کر یہ کہا
میرے مولا میں تری بندہ نوازی کے فدا
کیوں نہ ممتاز ہو وہ تو جسے رتبہ بخشے
اس کف خاک کو کیا رتبۂ اعلیٰ بخشے!

گو کہ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے
سہل ہے عشقِ بشر عشقِ خدا مشکل ہے
وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے
جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے
یہ فقط امر ہوا فاطمہ کے جانی سے
مشکلیں جتنی پڑیں کاٹیں وہ آسانی سے

گرمی کی شدت میں سفر اہلبیت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
توسنے ہوئے تمند زبانیں نکالے ہیں

سلام

گھر سے جب زوّارِ دو منزل گیا — مجرئی جنّت کا رستہ مل گیا
کیا شہادت کی خوشی تھی شاہ کو — زخم جو کھایا بدن پر کھل گیا
بات کی جب، پھول منہ سے جھڑ پڑے — مسکرائے جب، تو غنچہ کھل گیا

بہت زالِ دنیا نے دیں بازیاں — ہیں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ — عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

صبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گذارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار — کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

صبح شہادت

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے — سجدوں میں ہم عشق کی سر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے — مڑ کر رخِ اکبر پہ نظر کی شہ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

یہ کہہ کے بڑھے بہرِ تیمم شہِ صفدر — جنگل میں اذاں دینے لگا دلبرِ سرور
وہ صوتِ حسن اور وہ خوش لحنئ اکبرؑ — ہر شخص کو یاد آ گئی آوازِ پیمبرؐ
ہر نخل کو اک وجد تھا اس ظلم کے بن میں
تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

حضرت امام حسینؑ میدانِ جنگ میں

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ — غیر اصغرؑ نہ رہا نورِ نگاہِ شبیرؑ
تھی فقط روحِ علیؑ پشت پناہِ شبیرؑ — حق سے کہتے تھے کہ تو رہیو گواہِ شبیرؑ
سر فدا کر کے شریکِ شہدا ہوتا ہوں
آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

اب نہ قاسمؑ مرا باقی ہے نہ اکبرؑ باقی — نہ علمدار سلامت ہیں نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی — اک فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی
قتلِ اصغرؑ ہو مرا سر بھی جدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیرؑ ادا ہو جائے

یا خدا تجھ پہ ہیں صدقے مرا لشکر بھی نثار　　دل فدا جان فدا روح فدا گھر بھی نثار
علی اصغرؑ بھی نثار اور علی اکبرؑ بھی نثار　　تجھ پہ باقرؑ بھی فدا عابد مضطر بھی نثار
میں نے جو کچھ تری درگاہ سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہیں اکبرؑ　　ہیں وہ عباسؑ دلاور وہ حسنؑ کا دلبر
ایک اک پیارے کو قربان کیا گن گن کر　　کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور
تم نے دولت بھی جو مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بار خدا　　ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطر عاشق جانباز ہے البتہ جدا　　اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پر تیغ رہے سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

سب مرے نور نظر قتل ہوئے پیش نگاہ　　بندے نے شکر کیا یا کہا انا للہ
جب کہ ہو مرضی معبود سے بندہ آگاہ　　پھر ستم پر ہوں ستم اور نہ کہے منہ سے آہ
آگے کہتا تھا نہ عریاں سر خواہر دیکھوں
پر جو تو خوش ہو تو زینبؑ کو کھلے سر دیکھوں

اک طرف قید رسن میں ہوں حرم بیچارے　　اک طرف آگ سے جلتے ہوں یہ خیمے سارے
اک طرف شمر سکینہؑ کو طمانچے مارے　　ظلم یہ کنبے پہ ہوں اور کرم دل میں نظارے
جب کہیں آل نبی مجھ سے کہ امداد کرو
میں کہوں ان سے کہ اللہ کو تم یاد کرو

قتل اکبرؑ تو مرا ہو چکا اے رب غفور　　اب اگر تجھ کو نہ ہو نسل امامت منظور

قتلِ عابدؑ کو کروں آپ ہیں بانوؑ کے حضور　　ہیں خلیل اللہ وہ ذبیح آج سے ہوئیں مشہور
ہاتھ رک جائے گلے پر تو قلم ہاتھ کروں
ہاتھ سے ذبح کروں لب سے مناجات کروں

تین دن تڑپا ہیاں پیاس کی شدت سے حسینؑ　　اب ہو سیراب ترے قلزمِ رحمت سے حسینؑ
ڈر نہ جائے ملک الموت کی دہشت سے حسینؑ　　یا خدا کانپتا ہے قبر کی وحشت سے حسینؑ
آج تک ساتھ رہا بیٹے کا اور بھائیؑ کا
سخت اندیشہ ہے اب قبر کی تنہائیؑ کا

ناگہاں آئی یہ آوازِ خدائے کونین　　بس مرے بندۂ بیکس مرے مظلوم حسینؑ
عجز وہ آج تو کرتا ہے بصد شیون و شین　　مجھ کو شرم آتی ہے اے فاطمہؑ کے نورِ عین
شکر لب پہ ہے نہیں کام لبِ دریا سے
آفریں اے مرے چوبیس پہر کے پیاسے

اے حسینؑ اپنی ہی قدرت کی ہیں کھاتا ہوں قسم　　تیرے غمخواروں کو محشر میں نہ کچھ ہوئیگا غم
سختیٔ موت غلاموں پہ ترے ہوئے گی کم　　قبر ہے ہر تعزیہ داروں کی ترے باغِ ارم
تو عبث موت کی سختی سے ہراساں ہے حسینؑ
ملک الموت ترا تابعِ فرماں ہے حسینؑ

تو نے خوش آج کے دن خالقِ اکبر کو کیا　　وعدہ اپنا تھا مگر نذر بہتّر کو کیا
مرحبا ہم سے نہ پیارا علی اکبرؑ کو کیا　　پیشکش کیلئے تجویز اب اصغرؑ کو کیا
نذر مقبول ہے آؤ ہمیں دے جاؤ حسینؑ
میرے دربار سے جو چاہو وہ لیجاؤ حسینؑ

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ　　چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے   موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک   ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

خیالِ چہرۂ شہ وقتِ خواب رہتا ہے   تمام شب مرے گھر آفتاب رہتا ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے   کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے

قمر حسیں ہے مگر تجھ سا خوش جمال نہیں   یہ رُو نہیں ہے یہ ابرو نہیں یہ خال نہیں
چمن میں آکے شگوفہ یہ کس نے چھوڑ دیا   کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے   یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

تلوار کی تعریف

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی   سیکڑوں خون کئے اور کہیں آئی نہ گئی

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو   سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں   مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ؑ ہوں

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی بری تھی　　برچھی تھی کٹاری تھی سروہی تھی چھری تھی

قمریاں حق کی عبادت لب جو کرتی ہیں　　ڈالیاں نہریں جھک جھک کے وضو کرتی ہیں

پہ جم خم کا جدا رنگ تھا کس بل کا جدا رنگ　　لب سرخ دہن صاف بدن گول ہرا رنگ

مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا　　گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں　　دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں

اپنے کیسہ سے نہ دام اور نہ درم دیتے ہیں　　جب وہ خالق نہیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر　　مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو　　خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو
سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو　　ہم آسمان سے لاتے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے　　چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
نگار رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
دہان کیسۂ زر بند کر پر اے منعم　　خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو
خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے ان آبگینوں کو

تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے ... ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
سرمہ ہے زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کیلئے ... زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

لہجہ سنو زبانِ فصاحت نواز کا ... تارِ نفس میں سوز ہے فطرت کے ساز کا

لٹ پٹے پیچ عمامے کے انوکھی دستار ... آمرے بانکے سپاہی تری ہیئت کے نثار

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی ... جگہ جس جگہ مل گئی پڑ رہے
وہ ہے آدمی جس سے ہو کارِ خیر ... بشر وہ جو دنیا میں بے شر رہے
جنازہ اٹھانا ہے احباب کو ... مناسب ہے گر جسم لاغر رہے
نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز (انیس) ... فقیری میں بھی دل تونگر رہے

اک در پہ بیٹھ رہے توکل کریم پر ... اللہ کے فقیر کو پھیرا نہ چاہیئے
پانی کا ذکر کرتی سکینہؑ تو کہتے شاہ ... بی بی محال شے کی تمنا نہ چاہیئے

داغؔ

نواب مرزا خاں۔ تخلص داغؔ۔ شادی کے بعد نواب مرزا مشہور ہوئے۔ خطابات فصیح الملک بلبلِ ہندوستان اور جہاں استاد وغیرہ۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ بروز چہارشنبہ دو بجے دن کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ نواب شمس الدین خاں (خاندان لوہارو) کے صاحبزادہ تھے۔ چھ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کی والدہ چھوٹی بیگم بعض روایتوں کے مطابق نواب شمس الدین احمد خاں کی سرکار میں ملازم تھیں۔ بعض کے مطابق ان کی بیاہتا بیوی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد داغؔ کی والدہ نے شہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) سے نکاح کر لیا۔ اور "شوکت محل" کا خطاب پایا۔ انہیں اسباب کی بنا پر داغؔ کی تعلیم و تربیت لال قلعہ میں ہوئی۔ شاعری میں ذوقؔ کے شاگرد ہوئے ۱۸۵۲ء میں جب مرزا فخرو کا انتقال ہوا تو داغؔ کو لال قلعہ چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا جس کے بعد داغؔ رامپور چلے گئے۔ وہاں نواب کلب علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی لیکن ان کا بھی جب انتقال ہو گیا تو داغؔ نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا جہاں خسرو دکن میر محبوب علی خاں نے بھی شورہ سخن سے بہت اعزاز بخشا۔ دادِ سخن ملتی رہی۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو داغؔ نے انتقال کیا۔

اُن کی تصانیف "گلزار داغ"۔ "آفتاب داغ"۔ "ماہتاب داغ"۔ "یادگار داغ"۔ "ضمیمہ یادگار داغ" اور "مثنوی فریاد داغ" جو کلکتہ کی منی بائی حجاب کے عشق میں لکھی تھی۔ ان کے علاوہ نثر میں مجموعہ "انشائے داغ" بھی ہے۔

ردیف الف

بتوں نے ہوش سنبھالا جہاں، غرور آیا　　بڑے دماغ، بڑے ناز سے شعور آیا

آدمی ہو صفات کا پورا　　قدر ہوتی ہے دین و دنیا میں

جاؤ بھی ہم سے کیا کرو گے وفا؟   بارہا آزما کے دیکھ لیا!

شکر ہے داغ کامیاب ہوا   حق تعالیٰ بھلا کرے سب کا

تھی نہ تاب ستم تو حضرتِ دل   عاشقی کو سلام کرتا تھا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا   تمام رات قیامت کا انتظار کیا

جان جاتی دکھائی دیتی ہے   ان کا آنا نظر نہیں آتا

پھر بلایا پھر کہا اور پھر اُسے رخصت کیا   نامہ بر جب حسرتوں کا میری دفتر لے چلا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام   تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

دلِ پُر اضطراب نے مارا   اسی خانہ خراب نے مارا

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا   وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
آپ کی بزم میں سب کچھ ہے مگر داغ نہیں   ہم کو وہ خانہ خراب آج بہت یاد آیا!

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے   نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

کی ترکِ مے تو مائلِ پندار ہو گیا — میں توبہ کر کے اور گنہگار ہو گیا

ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا — پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
زلف خالی ہاتھ خالی کس جگہ ڈھونڈیں اُسے — تم نے دل لے کے کہاں اے بندہ پرور رکھ دیا
داغؔ کی شامت جو آئی اضطرابِ شوق میں — حالِ دل کمبخت نے سب اُن کے منہ پر رکھ دیا

کیونکر اب اس نگہِ ناز سے جینا ہو گا — زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

میں ہر طرح سے موردِ الزام ہو گیا — تقصیر کی کسی نے مرا نام ہو گیا
عاشق کے ضعفِ قلب کی کچھ انتہا نہیں — گویا وہ اس زمانے کا اسلام ہو گیا
بگڑے وہ مجھ کو دیکھ کے محفل میں اس طرح — گویا قیامت آ گئی! کہرام ہو گیا
دُنیا میں داغؔ صاحبِ اعزاز ہے تو ہو — وہ آپ کا تو بندۂ بے دام ہو گیا

ردیف ت

شام ہونے تو دو چلے جانا — ہے ابھی تیز آفتاب بہت

ردیف س

سانس بیتاب قدم تیز پریشان نظر — آئے ہو کیا طرفِ گورِ غریباں ہو کر؟

ردیف ٹ

چوٹ کھانا دلِ حزیں نہ کہیں — درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں

داغ پھرتا کے جھانک کرتے ہیں
اب گرے اب چھپنے کہیں نہ کہیں

تم کو بیمار محبت سے بھی عار آتی ہے
ہم تو اچھوں کے لئے روز دعا کرتے ہیں

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اسمیں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

دم نہیں دل نہیں ، دماغ نہیں
کوئی دیکھے تو اب وہ داغ نہیں
دلِ بے مدعا خدا نے دیا
اب کسی شے کی احتیاج نہیں

سو جہنم ہے اک تری رنجش
اسے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

حضرتِ دل آپ ہیں کس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطفِ سوز و گداز کیا جانیں؟
کب کسی در پہ جبہ سائی کی؟
شیخ صاحب نماز کیا جانیں؟
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں!
پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں!
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے　　خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں　　اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں　　جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں　　جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

ردیف ہ

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ　　بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی　　اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

ردیف ی

کمبخت وہی داغ نہ ہو دیکھیو کوئی　　بیچین کئے دیتی ہے فریاد کسی کی

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی　　اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی　　ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

ردیف ے

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے　　مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے پر انھیں شرمسار کون کرے
داغ کی شکل دیکھ کر بولے ایسی صورت کو پیار کون کرے

میری فریاد دوسرا نہ سنے تم سنو اسے بتو خدا نہ سنے

آپ شرمائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

دیا دل نے مایوس ہو کر جواب نہیں داغ اب کوئی حسرت نہیں ہے

گزرگاہِ ارمان و حسرت رہا دل گزرتے رہے کارواں کیسے کیسے
وطن سے چلے داغ جب ہم دکن کو چھٹے اہلِ ہندوستاں کیسے کیسے

عرضِ احوال کو گلہ سمجھے کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے

دل کو کیا ہو گیا خدا جانے کیوں ہے ایسا اداس کیا جانے
اس تجاہل کا کیا ٹھکانا ہے جان کر جو نہ مدعا جانے
کہہ دیا میں نے رازِ دل اپنا اس کو تم جانو یا خدا جانے
کیا غرض۔ کیوں ادھر توجہ ہو حالِ دل آپ کی بلا جانے
جانتے جانتے ہی جانے گا مجھ میں کیا ہے ابھی وہ کیا جانے
کیا ہم اس بدگماں سے بات کریں جو ستائش کو بھی گلا جانے

تم نہ پاؤ گے سادہ دل مجھ سا　　جو تغافل کو بھی حیا جانے
نہیں کوتاہ دامنِ امید　　آگے اب دستِ نارسا جانے

کبھی دیکھا ہے اتنا داغ کو خوش؟　　چلے آتے ہیں یہ حضرت وہیں سے!

داغ کہتے ہیں جنھیں دیکھئے وہ بیٹھے ہیں　　آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے
غنچۂ گل میں دھرا کیا ہے بتا اے بلبل　　جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

داغ کو دیکھ کے بولے — یہ شخص　　آپ ہی آپ جلا جاتا ہے

دل میں عاشق کے تصور سے کھٹک ہوتی ہے　　ان حسینوں کی غضب نوک پلک ہوتی ہے

کہتے ہو کچھ کہو۔ کہوں کیا خاک؟　　جانتا ہوں مزاج برہم ہے

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا　　پھر جہنم کو کیا دیا تو نے؟

بے نیازی کی کچھ آخر حد بھی ہے　　گردنِ تسلیم کب تک خم رہے؟

انھیں نفرت ہوئی سارے جہاں سے　　نئی دنیا کوئی لائے کہاں سے؟

ہمت کو ہارنا نہ مصیبت میں چاہئے　　تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہئے

دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے — راحت میں ایک، ایک مصیبت میں چاہیئے
کچھ لاگ کچھ لگاؤ محبت میں چاہیئے — دونوں طرح کا رنگ طبیعت میں چاہیئے

آپ کا اعتبار کون کرے — روز کا انتظار کون کرے؟!

آپ کیا سمجھیں آپ کیا جانیں — کیوں کوئی بیقرار ہوتا ہے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

دل تنگ سہی پر اے تمنّا — مر رہنے کو مکاں بہت ہے

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں — کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں
ہزاروں حسرتیں وہ ہیں جو روکے سے نہیں رکتیں — بہت ارمان ایسے ہیں جو دل کے دل میں رہتے ہیں

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے — رنج بھی ایسے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی — تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

صفی لکھنوی

علی نقی نام صفی تخلص۔ سادات زیدی سے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ محکمہ دیوانی میں مختلف عہدوں پر رہے۔ چالیس سال کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ تھوڑا عرصہ ہوا فوت ہوئے۔ اُن کی چند قومی نظموں کا مجموعہ "لختِ جگر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ردیف الف

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا!

فصلِ گل، فصل خزاں دونوں گئیں اے صیاد مرغِ دل کون سے موسم میں رہا ہووے گا

زندگی نام اسی کا ہے اگر غور کرو مشکلیں پیش جو آئیں انھیں آسان کرنا
دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ رُخ ادھر بھی کبھی اے عمر گریزاں کرنا
جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

شیخ! کلبہ سے اٹھ نکل باہر گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا

جتنا جو حق پسند ہو گا اُتنا درجہ بلند ہو گا

ردیف ن

آتے ہیں خیالوں میں نگاہوں میں دلوں میں اور اس پہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم پردہ نشیں ہیں

ردیف "ے"

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

دل جب نہ پریشاں ہو جمعیتِ ساماں ہے
ہر غنچۂ نو رکس کی مٹھی میں گلستاں ہے

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کا نشاں دیکھا کئے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

سادگی کی انتہا کر دی عزیزانِ چمن
عمر بھر رنگِ مزاجِ باغباں دیکھا کئے

ادھر شانوں میں کنگھی ہو رہی ہے خم نکلتا ہے
ادھر رگ رگ سے کھنچ کھنچ کر ہمارا دم نکلتا ہے

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے دکھ جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو الجھن یہ الجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ ان کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رخ آئینۂ بیتابیٔ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیونکر عمزدوں کا دم نکلتا ہے

پیری کی صبح ہاتھ میں آئینہ لے کے ہم
رخ پر شکستِ دل کا اثر دیکھتے رہے

ایک ہنگامۂ محفل ہو تو اس کو روؤں
سیکڑوں باتوں کا رہ رہ کے خیال آتا ہے

ستم کش آپ کے اس ڈر سے زہر کھا نہ سکے
یہی کہے گا زمانہ کہ ناز اٹھا نہ سکے

اگرچہ میرا مٹانا ہی تم کو ہے منظور — تو یوں مٹاؤ کہ پھر آسماں مٹا نہ سکے
یہ خفتگانِ لحد! کس بلا کی نیندیں ہیں — تمہیں پکار کے ہم تھک گئے جگا نہ سکے

ایک سرگشتہ ہے گردابِ محیطِ آب میں — خندہ زن خمیازہ کش بالائے ساحل ایک ہے
بزمِ حسن اور اختلاف اتنا مذاقِ عشق کا — ہم تنِ تنہا صفی محفل کی محفل ایک ہے

دیکھو تم بھی مزارِ کشتگانِ ضبطِ غم — آنکھیں آنسو بھرے شمعِ لحد خاموش ہے

دیکھیو یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام — قدمِ سعی اب سرحدِ آغاز میں ہے

★

پیارے صاحب رشید

نام سید مصطفےٰ میرزا عرف پیارے صاحب رشید تخلص رشید۔ سن ولادت ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ یوم تاجپوشی واجد علی شاہ بہادر شاہِ اودھ روز دوشنبہ۔ والد کا نام احمد میرزا صاحب صابر۔ دادا ان کے سید محمد میرزا صاحب انس تھے۔ حضرتِ رشید خاندانی شاعر تھے بلکہ ننہال اور ددھیال دونوں طرف سے شاعری ان کی میراث تھی۔ ددھیال کے لوگ عشق اور تعشق وغیرہ غزل گوئی میں شہرۂ آفاق اور ننہال کے افراد میر انیس وغیرہ مرثیہ گوئی میں طاق تھے۔

پہلے اپنے چچا عشق کی شاگردی اختیار کی۔ پھر ان کے انتقال کے بعد حضرتِ تعشق سے کچھ دن اصلاح لی۔ دنیائے مرثیہ گوئی میں وہ نام پیدا کیا کہ صاحبِ فن آج تک ان کا کلمہ پڑھتے ہیں

ان کی شاعری سے لوگ اس قدر متاثر تھے، کہتے تھے کہ کوثر سے دھوئی ہوئی زبان ہے۔ علاوہ اس کے ان کو مستند استاد بھی مان لیا تھا۔ اسی بنا پر خود رشید نے فرمایا ہے ع

مُستند ہوں کہ ملی عشق کی منزل مجھ کو

حیدرآباد دکن میں بڑی شہرت حاصل کی۔ آخر کار ۲۶۔ ذیلقعدہ ۱۳۳۶ھ روز چہارشنبہ مرض فالج میں مبتلا ہو کر رحلت کی اور زیریں مسجد باغِ عشق دفن کئے گئے۔

ان کا دیوان غزلیات "گلستانِ رشید" کے نام سے چھپا ہے۔ مرثیے بھی مشہور ہیں۔

ردیف الف

اے حضرتِ دل آنے لگی یادِ جوانی — ہر بار نہ افسانہ بیاں کیجیے واں کا
سر خم ہے نگہ آنکھ مرے دل کی طرف ہے — سیکھا ہے یہ انداز نیا حسنِ طلب کا

تیز کرتا ہے چھری قصد اور ہے صیاد کا — اے اسیرانِ قفس وقت آگیا فریاد کا
شوق اسیری کا ہے بلبل کو تصور ہی سہی — بند ہیں آنکھیں نظر آتا ہے گھر صیاد کا
ہمصفیروں کی طرح سے چھوٹ کر گیا جاؤں باغ — میں ہوں پروانہ چراغِ خانۂ صیاد کا

وہ بعد میرے کرتے ہیں الفت کا میری ذکر — جو راز تھا کبھی وہ اب افسانہ ہوگیا

پاکے بے مہر انھیں بے سروساماں نکلا — کوچۂ زلف سے دل ہو کے پریشاں نکلا
بامِ پر شب کو جو سرکی رُخِ روشن سے نقاب — کاٹ کے راہ اُدھر سے مہِ تاباں نکلا
کس قدر جلد ہمیں بھول گئے اہلِ وطن — کوئی ہو کے نہ سوئے گورِ غریباں نکلا

دل ہمارا جانبِ زلفِ سیہ فام آئے گا — یہ مسافر آج منزل پر سرِ شام آئے گا

گو بُرا ہے دل مگر رہتے دیا ہے اس لئے — عشق کی خو گر طبیعت ہے کبھی کام آئے گا

بڑھ گیا عشق سرِ زلف گیا دل میرا — لٹ گیا قافلہ آ کر سرِ منزل میرا

مل چکے مسی تو چمکے اور دنداں یار کے — شام سے شہرِ خموشاں میں چراغاں ہو گیا
یاد آیا میکہ تھا گلزار کوچہ آپ کا — جب سے قبریں بن گئیں گورِ غریباں ہو گیا

آج آبادیٔ دل پر ہے ناز — دیکھنا! کل یہی صحرا ہو گا
اُن کے موہنہ پر ہے ہنسی آنیکو — موجزن حسن کا دریا ہو گا
دو گھڑی بیٹھیں گے ہم تم یکجا — کبھی ایسا بھی زمانہ ہو گا

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے؟ — پہلو میں ہمارے دلِ مضطر نہیں ملتا؟

گئے دوست میں ناتواں رہ گیا — مسافر پسِ کارواں رہ گیا
چمن سے گئی سب کو لے کر بہار — اکیلا فقط باغباں رہ گیا
ہوئی وصل کی شب تمام اتنی جلد — مؤذن کو شوقِ اذاں رہ گیا
قضا نے سبھوں کے بھرے جامِ عمر — نہ ساقی نہ پیرِ مغاں رہ گیا
ہماری سی کوئی اطاعت کرے — وہیں رہ گئے دل جہاں رہ گیا
رہا کیا جو بلبل چمن سے گئی — اک اُجڑا ہوا آشیاں رہ گیا

جاؤں گا کہیں اور تو کیا لوگ کہیں گے — اے بادشہِ حسن گدا ہوں ترے در کا

ختم زینت ہوگئی مشاطہ نے لے لیں بلائیں — گیسوئے پُرخم نے چومے شانہ و بازوئے دوست
امتحاں قوت کا ہے تلوار اٹھائی جاتی ہے — اب تو اس قابل ہوئے ہیں پنجۂ و بازوئے دوست

ردیف ن

جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں — آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں
کیا خبر بزم سے کتنے گئے، کتنے آئے — میں اُدھر دیکھ رہا ہوں وہ جدھر بیٹھے ہیں
فقر کی شان یہ ہے اور فقیری کا ادب — بادشہ تختِ حکومت سے اُتر بیٹھے ہیں
بام سے سایہ اترتا نہیں یہ ضد دیکھا — ہم جو دیوار پہ رکھے ہوئے سر بیٹھے ہیں
میں نے کیوں بزم میں اُلفت کی نظر سے دیکھا — وہ سراپا عرقِ شرم میں تر بیٹھے ہیں
ظلمِ صیاد نے پرواز سے مایوس کیا — فکر میں سامنے رکھے ہوئے پر بیٹھے ہیں
حیف! اُس وعدہ فراموش نے آرام کیا — منتظر شام سے کھوئے ہوئے در بیٹھے ہیں
اے رشیدؔ اس نے لگائی ہے کمر میں تلوار — ہم بھی باندھے ہوئے مرنے پہ کمر بیٹھے ہیں

گردشِ چشم ہے پیمانے میں — تم گئے ہو کبھی میخانے میں

ٹھہر جا دید کے ارماں دلِ مضطر نکلتے ہیں — کھڑے ہیں منتظر ہم گھر سے وہ باہر نکلتے ہیں
جوانی سے تکلف بڑھ گیا ہے میرے ساقی کا — شرابِ کہنہ آئی ہے نئے ساغر نکلتے ہیں
ہوا ہے سخت مشکل دفن ہونا تیرے وحشی کا — جہاں پر قبر کھودی جاتی ہے پتھر نکلتے ہیں
بہار آئی مبارک عاشق و معشوق کو ملنا — کہ کلیاں پھوٹتی ہیں بلبلوں کے پر نکلتے ہیں
نظر کے خوف سے کتری گئی ہیں ان کی واں پلکیں — مری رگ رگ سے یاں ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں
کروں کیونکر نہ تعظیم آپکی میں جو لائے خط اس کا — کہ اکثر ایسے ہی لوگوں میں پیغمبر نکلتے ہیں
قفس میں ہمصفیران چمن کیوں چھوڑے جاتے ہو؟ — زرا دو دن ٹھہر جاؤ ہمارے پر نکلتے ہیں

رشید آغازِ الفت سے کہیں انجام بہتر ہے ۔ کہ بحرِ عشق کے ڈوبے لب کوثر نکلتے ہیں

ردیف و

باغ میں جگنو چمکتے ہیں جو پیارے رات کو ۔ یاد آتے ہیں ان آنکھوں کے اشارے رات کو
دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے ۔ رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

ردیف ی

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی ۔ موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی
زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے ۔ مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی
بڑھ چکا قد بھی فروغِ حسن کی حد ہو چکی ۔ اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپ کی

نظر میں خانۂ صیاد بھی ہے گلشن بھی ۔ کہ ہم کو یاد قفس بھی ہے اور نشیمن بھی
چمن میں تھیں مجھے ساری اذیتیں راحت ۔ بہشت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے ۔ کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

تیرے سودائیوں نے رحلت کی ۔ ہو گئی سُونی گلی محبت کی
آپ اک بے وفا سے جا کے ملے ۔ حضرتِ دل! یہ کیا قیامت کی؟!

ردیف ے

شروع اہلِ محبت کے امتحان ہوئے ۔ اب ان کو ناز ہوا ہے کہ ہم جوان ہوئے

قبر میں سب سے زیادہ ہے یہ اے جان تکلیف ۔ تم سے جاتی رہی اُمیدِ ملاقات مجھے

واعظو! صحبتِ حورانِ جناں رہنے دو — یاد آئیگی وہاں بزمِ خرابات مجھے

دامِ گیسو سے جو چھوٹے تو گزر جائیں گے — عاشقِ زلف اسی رات کو مر جائیں گے
وہ نہاتے ہیں تو کہتے ہیں بگڑ کر گیسو — چھوڑ دیجئے چھوڑ دیجئے ہم آپ سنور جائیں گے
اب تو بیعقلہ سمجھتے ہو خفا رہتے ہو — جانِ جاں یاد کرو گے جو گزر جائیں گے

ہر اک طرف ہے باغ میں آئی ہوئی بہار — کب چھوٹتے ہیں تازہ گرفتار دیکھئے!

امتحاں حسرتِ پرواز کا منظور ہوا — ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیئے

سیئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے — تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
اور بگڑیں گے مزاج آپ کے دیوانوں کے — آج در بند کیے جاتے ہیں زندانوں کے
شام سے وصل میں کہتے ہیں ستانے کے لئے — موتی ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں مرے کانوں کے
وحشیوں کا تربتے اپنا تو بیتہ ملتا ہے — استخواں دیکھے ہیں گوشوں میں بیابانوں کے
شاعروں کے لئے توہین کا باعث ہو رشیک — تم نہ بیٹھا کرو مجمع میں سخندانوں کے

کبھی آہستہ کبھی تیز ہوا چلتی ہے — اسی موسم میں جنوں خیز ہوا چلتی ہے

داغِ دل گھٹ رہے ہیں پیری میں — بجھ رہے ہیں چراغ محفل کے

منہ نقابوں سے ہیں سب اہلِ حیا کھولے ہوئے — گل ہوا کھا رہے ہیں بندِ قبا کھولے ہوئے

دل پہ قابو نہیں بیتاب نظر آتی ہیں
بلبلیں شاخوں پہ جا جا کے اُتر آتی ہیں

انتخاب از مرثیہ

یا حسینؑ ابن علی آپ کا ذاکر ہوں میں

نکلے خیمے سے سلح جو شہنشاہِ عرب
بعد تسلیم پھرے گرد تمام اہل عرب
اٹھے سجادوں سے تیغیں لئے انصاری سب
شاہ کے ساتھ بڑھے سیر کو وہ پیش و عقب
سب ہنسنے آئی نظر ایسی فضا مقتل میں
گلشنِ فاطمہؑ کے پھول کھلے جنگل میں

وہ سماں صبح کا اور جانوروں کا وہ غل
پھول جو کھل رہے ہیں نغمہ سرا ہے بلبل
جب ہوا آئی جھٹکنے لگا زلفیں سنبل
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیم اور ہیں ڈوبے ہوئے گل
وہ ہوا دشت میں آئی کہ چمن پھول گئے
پیاس دو روز کی سب غنچہ دہن بھول گئے

ایسی مستانہ روش باد بہاری آئی
اُلجھے پھولوں میں قدم سبزہ میں ٹھوکر کھائی
آنکھ نرگس کی کھلی باغ میں آہٹ پائی
شاخیں جھومیں کہ ہر اک نخل نے لی انگڑائی
بلبل اس درجہ ہوئی شاد کہ چلانے لگی
سبزہ لہرانے لگا نہر میں موج آنے لگی

کچھ عجب صورتیں میں غنچوں کی بھولی بھولی
جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
منع بلبل نے کیا چیز کسی نے جو لی
بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی
بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زباں کھل جائے

گل و بلبل میں جو باتیں ہیں ذرا گرما گرم | آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اللہ ری شرم
اس قدر باد بہاری نے کیا ہے آزرم | خواب مخمل کی طرح ہو گئے ہیں کانٹے نرم
پھل ملا بلبل ناداں کو شکیبائی کا
پھول ہے داغِ جگر لالۂ صحرائی کا

جب سنی پائے نسیم سحری کی آہٹ | اٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ
ہر طرف کھلنے لگے باغ میں غنچے چٹ پٹ | اٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگھٹ
دل کھلے فصلِ گزشتہ کا تاسّف نہ رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلّف نہ رہا

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی | کی نظر باغ پہ صحرا کی فضا آنے لگی
غنچے گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی | ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی
بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زلفیں ہلنے لگیں دامانِ قبا اڑنے لگے

بزم میں دیکھ کے اندازِ کرم بیٹھ گئے | ذوق پینے کا جنھیں تھا وہ بہم بیٹھ گئے
شوق میں چوم کے ساقی کے قدم بیٹھ گئے | ایک گوشے کی طرف کہہ کے یہ ہم بیٹھ گئے
جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں
آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں!

ساقیا حد کا گنہ گار ہے یہ عبدِ ذلیل | سچ کہوں خلد میں جانے کی نہ تھی کوئی سبیل
مے الفت تری پائی گئی بخشش کی دلیل | آئے تھے غصے میں بالیں پہ مرے عزرائیل
پینے والا ہے مرے ساتھ کا یہ جان گئے

مونہہ مرا دیکھتے ہی ہنس دیئے پہچان گئے

ہیں بر میں صبر کو شر خوشخے لئے ہوئے جاتا ہے دل کو تیرِ سر پہلو لئے ہوئے

میر مونس

ردیف الف

آتی ہے چمن میں مرے گلرو کی سواری اے بادِ صبا خاک اڑانا نہیں اچھا
مونسؔ کی ابھی آنکھ گلستاں میں لگی ہے اے بلبلو یہ شور مچانا نہیں اچھا
ہو جائے گا سودا مری زلفیں نہ سنوارو ہوشیار کو دیوانہ بنانا نہیں اچھا

ردیف ر

بڑی خوشی ہے کہ قاتل لقب ہو عالم میں کہو تو ہاتھ بھی رکھا نہ جائے خنجر پر
پُرنور آسماں تھا. منور تھے دشت و در مابینِ تخت و فوق ٹھہرتی نہ تھی نظر

ردیف ہ

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ
ملے آنا مجھے کیونکر تری محفل میں جانانہ مری صورت فقیرانہ ترا دربار شاہانہ
نبھے کیونکر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ وہ بے پروا میں سودائی وہ سنگیں دل میں دیوانہ
گزر یا رب گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ

میر انیس

۱۰-جمادی الاول سنہ ۱۳۰۲ھ میں ۹۵ برس کی عمر میں انیس نے وفات پائی۔

ردیف ن

رات بھر دل سے رہیں رنج و تعب کی باتیں
فرقتِ یار نے سنوائیں غضب کی باتیں

ردیف و

طول میں ہیں جو ترے قد کے برابر گیسو
کہیں برپا نہ کریں فتنۂ محشر گیسو

واہ ری مہر و وفا عاشقِ گیسو جو موا
پھر نہ چھوڑے کبھی اس شوخ نے رخ پر گیسو

ردیف ی

جان دی پر کی نہ منت اس ستم ایجاد کی
بد دعا مئی دیکھنا میرے دلِ ناشاد کی

اپنی الفت کا مآل اچھا نظر آتا نہیں
ان کو عادت بھولنے کی ہم کو عادت یاد کی

ردیف ے

رسا جو الفتِ زلفِ دراز ہو جائے
کمندِ بامِ حقیقت مجاز ہو جائے

مجھے لحد میں اتارو مجھے پڑھو تلقین
کہیں تو صحبتِ راز و نیاز ہو جائے

عطا ہو ضبط مجھے یا اجل سے کچھ کہہ دو
کوئی تو صورت اخفائے راز ہو جائے

غرض وفا و جفا سے نہیں وہ چال چلو
کہ مجھ میں غیر میں کچھ امتیاز ہو جائے

مرزا جعفر علی فصیح

سلام

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبے سے سنگِ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

زمین مقتل کی جھاڑنے کو بتول ۲ نکلی ہیں سر برہنہ
شمیم گیسو سے کربلا کا تمام صحرا مہک رہا ہے

عمر بشوقِ حکومت رَے ہوا ہے آلِ نبی کا دشمن
سرابِ دولت نے کی خرابی کہ مست ہو کر بہک رہا ہے

گھرے ہیں بادل سے شام کے دَل کھنچی ہے حیدرؑ کی سیف براں
فلک پہ بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے

جب حسینی فوج نے باندھا پرا ہو کر بہم
لشکرِ کفار کے آگے لگے بڑھنے علم
دونوں جانب سے ہوئیں یکدست تلواریں بہم
غازیوں کے دمبدم آگے ہی بڑھتے تھے قدم
کھاتے تھے سینے پہ نیزہ موت کا سامان تھا
صبحدم سے دوپہر ڈھلنے تلک گھمسان تھا
تشنہ کامی سے شجاعانِ عرب تنگ ہوئے
داڑھیاں منہ میں لے مستعدِ جنگ ہوئے
چہرے کملائے ہوئے دھوپ میں گلرنگ ہوئے
دیکھ کر غازیوں کو اہلِ عرب تنگ ہوئے
کہتے تھے لشکرِ اسلام ادھر آتا ہے
ایک سے ایک جواں خوب نظر آتا ہے

انتخاب از مرثیہ

رن میں جس دم صبحِ عاشورہ عیاں ہونے لگی — لشکرِ شاہِ شہیداں میں اذاں ہونے لگی
اُس طرف تدبیرِ قتلِ بیکساں ہونے لگی — یاں نمازیں اور کمربندی وہاں ہونے لگی
طبلِ جنگی کی صدا جس دم سنی معصوم نے
تب لگے تلوار کا حیدرؑ کی قبضہ چومنے

غازیوں نے اٹھ کے باندھا زین گھوڑے کو کسا — اسلحہ سجنے لگا ہر اک جوان مہ لقا
جمع ہو کر سامنے شبیرؑ کے باندھا پرا — اپنے مولا سیّدِ مظلوم کو مجرا کیا
لے کے مجرا آخری ہر اک رفیق و یار کا
پھر ہوا سوار بیٹا حیدرِؑ کرّار کا

کیا سواری کا کروں شبیرؑ کے عالم بیاں — ہاتھ میں عباسِؑ غازی کے تھا لشکر کا نشاں
دستِ راست اکبرِ علی اور دستِ چپ قاسم رواں — پیش و پس سارے عزیز اور بیچ میں شاہِ زماں
اس طرح سرور کے تھے غازی وہ سارے آس پاس
چاند کے جیسے نکلتے ہیں ستارے آس پاس

اکبرِ مظلوم کی سج کا کروں میں کیا بیاں — شانِ حیدرؑ شوکتِ احمدؐ تھی چہرہ سے عیاں
قدِ موزوں بکھرے گیسو منہ پہ سبزہ کا نشاں — ہاتھ میں نیزہ کمر میں تیغ کاندھے پر نشاں
نرگسی آنکھوں سے موہنہ بابا کا ہر دم دیکھنا
مسکرا کر قبضۂ شمشیر پیہم دیکھنا

حالیؔ (پانی پتی)

خواجہ الطاف حسین نام۔ حالیؔ تخلص۔ ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ شاہِ بلبن کے زمانے میں ان کے آبا و اجداد ہرات سے آکر پانی پت میں مقیم ہوئے تھے۔ حالی ۹ سال کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ بھی ان کی بچپن ہی میں فوت ہوئیں۔ تعلیم کی غرض سے دلی چلے گئے۔ غدر کے بعد ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں ملازمت کر لی۔ ایک طرف غالبؔ کی شاگردی اختیار کی دوسری طرف نواب شیفتہ کی صحبت ملی۔ حالیؔ کو چار چاند لگ گئے۔ کافی شہرت حاصل کی۔

نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد ۱۸۷۲ء میں لاہور چلے آئے اور محکمۂ تعلیم میں نائب مترجم مقرر ہو گئے۔ انگریزی سے اردو ترجمے میں اصلاح کرتے کرتے حالی کی انگریزی کی قابلیت اتنی بڑھ گئی کہ چار سال کے بعد دہلی واپس جا کر اینگلو عربک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ بیچ میں ایک مرتبہ پھر حیفیس کالج میں ملازمت کر لی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد دہلی واپس چلے گئے۔ اور وہی پرانی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۹ء اگست میں آخری بار ملازمت کو خیرباد کہا اور پانی پت چلے گئے۔ حیدرآباد سے پنشن ملتی رہی۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔

حالیؔ کا کلام جس میں مسدس، غزلیں اور نثر وغیرہ سب ہی کچھ ہے ان کی یادگار ہے۔

ردیف الف

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائیگا ۔۔۔ سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا ۔۔۔ دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

ملتے ہی انکے بھول گئیں کلفتیں تمام جیسے ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمّل کی ورنہ اب وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

مذہب کو توڑ ڈالا کافر بنا کر اسلام ۔ مولوی ممنون ہے تمہارا

ردیف ت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت!
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اُن کے جانے سے ہوئی اور ہی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت!
کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت
شوق میں اس کے مزہ درد میں اس کے لذت ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت — یہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت
جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بیکل — وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت
غمِ دل نے رسوا کیا ہم کو آخر — بنائی بہت شادمانی کی صورت
ہے اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا — ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت
سمجھ کر کرو قتل حالیؔ کو دیکھو — مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ردیف ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ — دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
رچ رہی ہے کان میں یاں لے وہی — اور مغنّی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ
دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں — ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اچاٹ

ردیف ث

کھیتیاں جل کر ہوئیں یاروں کی خاک — ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

ردیف ج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

تلخیٔ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج — یہ بھی یارو کوئی رنجوں میں ہے رنج
ہم کو بھی آتا تھا ہنستا بولنا — جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج

ردیف ر

جو قناعت کے ہیں حالیؔ میہماں — ایسے یاروں سے حذر! یارو حذر!

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور ؟

ردیف ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

ردیف ز

پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز جھونکا نسیم مصر کا آیا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کس نشے میں ہے چور خدا جانے اس قدر حالیؔ نے جام مونہہ سے لگایا نہیں ہنوز

ردیف س

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں اے آسیائے گردش لیل و نہار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی حالیؔ نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ردیف ص

قافلے گزریں وہاں کیونکر سلامت واعظ ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

ردیف ط

دل سے خوشیاں ہو گئیں اب گوشہ گیر نام تھا شاید جوانی کا نشاط
زینۂ مسجد ہے لغزش کی جگہ جانیو واعظ اسے راہِ صراط

ردیف ظ

نکل آئے گی میکشی کی بھی مہلت کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ

ردیف ع

اے بیاضِ صبح پیری السلام اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
السلام اے قاصدِ ملکِ بقا الوداع اے عمرِ فانی الوداع
آلگا حالیؔ کنارے پر جہاز الوداع اے زندگانی الوداع

ردیف ف

حق نہ ملّا نے کچھ بتایا صاف اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی پھر روشن نظر نہ آیا صاف
کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم صاف تھے آپ سب کو پایا صاف

ردیف ق

ہیں وفادار اور بھی لیکن ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

ردیف گ

روکئے بدخو کو بدخوئی سے کیوں آپ اپنی خو سے آجائے گا تنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

ردیف ن

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
قیس ہو کوہکن ہو یا حالیؔ — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید — جلتے جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں
اک یہاں جینے سے بیزار نہیں ہیں یارب — یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں — آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیت حزن — ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

کار احباب ساختن بتواں — دوستاں را نساختن بتواں

ردیف ہ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم — پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

ردیف ی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت　　ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

اسی مضمون کو کسی نے ہندی میں کہا ہے اور خوب کہا ہے

گلے بہیاں نہ ڈارو مورا جیارا ڈرائے"

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں　　رہ گئی شرم پارسائی کی

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بھلی اور بری سب گزر جائے گی　　یہ کشتی یونہیں پار اتر جائے گی

ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ　　ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا　　وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

جب کہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح　　وہ بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالِ انجام　　یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

ردیف ے

جب وقت پڑے، دیجئے دستک درِ دل پر　　جھکئے فقرا سے نہ جھکئے امرا سے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے　　کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے　　قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو!
وہ صرفِ تمنّا ہوا چاہتا ہے
بہت اُچین سے دن گزرتے ہیں حالیؔ
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے!!

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے
وقتِ رخصت تھا سخت حالیؔ پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

شیخ! یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے
توبہ ان کی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے
چارہ گر! کار زمانہ ازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقت دعا یاد رہے

لاہور کا خلاصہ

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
رہے لاہور میں آ کر سو جانے
یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل نا شناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ
نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول؟
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

علم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے

گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر الفت کہ اک رسمِ کہن ہے

بھلا حالیؔ اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر

گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام اکبرؔ تخلص۔ والد کا نام میر تفضل حسین۔ ۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے ضلع میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کوئی الہ آباد بتاتا ہے کوئی قصبہ داؤ دنگر ضلع گیا (صوبہ بہار) کہتا ہے۔ قمر بدایونی نے "بزم اکبر" میں ان کا سلسلہ نسب ساداتِ بارہہ سے ملایا تھا جس کو سید بشیر حسین صاحب نے علی گڑھ میگزین اکبر نمبر کی مفصل بحث سے غلط ثابت کر دیا۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم چونکہ اپنے والد کے زیر اثر ہوئی اس لئے طبیعت نے فلسفہ اور تصوف کا غلبہ اختیار کر لیا۔ انگریزی کی استعداد بعد میں خود پیدا کی۔ ۱۸۶۷ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا۔ اول آئے۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار ہو گئے۔ ایک سال کے بعد ہائی کورٹ میں مسل خواں مقرر ہو گئے۔ پھر ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا۔ منصف ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد سب ججی مل گئی۔ ۱۸۹۴ء میں سشن جج ہوئے۔ اور ۱۹۰۳ء میں پنشن ہو گئی۔ حکومت ہائی کورٹ کا جج مقرر کرنا چاہتی

تھی لیکن آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے وہ عہدہ قبول نہ کر سکے پنشن لے لی۔ خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ آخر کار ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء بمقام الہ آباد انتقال کیا۔ شاعری میں مولوی وحید الدین وحید (شاگرد مصحفی) کی شاگردی کی مگر در اصل اکبر کا رنگ بالکل نرالا اور مخصوص اپنا رنگ تھا۔

ردیف الف

طالب دنیا کو اکبر کس طرح سمجھوں میں خضر؟ خود جو گم ہے فکر میں، وہ رہنما کیونکر ہوا!

ترا دل تو ہمیشہ امرِ خاطر خواہ چاہے گا مگر ہو گا وہی اکبر کہ جو اللہ چاہے گا

اُسے اکبر ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

تمہیں بتائیں کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا

حکم انگلش کا، ملک ہندو کا اب خدا ہی ہے بھائی مسلو کا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی ترکِ خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

وہ شعلۂ شوق کا سینے میں مشتعل نہ رہا — تری نظر نہ رہی وہ، مرا وہ دل نہ رہا

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں — بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

آپ تصنیف شرائط کی نہ تکلیف کریں — مجھ کو خود ولولۂ عرضِ تمنا نہ رہا
اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے — عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اس کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

جہد یہ ہے کہ زمانے کو موافق کر لے — سب کو آتا ہے زمانے کے موافق ہونا

جس سے تھا خودداریٔ اربابِ حاجت کا نباہ — وہ سلیقہ تم سے لے اہلِ کرم جاتا رہا

جو اپنی زندگانی کو فقط اک امتحاں سمجھا — اسی نے راحت و تکلیف کا رازِ نہاں سمجھا

ذکرِ خدا کا ہو گا جس دل کو ذوق اکبر — وہ مطمئن رہے گا غم بھی اگر سہے گا

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا — آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو — سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے — ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

نگاہیں ہوں تو ویرانے میں بھی آبادیاں دیکھیں   اگر دل ہو تو ہر پہلو سے کر لے دل لگی پیدا

کھولا نفس مری ایامِ جوانی کے سوا   سب بتادونگا تمھیں افتد و دانی کے سوا

محفل ان کی ساقی ان کا   آنکھیں میری باقی اُن کا

اٹھانا پڑتے تھے دن رات بارِ الفتِ خوباں   جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

ردیف ت

قناعت نہیں ہے تو ایمان رخصت   عبادت نہیں تو مسلمان رخصت

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ   علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ

ردیف د

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کارِ ثواب   دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

ردیف ر

نازِ رس ظاہر طہارت پر نہ اے مغرور کر   حرصِ دنیا خود نجس ہے یہ نجاست دور کر

ہوائے نفس کے تابع ہیں جن کے جسم اے اکبر   انھیں کی روح رہتی ہے بدن میں مضمحل ہو کر

زیست بے وقعت ہوئی ہے میرے شوقِ زیست سے   موت حیراں ہے مرا مرنے سے ڈرنا دیکھ کر

اقبال پری آئی جو انداز بدل کر　　دنیا کی ہوا ساتھ ہوئی ساز بدل کر

مخالفت سے نہ باز آئے گی دنی دنیا　　فقط یہ زور سے دبتی ہے یاد رکھ یہ گُر
اُنھیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے　　اُنھیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

اچھا برا نہ کہہ وہ تم مذہبی بنا پر　　اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہے جوہر

ردیف ن

اس کے سوا کہ شکر کا موقع نہیں ملا　　مجھ کو شکایت ان سے کسی بات کی نہیں

سمجھ میں صاف آ جائے فصاحت اس کو کہتے ہیں　　اثر ہو سننے والے پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

مذہبی تلقین اور ایسے شدائد الاماں　　ایک نام حق کے ساتھ اتنے زوائد! الاماں!

بے بصر وہ ہیں جو بحثوں میں یہاں خورسند ہیں　　جن کی آنکھیں کھل گئیں ان کی زبانیں بند ہیں

مخالفین کو ہم کہہ تو دیتے ہیں کافر　　مگر یہ ڈرتے ہیں دل میں کہیں نہ کافر ہوں

دل کی خاطر تو ہے لازم تجھے بک جانا بھی　　صرف آنکھوں کا مزا ہو تو خریدار نہ بن
بُت پرستی میں بھی رکھ حسن کے پہلو پہ نظر　　ہار بن ۔ دَیر سے رشتہ ہو تو زنّار نہ بن
دل سے کہہ سکتے ہیں ہاں شمع بصیرت نہ بجھے　　وقت سے کہہ نہیں سکتے کہ شب تار نہ بن

بڑھانا شوق کا منظور ہے یا مضمحل کرنا   نزاکت کا جو مجھ سے اسقدر اظہار کرتے ہیں

علمِ دیں حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی   صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں
فتح و شکست پہ ہو نظر آپ کی تو ہو   اپنی تو دل لگی ہے فقط پاس فیل میں
وہی زندہ ہیں طاقت سے جو صرف عقل کرتے ہیں   ہماری زندگی کیا زندگی کی نقل کرتے ہیں

جس طرف اٹھ گئی ہیں ۔ آہیں ہیں   چشم بد دور ۔ کیا نگاہیں ہیں

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں   آدمی ۔ آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے   وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

وہ فقط وضع کے گشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور   بھینس کو گون پہنا دیجیے عاشق ہو جائیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں   داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں مگر عشوے دکھاتے ہیں   جو شخصی زندگی ہے اسکو یہ قومی بناتے ہیں

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں   جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں

شکوۂ بیداد کرتا ہوں تو کہتا ہے فلک   خود بخود مجھ سے ٹپکتی ہے جفا میں کیا کروں

فضل ہو اللہ کا ہوں جمع سالے سالیاں — وہ اچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں
لیمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف — عشرتی جھوما کریں بچے بجائیں تالیاں

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے — محل میں بیٹھ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

ردیف و

پھیر سکتی نہیں تقوے سے مجھے کوئی صدا — شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو ! — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

خوُ تحمل کی بہت خوب ہے لیکن انساں — ظلم کو ڈھونڈھ کے اس کا متحمل کیوں ہو

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو — ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو!

حدیث و فقہ پڑھ کر شیخ بننا خوب ہے لیکن — زمین و آسماں کو دیکھ کر پہلے مسلماں ہو

قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو — شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو — جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو

دنیا کو نہ کاغذ کی خبر میں دیکھو
اپنے فردا ہیں اپنے گھر میں دیکھو

اپنی محنت کو اپنا آنر سمجھو
اپنے پاؤں کو اپنا موٹر سمجھو

ہجر کی شب یوں نہیں کاٹو بھائیو!
ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو!

شوقِ آرام بجا شوقِ تعلق بیجا
طلبِ رزق ہو لیکن ہوسِ جاہ نہ ہو
یا قدم منزلِ یوسف میں نہ رکھ اے طالب
یا نہ کر شرط کہ واں گرگ نہ ہو چاہ نہ ہو
ہے اگر منزلِ راحت کی تلاش اے اکبر
وہ جگہ ڈھونڈ تمنا کی جہاں راہ نہ ہو

ردیف ھ

بچنا فضول گوئی سے مقصد سکوت ہے
معقول بات ذہن میں آئے تو چپ نہ رہ

صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسنِ عمل
بہر انجام یہ امرت ہے اسے بِس نہ سمجھ
دل کا دنیا کی امیدوں سے بہلنا ہے بُرا
زندگی تلخ کرینگی انھیں مونس نہ سمجھ

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ
ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست
تیری تو کچھ نہ ترقی ہوئی تنخواہ کے ساتھ

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

کیا وہ خواہش کہ جسے دل بھی سمجھتا ہو حقیر　　آرزو وہ ہے جو سینے میں رہے ناز کے ساتھ

ردیف ی

بتوں سے میل، خدا پر نظر، یہ خوب کہی　　شبِ گناہ و نمازِ سحر، یہ خوب کہی
فلٹ نفیس، سٹرک خوش نما، ڈنر ہر شب　　یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر، یہ خوب کہی

وہ ادا اس وقت تم نے کی کہ دل تڑپا دیا　　اب نہ کہنا بے محل کیا تھی ضرورت پیار کی
بے زلیخا کا سا گاہک حضرتِ یوسف سا مال　　دیدنی ہے آج رونق مصر کے بازار کی

آہ جو دل سے نکالی جائے گی　　کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائیگی؟

مہ وشوں کی مہربانی ہو چکی　　چار دن کی چاندنی تھی ہو چکی
عاقبت کا اب خیال آنے لگا　　شورشِ عہدِ جوانی ہو چکی

تیار تھے نماز پہ ہم سن کے ذکرِ حور　　جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے　　صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی
عقبیٰ کی باز پرس کا جاتا رہا خیال　　دنیا کی لذتوں میں طبیعت بہل گئی

نکہتِ گل سے شمیم زلف یاد آ ہی گئی　　آج تو مجھ کو نسیم صبح تڑپا ہی گئی
عاشقوں میں رسمِ عیشِ دنیوی رائج نہیں　　قیس کب دولھا بنا لیلیٰ کہاں بیاہی گئی

دنیا یونہی ناشاد یوں ہی شاد رہے گی
برباد کئے جائے گی برباد رہے گی
گلچیں کا ستم بھول بھی جاؤں کبھی شاید
صیاد کی بیداد مگر یاد رہے گی

سنتا ہوں مجھے رخصتِ فریاد ملے گی
منظور تماشا ہی ہے؟ یا داد ملے گی

غنچہ کھل جائے تو پھر زینتِ محفل نہ سہی
خود شگفتہ رہے گلدستہ میں داخل نہ سہی

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی
گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی
عروسِ دہر کو آیا تھا پیار ہم پر بھی
یہ بیسوا تھی کسی شب نثار ہم پر بھی
بٹھا چکا ہے زمانہ ہمیں بھی مسند پر
ہوا کئے ہیں جواہر نثار ہم پر بھی
خطا کسی کی ہو لیکن کھلی جو ان کی زباں
تو ہو ہی جاتے ہیں دو چار وار ہم پر بھی
ہمیں بھی آتشِ الفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار ہم پر بھی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی
محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی
وہ اٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

ہو لئے کوچۂ مشرق کی جو ہیں یاد ہیں ہم کو
وہی تھی منزلِ راحت وہی رفتار اچھی تھی

نظرِ لطف و کرم یار کی اب وہ نہ رہی
پہلے اک بات تھی جو پیار کی اب وہ نہ رہی

رہی نہ قلب میں طاقت زمانہ سازی کی
دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

شب برات اچھی ہے اے جان نہ اچھی شب قدر
آپ حصّے میں مرے آئیں وہی رات اچھی

سینے میں دلِ آگاہ جو ہو کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی
بیدار تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بےچین سہی برباد سہی

وہ خوش کہ کروں گا ذبح اسے یا قید قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ وہ طالب مجھ سے مرا صیاد سہی جلاد سہی

ردیف ے

عیش کا بھی ذوق دینداری کی شہرت کا بھی شوق
آپ میوزک ہال میں قرآن گا یا کیجیے

خدا سے تم دل ملاؤ اپنا زبان کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لینا کہ پُر اثر ہے زبان سے جو نکل رہا ہے

بہار آئی ہے گویا اب نہ جائے گی گلستاں سے
کھلی پڑتی ہیں کلیاں بھی ہوا بھی ناز کرتی ہے

نہ بے مہری کا شکوہ ہے نہ ہے سوزِ غمِ فرقت
تعارف آپ سے کیوں ہو گیا رنج و الم یہ ہے

زوالِ جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے
کہ دنیا کو بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

شاعری میرے لئے آساں نہیں
جھوٹ سے واللہ نفرت ہے مجھے

زبانیں مختلف بھی ہوں اگر وہ حق پرستوں کی
ہم آہنگ جاتی ہے نیّت کی خوبی کام کرتی ہے

نہ پائیگا کبھی اصلی مسرت طالبِ دنیا — پر اس کا ہاتھ کب اس سعی لاحاصل سے اٹھتا ہے

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے — بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

سڑک پر کام میں تکلیف ہے بنگلے پہ بے لطفی — یہاں سایہ نہیں ہے اور وہاں گانے نہیں پاتے

کھٹملوں پر زجر و طعن و غیظ سے منہ موڑئیے — گرم پانی ڈالئے یا چارپائی چھوڑئیے

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے — لیکن شہید ہو گئے بی بی کی نوج سے

نہیں کچھ اس کی پرسش الفتِ اللہ کتنی ہے — یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

عہدے جو سو پچاس کو اچھے ملے تو کیا — قائم نہ ہوگی قوم کبھی سو پچاس سے

قرآن کو زبان سے دل میں اتاریئے — علمی نمود چھوڑ عمل کو سنواریئے

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اللہ خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چُور ہے لیمنڈ کا پھین ہے

توپ کھسکی ۔ پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

نہ بھول اس پہ کہ یہ او روہ تجھے اچھا سمجھتا ہی — تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہئے پڑھنا نماز — یہ بھی سن لو جی لگا کر سانس لینا چاہئے

شیخ جی کی نظر میں۔ میں ہوں فقط — میری نظروں میں ساری دُنیا ہے

دل تعلق بڑھا کے پچھتایا — پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

مدعا سب کا جو نہ سمجھے ایک — غالباً عقل سے معرا ہے

صرف دعووں سے تو آتی نہیں عظمت دل میں — آنکھ کچھ دیکھتی ہے تب وہ ادب کرتی ہے

دُنیا کی طوالت بیحد ہے خلقت کا تو لمبا قصہ ہے — ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

ممنون تو میں ہوں ترا اے سایۂ شجر — سر پر مگر عذاب ہے چڑیوں کی بیٹ سے

اہل اللہ سے لگاوٹ ہے — ورنہ مذہب میں سب بناوٹ ہے

بتوں کی بات سے دل مایۂ فریاد ہوتا ہے — مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے

رزقِ ما یحتاج مل ہی جائے گا — خواہشوں میں مختصر ہو جائیے

اتنا جیے کہ جاننے والے گزر گئے
پُرساں رہا نہ کوئی تو چپ چاپ مر گئے

جو مسرت تیری محتاجِ نگاہِ غیر ہے
اس مسرت میں نہ خوبی ہے نہ کوئی خیر ہے

رہتے ہیں اس خیال سے ہم اپنے گھر پڑے
کیوں لوگ چاہتے ہیں کہ ہم پر نظر پڑے

یار کا حسن سب پہ فائق ہے
واقعی دیکھنے کے لائق ہے
ان مصائب سے کام لے اکبر
غم بڑا مدرکِ حقائق ہے

کہا صیّاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر میری
نشاطِ طبع کی مہلک مگر بیکاری پر ہے

دوسروں پر نکتہ چینی کا تجھے کیوں شوق ہے
اپنی اپنی خو ہے اکبر اپنا اپنا ذوق ہے

فقط سڑکوں سے تسکینِ نگاہِ چشمِ شرقی ہے
اندھیرا ہے گھروں میں راستوں میں لمپ برقی ہے

کہتی ہے سبز پری ہو کے صبا سے خارج
راجہ اندر نہ سہی جلوۂ گلفام تو ہے

دلِ شکستہ میں ایمان رہ سکے تو رہے
اُجاڑ گھر میں یہ مہمان رہ سکے تو رہے
دلِ ضعیف کو چارہ نہیں ہے کفر سے اب
اگر زبان مسلمان رہ سکے تو رہے

تمہارے مذہبی دعوے جو کچھ ہوں میں یہ دیکھونگا
عقیدوں کا اثر فکرِ معیشت پر کہاں تک ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اس کیلئے لٹھ تان سکے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا ہم اس کو نہیں پہچان سکے

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید ترے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

کیا آپ نے ہنوز کسی سے سُنا نہیں
جس نے کیا ہے صبر خدا اس کے ساتھ ہے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں فیس لیجیے اور آہ کیجئے

غم سے عبرت کا نور حاصل ہے
غم نہایت مجلّیِ دل ہے
غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے
نہ وہ جو رسم کا چراغ بنے

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

کیوں یہ کہتے ہو ہر اک میں وہ اثر جو ہم میں ہے
تم کو کیا معلوم اکبرؔ کون کس عالم میں ہے

امنوا میں تو سب سے آگے ہیں — اعملو الصّٰلحٰت مشکل ہے
وصل ہو یا فراق ہو اکبرؔ — جاگنا ساری رات مشکل ہے

تہذیب مغربی میں ہے بوسے تلک معاف — اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

داد قرآں کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو — پیش درگاہِ خدا واہ کی حاجت کیا ہے

مرے اجداد بھی ڈرتے تھے اکبرؔ میں بھی ڈرتا ہوں — مگر ان کو گناہوں سے تھا ڈر اور مجھ کو مرنے سے

تنہا وہ رہ گئے تھے تو میں خود نہ بیٹھتا — ناحق مجھے ذلیل کیا جاؤ جاؤ سے

آدمی کے لئے دنیا میں مصائب ہیں بہت — خوش نصیبی ہے جو وہ صبر کی عادت رکھے

کیا بتاؤں تمہیں اچھائی کی پہچان اکبرؔ — بس وہی خوب ہے جو تم سے محبت رکھے

معنی کو بھلا دیتی ہے صورت ہے تو یہ ہے — نیچر بھی سبق سیکھ لے زینت ہے تو یہ ہے
پیچیدہ مسائل کے لئے جاتے ہیں انگلینڈ — زلفوں میں الجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے

عبث ہر طاقت و دولت پہ تجھ کو رشک و حسرت ہے — نہ ہر طاقت میں نیکی ہے نہ ہر دولت میں راحت ہے

بوڑھے ہنسی کو اپنی ظاہر کریں تو کیونکر — جب دانت ہی نہیں ہیں پھر کون چیز نکلے

موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے — کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے

گل کو خنداں بلبلوں کو نوحہ گر — باغِ عالم کی دو رنگی عمر بھر دیکھا کئے
جنبشِ ابرو ہی کافی تھی ہمارے قتل کو — آپ تو ناحق سوئے تیغ و تبر دیکھا کئے
وعدۂ شب پر گمانِ صدق سے سوئے نہ ہم — راہ اس پیماں شکن کی رات بھر دیکھا کئے

دیکھیے کب تک نہیں آتی گلِ عارض کی یاد — سیرِ گلشن سے طبیعت ہم نے بہلائی تو ہے

وہ بھی چپ بیٹھے ہیں اغیار بھی چپ میں بھی خموش — ایسی صحبت سے طبیعت مری گھبراتی ہے

اپنی یہ احتیاط کہ بوسے پہ اکتفا — اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

مرے قرآن پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت — مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا — یہ تو کہیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

بحث کی خو اور ہے اور عشقِ یزداں اور ہے — رنگِ مذہب اور ہے اور نورِ ایماں اور ہے

بادہ سب میں یہ ہو یہ اک خیالِ خام ہے — اک مذاقِ طبع ہے جس کا تصوف نام ہے

ٹھیک ہے مصرع کا مضموں قافیہ گو سخت ہے — اہلِ دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کم بخت ہے

کافی اگرچہ لیٹنے کو اک پلنگ ہے   انگڑائیوں کو عرصۂ دنیا بھی تنگ ہے

برقِ کلیسا

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مُرید   قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں   گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے   دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں   سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق   ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا   یا حفیظ کا کیا ورد ۔۔ مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار   دولتِ عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے   ساری دُنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی   ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی،
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مُسلمانوں سے   بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر   حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

عرض کی میں نے کہ "اے لذتِ جاں راحتِ روح   اب زمانہ پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوحؑ
جوہرِ تیغِ مجاہد تری ابرو پہ نثار   نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رُو پہ نثار
مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں   نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو   ہنس کے بولی کہ "تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو"

عورت

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید
ہو اگر ضبطِ نظر کی اور خودداری کی قید

ہاں مگر خودداری و ضبطِ نظر آساں نہیں
مونہہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

یہ تو ظاہر ہے حریفِ شوخ کیوں رکنے لگا
شوق سے لیکن خرابی پر یہ کیوں جھکنے لگا

بابو گریجویٹ ہیں ۔ کالج کے ساتھ ہیں
اک آپ ہیں کہ ہوٹلوں والی کے ساتھ ہیں؟

موقع کا ہے خیال نہ اب کانشنس سے ہے
ارشاد ہو غلط بھی تو اس کا ڈفنس ہے!

ارشادِ لاجواب تو قرآن ہی کا ہے
قانونِ بیٹیاں تو رحمٰن ہی کا ہے

وقعت تمہاری شاد کی منزل میں کچھ نہیں
کاغذ میں اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

اک برگِ گل کہے گا کہ ہم گل کے جزو ہیں
تم خود کو کیا کہو گے کہ کس گل کے جزو ہیں؟

گھر چھوڑ چھاڑ کر جو بغل چاپ بن گئے
کانٹوں میں اب پھنسو کہ مٹن چاپ بن گئے

کلفت اسی کی مجھ کو ہے ہر آن ہر نفس
لاکھوں کی سدِّ راہ ہے دس بیس کی ہوس

معاشرتِ جدید

یورپ میں پھریئے لندن و پیرس کو دیکھئے
تحقیقِ ملکِ کاشغر و شام کیجئے

ہو جایئے طریقۂ مغرب پہ مطمئن
خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجئے

سامان جمع کیجئے ۔ کوٹھی بنایئے
با صدِ خلوص دعوتِ حکام کیجئے

بے رونقی سے کاٹئے کیوں اپنی عمر کو
کیوں انتظارِ گردشِ ایام کیجئے

یارانِ ہم مذاق سے ہم بزم ہو جئے
موقع ملے تو شغلِ مے و جام کیجئے

نظارۂ مساں سے تر و تازہ رکھئے آنکھ
تفریح پارک میں سحر و شام کیجئے

شاد عظیم آبادی

سید محمد علی نام شاد تخلص ۱۲۶۳ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء بمقام عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے شاد کے والد سید عباس مرزا پیدا ضلع الہ آباد میں ہوئے تھے لیکن پندرہ سال کی عمر میں عظیم آباد چلے گئے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاد نے کہنہ مشق استادوں سے فیض حاصل کیا لیکن بعد میں اس کو غلط ثابت کر کے صرف حضرت فرہاد کو جو اشخی کے شاگرد تھے ان کا استاد بتایا گیا ہے۔ ابتدائی تربیت ان کی میر سید محمد کے ذمے تھی جو اردو زبان کے محقق تھے اور جن کی صحبت کا اثر یہ تھا کہ شاد فصاحت اور بلاغت کے راز سے واقف ہو گئے۔

شاد کی عمر کا بیشتر حصہ اردو ادب کی خدمت میں گزرا۔ ۱۸۹۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ اور ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ بھی گورنمنٹ سے ملتا رہا۔ ۲۳ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے اور ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء بمقام پٹنہ انتقال کیا۔

ان کی تصانیف "کلام شاد"، "الہامات شاد"، غزلوں کا دیوان "نغمۂ الہام" اور نثر میں "مکتوبِ شاد" اور "حیات فرہاد" وغیرہ ہیں۔

ردیف الف

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا — مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا
دیر تک ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا — چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا
ہائے وہ خود رفتگی۔ الجھے ہوئے سب کے بال — وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا
شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو — ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا
بوریا تھا کچھ شبینہ مے تھی یا ٹوٹے سبو — اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا
خود غرض دنیا کی حالت قابلِ نفرت تھی شاد — لطف ملنے کا نہ اپنے میں نہ بیگانے میں تھا

پیری میں جوانی کی باتیں کیا عرض کروں اک قصہ ہے — وہ طرز گئی وہ وضع گئی، انداز گیا، اسلوب گیا

موہنہ پہ عاشق کے محبت کی شکایت ناصح — بات کرنے کا بھی ناداں نہ قرینہ آیا

میں کہاں واعظ کہاں — توبہ کرو! — جو نہ سمجھا خود وہ کیا سمجھائے گا؟

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا — اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا — اک ٹھیس لگی تھی یونہی سی کیا جلد یہ شیشہ ٹوٹ گیا

یونہی صبح ہوگی یونہی شام ہوگی — یہی رات دن کا تماشا رہے گا
یہ دنیا ہے اے شاد ناحق نہ الجھو — ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

جفائے یار کا دل کو ملال آ ہی گیا — ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

چلے ہم باغ سے اے شاد کس وقت — بہار آنے کو تھی — وقتِ نمو تھا

اے شاد یوں نکل گئی روح اپنے جسم سے — گویا کبھی کا اس کو سروکار ہی نہ تھا

ہزار مجمعِ خوباں ماہرو ہوگا — نگاہ جس پہ ٹھہر جائیگی وہ تو ہوگا
خوشا وہ دور کہ ہر رند باوضو ہوگا — زباں پہ نام ترا ہاتھ میں سبو ہوگا
درشت لفظوں سے توڑے کسی کا دل واعظ — وہ کوئی رند نہ ہوگا ضرور تو ہوگا

میں اپنے ساقیٔ مہوش کے ہاتھ کے قرباں
کہیں تو پاؤں گا تجھ کو کہیں تو تو ہو گا!

کٹا زندگی کا زمانہ قفس میں
یہی تھا چمن، آشیانہ یہی تھا
ترے گیسوؤں کو نہ بھولے کبھی ہم
بتیں مختلف تھیں فسانہ یہی تھا

جلو میں پیرِ مغاں سا رہبر بغل میں ساقی سا فیض گستر
بڑے تکلف سے آیا ساغر بڑے تجمّل سے جام نکلا

زیست ہے نام تیری فرقت کا
کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا؟
زردیٔ رُخ کی وجہ کیا کہیے
یہ بھی اک رنگ ہے طبیعت کا؟

عجب طرح کی ہوئی اپنی روح کو راحت
تعلقات کو خاطر سے جب نکال دیا
وہ بادشاہ ہے خود اپنے ملک کا اے شاد
عطا کیا اُسے سب کچھ جسے کمال دیا

یہ ممکن ہے کہ لکھّی ہو قلم نے فتح آخر میں
جو ہیں اربابِ ہمّت غم نہیں کرتے شکستوں کا
زمیں پر کھینچ کر لاتی ہے اپنی سطح پر آخر
فلک رتبہ بڑھانے کو بڑھا دے لاکھ پستوں کا

اے عشق اب تو نام نہ لے کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا
بدلا شعار اس نگہِ جاں گداز کا
پردہ رکھے خدا مرے عجز و نیاز کا
عالم کو خود پسندہیں نیرنگ سازیاں
اس میں قصور کیا نگہِ فتنہ ساز کا
کچھ دن مجھے بھی خانۂ تن میں جگہ ملی
احساں ہے اس سرائے مسافر نواز کا

کی ترکِ مے تو مائلِ پندار ہو گیا　　میں توبہ کرکے اور گنہگار ہو گیا

نہ ساقی نہ ساغر نہ مینا رہا　　فقط خونِ دل پی کے جینا رہا
نہ پاسِ زباں اب نہ ویسا ادب　　نہ وہ صحبتوں کا قرینا رہا

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر　　جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ردیف ج

حد سے فزوں ہے سیرِ گلستاں کی ہوس آج　　صیّاد! بھیانک نظر آتا ہے قفس آج

ردیف ر

ریاضت پیشگانِ بے ریا کی شان پیدا کر　　جو راحت چاہتا ہے دل میں اطمینان پیدا کر
رہے جو یاس سے محفوظ ڈھونڈ ایسی تمنّا کو　　نہ ہو حسرت کا جس کو خوف وہ ارمان پیدا کر

ردیف ن

تمنّاؤں میں الجھایا گیا ہوں　　کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچے کے ہر ذرّہ سے واقف　　اُدھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں
کجا میں اور کجا اے شاد دنیا　　کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں　　وہ تو خود بھٹکی ہوئی پھرتی ہے رہبر ہم ہیں
دل یہ کہتا ہے ہمیں دیکھ کتابوں پہ نہ جا　　قدرتِ صانعِ مخلوق کے دفتر ہم ہیں

خدا کرے ترے رُخ کی بہار ہم دیکھیں　　فروغِ جلوۂ جنّت نثار ہم دیکھیں

یہی ہے دشمن کہ تری جلوہ گاہ میں جاکر
ہزار آنکھیں ہوں اور سب سے یار ہم دیکھیں

پوچھتے ہیں وہ کہ "زندہ شاد ہیں؟"
ہمد مو! بالیے ہم اب تک یاد ہیں؟"
تیری اس آمد کے صدقے اے بہار
آج کیا کیا میکدے آباد ہیں

بار جن کلیوں پہ تھیں پرچھائیاں
اے خزاں پہلے وہی مرجھائیاں

خزاں میں سوگوار باغ جب فریاد کرتے ہیں
تڑپ جاتا ہے دل اپنی مصیبت یاد کرتے ہیں
ضعیفی کو دعائیں دے دلا خوش ہو بڑھاپے سے
کہ مالک بندگانِ پیر کو آزاد کرتے ہیں
تماشا ہے کہ دکھ دینے کا بھی الزام ہے مجھ پہ
مزا یہ ہے کہ ہر دکھ میں تجھی کو یاد کرتے ہیں
کتابِ عمر ہے پیشِ نظر چشمِ تصور میں
الٹتے ہیں ورق بھولے سبق کو یاد کرتے ہیں

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں
مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی
پیوں جواب تو ترے آستاں پہ آکے پیوں
زمیں پہ جام کو رکھ دے ذرا ٹھہر ساقی
میں اس پہ ہولوں تصدق تو پھر اٹھا کے پیوں

ردیف و

اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو
فیصلہ ہوتا ہے نیکی و بدی کا ہر دم
دل کو اس سینے میں چھوٹی سی عدالت سمجھو

ردیف ہ

وہ چشمِ مست وہ تو بھی نظر معاذ اللہ!
حیا ہزار بھری ہے مگر، معاذ اللہ!

ردیف ی

سمجھ میں خاک نہ آیا فسانۂ شب غم
عجب طرح کی یہ الجھی ہوئی کہانی تھی

بتوں نے چھوڑ دیا شادؔ بات تک کرنا
تم ہی سے چوک ہوئی کہہ گئے خدا لگتی

در آئی دل میں طہارت کے ساتھ خواہش وصل
ادب شناس تھی کعبہ میں بے وضو نہ گئی
زہے بلندئ ایوانِ جلوہ گاہِ حبیب
ٹھٹک کے بیٹھ گئی عقل جیسے جو نہ گئی

شادؔ کچھ پوچھ نہ ان اہلِ تقدس کی صفت
شکلیں عاقل کی ہیں باتیں وہی دیوانوں کی

لپٹ کر اس کفِ رنگیں سے کیا کیا ناز کرتا ہے
وہ زلفِ مشکبو بگڑی ہے بن آئی ہے شانے کی

کیوں باغباں نے بھول دیا مجھ کو توڑ کر
ناحق لگی لگائی طبیعت اچٹ گئی
ماتم کا شور ہوتا ہے ہمسایہ میں کہیں
بیڑی کسی اسیر کی اے شادؔ کٹ گئی

زندگی تک ہجر کی حد ہو گئی
دے دیا صدقہ بلا رد ہو گئی

ردیف ے

کھلے تھے بال جانے پر کب محراب تک
کفن میں تہمتِ گیسوئے یار باقی ہے
نہ رات کٹتی ہے کمبخت امیدواروں کی
نہ دل کو حوصلۂ انتظار باقی ہے

برسوں سے خو گرفتہ فرقت مزاج ہے
پہلے تو اک مرض تھا مگر اب لاعلاج ہے

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول — اس پر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے
آزاد ہم نہ سمجھیں گے اسوقت تک تمھیں — جس وقت تک کہ شاد کوئی احتیاج ہے

سب اعضا درہم برہم ہیں اک دل کے اذیت پانے سے — لشکر میں تلاطم برپا ہے سردار کے مارے جانے سے

آثار مٹ گئے مرے سینے سے داغ کے — کیا خوفناک ہے یہ مکاں بے چراغ کے

بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے — تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے
دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے
چارہ ہوا نہ شاد کو آخر کسی طرح — راضی تری رضا پہ بہ ہر طور ہو گئے

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر — کدھر جھکائے سر انساں کدھر نماز گرے

کہیں سے جب صدائے نالہ و فریاد آتی ہے — تڑپ جاتا ہے دل اپنی مصیبت یاد آتی ہے
بہت دشوار ہے جلد اس تعلق کا مٹا دینا — قفس میں بوئے گل کوسوں سے اے صیاد آتی ہے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا اپنی ہوا سے آپ جھجکنا — چال میں لغزش منہ پہ جمائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے — مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے — جو نہیں جائز اسکی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے — جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

یاد تھیں راتیں بھیانک ہجر کی شکل دیکھی شام کی گھبرا گئے

جو دیکھے غور سے سارا بھرم کھل جائے دنیا کا مصیبت آدمی کو صاحبِ ادراک کرتی ہے

بے دل کی ہیں آنکھیں دیکھنے کی اور منہ میں زباں بھی نام کی ہے
جس فوج کا افسر کھیت رہا وہ فوج کہو کس کام کی ہے

قیصر و دارا و سکندر اب کہاں جن کے ڈنکے بج رہے تھے ان کی نوبت دیکھئے

بجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جانے کے لئے روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لئے

آدمی جز غمِ بے بال و پری کیا جانے لطف پرواز کا مٹی کی پری کیا جانے
منہ سے نکلی مرے اللہ نے فوراً سن لی ہم فقیروں کی دعا بے اثری کیا جانے
دیکھنا غافل ذرا دنیا کو پہچانے ہوئے کل جو قصے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے

دلِ مضطر نہ کھولوں راز کو تیرے کبھی لیکن کسی کا نام لینے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

ریاض خیرآبادی

ریاض احمد نام ریاض تخلص۔ خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) بقول عقیل احمد جعفری ۱۲۷۲ھ میں اور بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ روایتیں ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ خلیجیوں کے زمانے میں ایران سے آکر خیرآباد میں آباد ہو گئے تھے۔ ریاض کی ابتدائی تعلیم ان کے والد سید طفیل احمد نے دی۔ شاعری میں پہلے اسیر لکھنوی سے فیض حاصل کیا پھر امیر مینائی کے شاگرد ہوتے۔ ۱۸۷۲ء میں خیرآباد میں ایک مطبع قائم کیا۔ اور ریاض الاخبار جاری کیا۔ ۱۸۸۱ء میں گورکھپور گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سے 'فتنہ' اور 'عطر فتنہ' نکالا۔ اور کئی ایک گلدستے وغیرہ۔ بعد میں مہاراجہ محمود آباد کی قدردانی اور کشش ان کو لکھنؤ کھینچ لائی۔ آخر کار ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء کو بمقام خیرآباد انتقال کیا۔

تصانیف 'ریاض رضواں' دو جلدوں میں۔ نثر میں 'حرم سرا'، 'نظارۂ ناشاد' اور 'نثر ریاض خیرآبادی' ان کی یادگار ہیں۔

ردیف الف

ہر قدم پر موت کا مجھ کو پسینا آ گیا
عشق میں مرنا تو کیا مر مر کے جینا آ گیا

اے جنوں کچھ دھجیاں میرے گلے میں ڈال دے
پھوٹتی ہے جبیں کو نیل وہ مہینا آ گیا

اک جنازہ دوش پر بحرِ عدم۔ قعرِ لحد
ہم یہ سمجھے تھے کہ ساحل پر سفینا آ گیا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری میکشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے اٹھائے ادا کے لطف	پہروں سے آج مجھ کو تصور کسی کا تھا
جس انجمن میں بیٹھ گیا ۔ رونق آ گئی	کچھ آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

منہ زیرِ تاک کھولا ، واعظ بہت ہی چوکا	بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا

ردیف پ

جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ	حضرتِ واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

ردیف ت

ہم بھی پئیں تمہیں بھی پلائیں تمام رات	جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات
ان کی جفائیں یاد دلائیں تمام رات	وہ دن بھی ہو کہ ان کو ستائیں تمام رات
شب بھر رہے کسی سے ہم آغوشیوں کے لطف	ہوتی رہیں قبول دعائیں تمام رات

ہو مبارک اسیاہ کار ریاضؔ	نور کی شکل ، نور کی صورت

ردیف ج

کس مزے کی ہوا میں مستی ہے	کہیں برسی ہے آسمان سے آج
نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی	قرض پی آئے اک دکان سے آج
اونچے کوٹھوں کے بیٹھنے والے	باتیں کرتے تھے آسمان سے آج

ردیف س

چھیڑتی ہے شکنِ زلف شب وصل ہمیں	لیں سنوارے ہوئے گیسو کی بلائیں کیونکر
ریاضؔ اس وضع سے پہنچے کہ بوسے میکدے والے	بزرگِ خضر صورت آئے جنت میں جواں ہو کر

ذکرِ مئے طہور نے تڑپا دیا ریاضؔ — جانا پڑا ہمیں کسی اونچی دکان پر

بہار آئے نہ آئے اے ریاضؔ اس ضعفِ پیری میں
نہ زور اپنا گریباں پر نہ اپنا زور دامن پر

ردیف ت

نگاہیں نہ آنکھوں کے گھونگھٹ سے نکلیں — ادائیں غضب شرمگیں جانتے ہیں
جو واقف نہیں لطفِ تجدید سے کچھ — وہ توبہ کی لذت نہیں جانتے ہیں
بڑے سے بڑے اہلِ طینت بڑے صاحبِ باطن — ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

صیاد کو بہار میں موج آ گئی یہ کیا — پھولوں سے آج سب کے قفس چھائے جاتے ہیں

خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں — ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں
دمِ وعظ کیا کیا مزے میں ہیں واعظ — بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں
قیامت بھی جاتی ہے ہر قدم پر — یہ کون آ رہا ہے؟ وہی آ رہے ہیں!
کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں — عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

دمِ آخر کسی کا شکوۂ بیداد کرتے ہیں — ہمیں ہیں ہچکیاں رہ رہ کے ہم فریاد کرتے ہیں
عجب انداز سے کہتی ہیں دل کی حسرتیں مجھ سے — ہمیں گھر سے نکالیں گھر وہ کیوں برباد کرتے ہیں
کلیجے کیوں رگِ جاں بن کے خنجر رہ گیا تیرا — کہیں بسمل سے اچھی شوخیاں جلاد کرتے ہیں

ہمارے ساتھ ہے صیاد بھی یا رب مصیبت میں کلیجہ منہ کو آتا ہے جو ہم فریاد کرتے ہیں

سنا ہے رہائین اپنی داڑھی بڑھا کر بڑھاپے میں اللہ والے ہوتے ہیں

مزے لے لے کے سنتی تھیں تجھے بھی ہو فغانیں میاں مجنوں کو اے لیلیٰ بٹھا لینا تھا محمل میں

ردیف و

پارسائی کا یقیں عبہر کو دلواتے ہیں اور جو بے ساختہ آجائے تبسم مجھ کو؟!

ان حسینوں کے بول جھوٹ بھی تو کیا لطف آئی چھیڑ کی چیز جو میرا دلِ ناشاد نہ ہو

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی تصویر کھینچیں آج بہارِ شباب کی
چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی لیلی پھڑک اٹھی نگہِ انتخاب کی
بنتِ عنب کو چھیڑتے ہیں حضرتِ لسان آج کتنی ہے بامذاق طبیعت جناب کی

ہم نے سو بار شبِ وصل ملا کر دیکھا اے فلک چاند سے وہ چاند سی صورت اچھی

درد ہو تو دوا کرے کوئی موت ہی ہو تو کیا کرے کوئی
ستاتے نہیں کوئی شبِ وصل ان کی باتیں سنا کرے کوئی
بند ہوتا ہے اب درِ توبہ درِ میخانہ وا کرے کوئی
کھینچے دنیا کی باتیں دنیا تک حشر میں کیا گلہ کرے کوئی

بگڑے گیسو تو بولے جھنجلا کر   نہ بلائیں لیا کرے کوئی

اب تو جی اکتا گیا دُنیا کے دھندوں سے ریاضؔ   اتنے جھگڑے چار دن کی زندگی کے واسطے

اے چرخ حسینوں کی جفا اور ہی کچھ ہے   چھیڑوں میں حسینوں کے مزا اور ہی کچھ ہے
آغازِ جوانی کا مزا اور ہی کچھ ہے   اُٹھتی ہوئی کونپل کا مزا اور ہی کچھ ہے
او بندۂ بت دیکھ خدا اور ہی کچھ ہے   بُت پردہ ہیں پردے میں چھپا اور ہی کچھ ہے
اے شیخ! یہ جب آتی ہے چھا جاتی ہے سب پر   برسات کی گھنگھور گھٹا اور ہی کچھ ہے

بتانِ شوخ کی الفت بڑی بلا ہے ریاضؔ   مرا خدا مجھے اپنی پناہ میں رکھے

مے رہے مینا رہے گردش میں پیمانہ رہے   میرے ساقی تُو رہے آباد میخانہ رہے!

گُل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے   شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

جامِ مے توبہ شکن۔ توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آئی ہے بہار   وہ تو وہ رنگ بدل جاتے ہیں زندانوں کے

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں   بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے   الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے ... مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

جس دن سے حرام ہو گئی ہے ... مے خلد مقام ہو گئی ہے
ہے دور ابھی ریاض منزل ... دن ختم ہے شام ہو گئی ہے

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے ... ان مقامات میں ہم کو وہ بہت دور ملے

زمین میکدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے ... یہ خشتِ خم فرشتے کی جبیں معلوم ہوتی ہے

اصغر گونڈوی

دراصل وطن گورکھپور تھا لیکن اصغر کے والد چونکہ گونڈہ میں بہت رہے اس لئے اصغر گونڈوی کہلانے لگے۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کوئی خاص نہ ہو سکی۔ انٹرنس بھی پاس نہ کر سکے۔ متقی قسم کے آدمی تھے۔ قاضی عبد الغنی سے بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔ بہت دنوں تک الہ آباد میں رہے۔ ہندوستانی اکیڈمی میں کام کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے لئے مولانا تاجور کے ادارے لاہور میں بھی کام کیا مگر وہاں جی نہیں لگا آخر کار واپس چلے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

تصانیف "سرودِ زندگی" اور "نشاطِ روح" ہیں۔ پرنسپل عبد الشکور نے اصغر پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

ردیف الف

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا ... رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

یہ کیا کہا کہ غمِ عشق ناگوار ہوا
مجھے تو جرعۂ تلخ اور بھی گوارا ہوا

ردیف ن

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیے اُٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو
میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقشِ پا کہوں
برق سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

پایا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

ردیف و

کیا کہیے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

ردیف ی

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

تمتما اُٹھے وہ عارض مرے عرضِ شوق پر — حُسن جاگ اٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی
آشیاں میں اب کسی صورت نہیں پڑتا ہے چین — تھی نظر تاثیر میں ڈوبی ہوئی صیاد کی

اُس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں پہ صبا آئی
اک شعرِ ادا لیلیٰ خلقت نے سُنا لیکن — پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو — مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

ردیف ے

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے — غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے
بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا — وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

شیوۂ منصور تھا اہلِ نظر پہ بھی گراں — پھر بھی کس حسرت سے سوئے دار ہم دیکھا کیے
بلبل و گل میں جو گزری اس سے ہم کو کیا غرض — ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کیے

عشووں کی ہے نہ اس نگہِ فتنہ زا کی ہے — ساری خطا مرے دلِ شورش ادا کی ہے

نام ان کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس — ہم تھے کہ اڑ گئے صفتِ محشر اٹھ گئے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار — فتنہ طرازیٔ قدِ رعنا لئے ہوئے

طوفانِ نازاور پریشاں غبارِ قیس　　شانِ نیاز محملِ لیلیٰ لئے ہوئے

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے　　پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

موجِ نسیم صبح کے قربان جائیے　　آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے

فتنہ ساما نیوں کی خو نہ کرے　　مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

ڈاکٹر محمد اقبال

محمد اقبال نام، اقبال تخلص ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ (پنجاب) پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج سے الیف اے کیا۔ وہیں شمس العلماء میر حسن کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہوئے۔ بی اے اور ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ اور پھر وہیں اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے لیکچرار ہو گئے۔ میونخ (جرمنی) سے پی ایچ ڈی اور انگلستان سے بیرسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آکر ملازمت چھوڑ کر بیرسٹری کرنے لگے تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ اور شاعری کی مشق بھی ہوئی۔ شروع میں داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ اسی درمیان میں ملکی سیاسیات میں بھی داخل ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے رکن بنائے گئے۔ مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۲۳ء میں سر کا خطاب ملا۔ کچھ دنوں کے بعد سیاست سے الگ ہو کر علمی مشاغل میں زیادہ لگ گئے۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: بانگ درا۔ اسرارِ خودی۔ علم الاقتصاد۔ رموز بیخودی۔ پیامِ مشرق۔ پس چہ باید کرد۔ جاوید نامہ۔ مسافر۔ زبورِ عجم۔ مضامینِ اقبال۔ کلیاتِ اقبال۔ حرفِ اقبال۔ عمرانی نظریہ۔ خطوط بنام عطیہ۔ اقبال نامہ۔ فلسفۂ عجم۔ نظریۂ قومیت۔ مدراس لکچرز۔ رختِ سفر۔ ضربِ کلیم۔ بالِ جبریل وغیرہ وغیرہ ہیں۔

غزلیات از بانگِ درا

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

از شکوہ

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا — رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا — پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

وادی نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا — قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا — گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا
اے خوشا آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز — لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز — تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے — مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے — ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں — پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں — ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

خطاب بہ جوانانِ اسلام

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں (ان) کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

جوابِ شکوہ

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا
غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں ؟
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں ؟

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندے کو خدا سے تو نے

کیا کہا ؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور ؟
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں

کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

شور ہے ہو گئے دُنیا سے مسلماں نابود — ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود — یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے — تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم — تم خطاکار و خطابیں وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی ان کا تھا سریرِ کَے بھی
یوں ہی باتیں ہیں؟ کہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی

خودکشی شیوہ تمھارا وہ غیور و خوددار — تم اخوّت سے گریزاں وہ اخوّت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا ۔ وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

قیس زحمت کشِ تنہائیِ صحرا نہ رہے — شہر کی کھائے ہوا ۔ بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے — یہ ضروری ہے حجابِ رخِ لیلیٰ نہ رہے
گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

شمع!

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے — لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے — ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی — پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ — صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا — اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

مظلوم دہقانوں سے

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا — مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے — تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت — اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

پھول

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں ناآشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پہ ہے مدارِ قوتِ حیدری

سلطنت

دیوِ استبداد۔ جمہوری قبا میں۔ پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے۔ اثر خواب آوری

گرمیِ گفتار، اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

مزدور سے

ایکہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بےخبر سمجھا اسے شاخِ نبات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے ۔۔۔ مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام ۔۔۔ دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک؟

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو ۔۔۔ اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اسلام

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی ۔۔۔ جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے ۔۔۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم ۔۔۔ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر ۔۔۔ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں بن جا

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے ۔۔۔ قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی ۔۔۔ کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

اے رہروِ فرزانہ رستے میں اگر تیرے — گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی — مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ — کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں — نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا — ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر — آیۂ لاتخلف المیعاد رکھ

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پہ — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے — حور و خیام سے گزر بادۂ و جام سے گزر
تیرا امام بے حضور۔ تیری نماز بے سُرور — ایسے امام سے گزر۔ ایسی نماز سے گزر

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری — مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی — مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں — خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے — شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں — نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا — تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم — نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

مومن کی تعریف

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

اندلس کے میدان میں "طارق" کی دعا!

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

ساقی نامہ

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہُوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم

تمدن، تصوف، شریعت ۔ کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

پیر و مرید

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

دل ہمی گوئی مرا دل نیست ہست
دل فراز عرش باشد نے بہ پست

تو دلِ خود را دلے پنداشتی
جستجوئے اہلِ دل بگذاشتی

آنکہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے

تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ ۔ زندوں کا خدا ہے

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

حال و مقال

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

ابوالعلا معرّی

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی — پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا — شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا — کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو — تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ابلیس کی عرضداشت

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے — پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب — دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی — ویرانیِ جنت کے تصور سے ہیں غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے　　خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا　　وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے　　تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی　　اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات　　تو گرفتارِ شمارِ سحر و شام ابھی

ہر لحظہ نیا طور ۔ نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

فانی بدایونی

شوکت علی خاں نام فانی تخلص۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ پہلی غزل ۱۸۹۰ء میں کہی ۱۸۹۸ء تک شوکت تخلص کیا۔ پھر فانی کرنے لگے۔ ۱۹۰۱ء میں بی اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۷ء تک پورے گیارہ سال کوئی شعر نہیں کہا۔ ۱۹۲۳ء تک لکھنؤ میں وکالت کی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک حیدر آباد دکن میں صدر مدرس رہے۔ ۱۹۳۹ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ۲۶۔ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔ اپنی وفات سے ایک سال پہلے اپنی تاریخ وفات خود کہی۔

تصانیف: دیوانِ فانی ۱۹۲۰ء ۔ باقیاتِ فانی ۱۹۲۶ء ۔ عرفانیاتِ فانی ۱۹۳۹ء وجدانیاتِ فانی ۱۹۴۰ء ۔ کلیاتِ فانی ۱۹۳۶ء ۔

ردیف الف

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھلا ہمنفس رازِ اسیری کیا کہیں کیونکر کھلا
عجلتِ پروازجب ملنے بھی دے راہِ گریز یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھلا، اکثر کھلا
لکھ چکے ہم جا چکا خط۔ گر یہی حالت رہی ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا چاکِ دل تا بہ جگر یاد آیا
ذوقِ اربابِ نظر یاد آیا سجدہ بے منتِ سر یاد آیا
درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش خانہ برباد کو گھر یاد آیا
اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا
آ کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا نالہ ناخوشگوار تھا نہ رہا
ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم کوئی امیدوار تھا نہ رہا
موت کا انتظار باقی ہے آپ کا انتظار تھا نہ رہا
مہرباں یہ مزارِ فانی ہے آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ردیف د

قفس کو شام سے لٹکا کے فرشِ خواب کے پاس سنا گیا مری تا صبح داستاں صیاد

ردیف ر

دلِ مایوس کو اے عہدِ کرم شاد نہ کر نازپروردۂ غم ہے اسے آباد نہ کر

یا اسے کو کسی بجلی کے حوالے یا رب ۔۔۔ یا مرے نخلِ تمنّا میں ثمر پیدا کر

شاید ہیں وہ خورِ نگہ گرم بھی نہیں ۔۔۔ بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا ۔۔۔ جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور
تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ ۔۔۔ اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

ردیف م

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم ۔۔۔ بیخودی یہ تو بتا کس کے طلب گار ہیں ہم
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ ۔۔۔ دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہ گار ہیں ہم

ردیف ن

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی ۔۔۔ یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
دو ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا ۔۔۔ شرحِ درازیٔ زندگیٔ مختصر کو میں

اب وہ راتیں کہاں شباب کہاں ۔۔۔ ہو گئی صبح وقتِ خواب کہاں
یاس ہے اب نہ آرزو فانیؔ ۔۔۔ دل ہو بیتاب اب وہ بات کہاں

وہ ادھر۔ رخ ادھر ہے میّت کا ۔۔۔ لوگ فانیؔ کو قبلہ رُو تو کریں!

ردیف ی

انسان کی ساری ہستی کا مقصد ہے فانیؔ اک نظر ۔۔۔ یعنی وہ نظر جو دل میں اتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

ردیف ے

ابتدائے عشق ہے لطفِ شباب آنے کو ہے ۔۔۔ صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے
مجھ تک اُس کی بزم میں دورِ شراب آنے کو ہے ۔۔۔ عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے شباب آنے کو ہے

بھر کے ساقی جامِ مے اک اور لا اور جلد لا
ان نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنے کو ہے

میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

نگاہِ ناز و سوزِ عشق دونوں ایک ہیں فانیؔ
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے

سنتا ہوں بڑے سوز سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

مشتاق خبر دار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے
کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاک جگر سے
کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانیؔ
روتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

موت نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانیؔ
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے!
مرگِ فانیؔ میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص ۱۸۷۵ء میں بمقام قصبہ موہان ضلع اناؤ پیدا ہوئے ان کے جد اعلیٰ سید محمود شاہ نیشاپور سے آئے تھے۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ فتحپور سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اور ان کی شاعری کا عروج بھی یہیں ہوا۔ تسلیم لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ سیاست میں بھی دخیل رہے۔ ایک پرچہ "اردوئے معلیٰ" بھی نکالا۔ کئی مرتبہ سیاست کے سلسلے میں جیل گئے۔ جیل سے باہر جب رہے تو زیادہ تر کانپور ان کا جائے قیام رہا۔ نڈر تھے اور ہمیشہ بے موقع بھی سچی بات کہتے تھے۔ شروع میں لیگ کے مخالف تھے۔ پھر کچھ رائے بدل دی۔ مگر پاکستان بنتے وقت قائد اعظم سے اختلاف کیا اور ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔ سنا ہے کہ جواہر لال نہرو نے ان کے پسماندگان کے لئے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

حسرت کی شاعری جذبات سے بھری ہوئی کھلی ڈلی اور پھر بھی تہذیب کے دائرے کے اندر ہوتی ہے۔ حسرت کا مذاق سخن ان کی کتاب "انتخاب غزلیات" سے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ با مذاق اردو داں لوگوں کا خیال ہے کہ اردو شعراء کا اس سے اچھا انتخاب کسی نے نہیں کیا۔

تصانیف ان کی نظم میں "کلیات حسرت"۔ غزلیات کا انتخاب مع انگریزی ترجمہ مرتب و مترجم جلیل قدوائی اور اصول تنقید میں "نکات سخن" خاص چیز ہے۔

شوق کو جرم سے بری نہ کیا — تم نے کچھ پاس دلبری نہ کیا
شکوہ سنج ان سے کیوں ہوئے حسرتؔ — احترام ستمگری نہ کیا؟!
خام تھی اپنی بندگی کہ انھیں — مائل بندہ پروری نہ کیا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں — دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

شکوہ سنجِ الم ہوئے حسرت — ستمِ یار کا ادب نہ کیا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا — ساغر کو رنگِ بادہ نے پرنور کر دیا
مانوس ہو چلا تھا تسلیؔ سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ — لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا
حسرت بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند — تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

جب سے تو مدعائے شوق ہوا — پھر کوئی اور مدعا نہ رہا
آرزو تیری برقرار رہے — دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا

پھر تری یاد ہوئی موجبِ آرائشِ دل — للہ الحمد پھر آباد یہ ویرانہ ہوا

یاد پھر اس بیوفا کی ہر گھڑی رہنے لگی — پھر اسی کا تذکرہ صبح و مسا ہونے لگا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر — یہ دیکھئے مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنیکا بھی اک ہنگام آیا تھا

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ — تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا

پیہم دیا پیالۂ مے ۔ برملا دیا — ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا
اللہ ری بہار کی رنگ آفرینیاں — صحنِ چمن کو تختۂ جنت بنا دیا
حسرتؔ یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں — مومنؔ سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

شرحِ بے مہریٔ احباب کروں کیا حسرتؔ — رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا ہے

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا — باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی — جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری — میں کشتۂ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا

ردیف ت

جانفزا تھی کس قدر یا رب ہوائے کوئے دوست — بس گئی جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست
ہو چکی اب ہم گرفتارانِ فرقت کو نصیب — آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست

حالِ دل کم کہا کرو حسرتؔ — ان کو ہوتا ہے ناگوار بہت

ردیف ر

اُن کو رسوا مجھے خراب نہ کر
اے دل اتنا بھی انتظار نہ کر

چھپ نہیں سکتی چھپائے سے محبت کی نظر
پڑ ہی جاتی ہے رُخِ یار پہ حسرت کی نظر

ردیف س

ہے عقب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس
دل پہ کاہے کو رہے گا اختیار اب کی برس

مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب
یادِ یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

حسرتِ شوریدہ سر ہے پائمالِ اشتیاق
اس طرف بھی کر گزر اے شہسوار اب کی برس

ردیف ک

امامِ برحق اہلِ رضا سلام علیک
شہیدِ معرکۂ کربلا سلام علیک

گلِ مرادِ ولایت حسین ابن علیؑ
ثمرۂ شرفِ مصطفےٰ السلام علیک

ردیف م

اللہ رے حسنِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں
شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

ردیف ن

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آزارِ عشق　　اس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

ترے کرم کا سزاوار زینہار نہیں　　وہ تن کہ خستہ نہیں ہے وہ دل کہ زار نہیں

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو　　لوگ میرے لئے دعا نہ کریں
شوق اُن کا سو مٹ چکا حسرت　　کیا کریں ہم گر وفا نہ کریں

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں　　اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
محفلِ یار میں بہ ذوقِ نگاہ　　لطف کیا کیا اٹھا گئیں آنکھیں
حال سنتے وہ کیا مرا حسرت　　وہ تو کہئے سنا گئیں آنکھیں

اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا　　کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
حال کھل جائیگا بیتابیٔ دل کا حسرت　　بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

آپ نادم نہ ہوں کہ حسرت سے　　شکوۂ غم کا احتمال نہیں

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں　　اب تجھے اے ستمِ یار! کہاں سے لاؤں؟
ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز　　التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں؟

عقلِ صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا　　شوق کی بیقراریاں نہ گئیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں / آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو / ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا / سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی / اب نظر کاہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں
تیری بے صبری ہے حسرتؔ خام کاری کی دلیل / گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

روح کو محوِ خیالِ رُخِ جاناں کر لیں / ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں
جان دینا ہے تو کر دیں تمہیں قدموں پہ نثار / کام مشکل ہے تو مشکل کو ہم آساں کر لیں

عشق میں جان سے گزر جائیں / اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں
جامہ زیبی نہ پوچھیئے اُن کی / جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں
شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ / سُنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

ردیف و

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال / شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو
ضبطِ خواہش پہ ہو نازاں مگر اے حسرتِ دل / کیا ہو سوتے جو کہیں ان کو اکیلا دیکھو

ذکر ہوتا ہے جاں نثاروں کا / تم بھی حسرتؔ اٹھو سلام کرو

بھولے ہی سے اُٹھ جائے نقابِ رخِ زیبا / کیا شوق کی اتنی بھی رعایت نہیں تم کو؟

تمھیں بھی یاد ہوگا وہ زمانہ عیشِ ماضی کا — تمنا چاہتی ہے پھر اسی لطفِ شناسا کو

ردیف ی

زمانِ فصلِ گل آیا نسیمِ مشکبار آئی — دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی
پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسنِ خوباں کا — مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی
تری محفل سے ہم آئے ولے با حالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی
بجا ہیں کوششیں ضبطِ محبت کی مگر حسرتؔ — جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ اشکبار آئی

شبِ فرقت میں یاد اس بےخبر کی بار بار آئی — بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی
ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں — کیا ہوا اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

اس تغافل شعار سے حسرتؔ — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی — تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

غمِ آرزو کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں — مری حوصلوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

آئی بجھنے کو اپنی شمعِ حیات — شبِ غم کی مگر سحر نہ ہوئی

ستم کر کے ناحق وہ نادم ہیں حسرتؔ — کہ ہم سے کبھی بیوفائی نہ ہوگی

محبت کے اثر کی طرفہ سامانی نہیں جاتی
خود اُن سے اپنی صورت اب تو پہچانی نہیں جاتی

یہ آخر کیا قیامت ہے کہ باوصفِ خردمندی
ہوس کے معرکوں میں دل کی نادانی نہیں جاتی

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

بالشِ آرزو سے آج تلک ۔۔۔ شوق کو بوئے یار آتی ہے
کوئے جاناں سے روحِ اہلِ غرور ۔۔۔ بن کے طاعت گزار آتی ہے

ترکِ شانِ کج ادائی کیجئے ۔۔۔ آئیے ہم سے صفائی کیجئے
اُن سے کر کے شکوۂ جور و جفا ۔۔۔ مرتے دم کیا بے وفائی کیجئے

پھر اک شوقِ لبِ یار کی آرزو ہے ۔۔۔ طوافِ درِ یار کی آرزو ہے
تن آسانیاں دوسروں کو مبارک ۔۔۔ یہاں امرِ دشوار کی آرزو ہے

اڑ گئی پر سے طاقتِ پرواز ۔۔۔ کہیں صیّاد اب رہا نہ کرے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے ۔۔۔ دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا ہیں اپنے عشق سے ۔۔۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں ۔۔۔ یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
شوقِ عرضِ آرزو کے وہ نرالے ولولے ۔۔۔ فکرِ مضموں ہائے عنوانِ کتابت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار ۔۔۔ جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے
یاد ہیں وہ انتظارِ نامۂ محبوب میں ۔۔۔ بیقراری ہائے ناکامِ طبیعت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں ۔۔۔ التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

تجدیدِ لطفِ یار کی لذّت میں کیا کہوں ۔۔۔ شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے

اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرتؔ   آغاز جنوں کے پھر زمانے!

خیال آشیاں ہے اب بھی نزدیک   بہت ہم دور ہیں گو آشیاں سے

یہ سب فریب ہیں آغاز عشق کے حسرتؔ   وہ لیں گے اس کرم بےحساب کے بدلے

ہم تو کیا بھولتے انھیں حسرتؔ   دل سے وہ بھی ہمیں بھلا نہ سکے

مرزا ثاقبؔ لکھنوی

مرزا ذاکر حسین نام۔ ثاقبؔ تخلص۔ آگرہ میں ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء ۱۹۔ رمضان کو پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کے تھے جب متعلقین کے ساتھ لکھنو آئے۔ وہیں پلے بڑھے اور تعلیم پائی۔ مہاراجہ محمود آباد نے بڑی داد سخن دی اور قدر بھی بہت کی۔ آخر عمر میں ریاست محمود آباد میں اکثر قیام رہتا تھا۔ وثیقہ بھی وہاں سے ملتا تھا۔ دیوان ان کا چھپ چکا ہے۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ثاقبؔ کی بھی مخصوص شخصیت رہی ہوگی۔ میں نے ان کو ایک مرتبہ اپنے یہاں پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے۔ بھاری بھرکم اور سنجیدہ قسم کے شاعر معلوم ہوتے تھے!

ردیف الف

دل تھا غم کا فسانہ خواں نہ رہا   اب کوئی لطف داستاں نہ رہا
ہم کہیں کس سے اور سمجھے کون   جب کوئی اپنا ہمزباں نہ رہا

کہتی تھی جس کو بیٹھ کے پہروں شبِ فراق — مرتے ہی یکبیک ختم وہ افسانہ ہوگیا
کچھ موت ہی پہ حصر نہیں۔ زندگی میں دیکھ — جو آنکھ سے چھپا وہی افسانہ ہوگیا
خوش کر سکا نہ میکدۂ دہر دل مرا — چھوٹا سا ایک جلسۂ رندانہ ہوگیا

دائے قسمت کہ مرا خاک شدہ دل تاقب — جل نہ جاتا تو چراغِ شبِ ہجراں ہوتا

سنائیں کیا تمہیں نیرنگِ عشق کا قصہ — تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

سر چڑھایا ہم نے چُن چُن کر خس و خاشاک کو — باغ کے تنکے تھے وہ جن کا نشیمن نام تھا

کل بہت نازاں عروجِ بخت پر صیاد تھا — بات اتنی تھی کہ میں تھا قید وہ آزاد تھا!
اور کچھ کھو بیٹھتا ہوں ہوش ہوں وہ یاد اس — جب وہ پہلو ڈھونڈھتا ہوں جو کبھی آباد تھا
قیدِ تنہائی نے پھیرا زندگی بھر کا ملال — میں جو بھولا تھا چمن میں وہ قفس میں یاد تھا

کیوں نہ چپ بیٹھوں قفس میں دورِ ہے فصلِ بہار — آہ و زاری سے مری موسم بدل جائیں گے کیا
تنکے تنکے کا خدا حافظ چلے ہم باغ سے — الوداع اے آشیاں اب جا کے پھر آئیں گے کیا
خوب سنبھلا میں نگاہِ مستِ ساقی کے حضور — کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہ گیا

گلہ رہا نہ گرا الفت کا حوصلہ نہ رہا — ترے جنوں کا بھی کچھ ٹھیک ہے رہا نہ رہا!

بے پردہ شب جو عارضِ جانانہ ہوگیا — محفل میں وہ چراغ تھا پروانہ ہوگیا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑے جاتا ہوں میں اے عبرت — مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر — خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

قوتِ غم دیکھ! زورِ ناتوانی پر نہ جا — زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

دل کہتا ہے غم کا کوئی ساماں نہیں دیکھا — ہاں سچ ہے ابھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا

سختیاں، ہمتِ دل ہو تو بدل جاتی ہیں — موت اک کھیل ہے لیکن ترے شیدائی کا

شوقِ پابوسئ محبوب تھا مجھ کو ورنہ — سنگِ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

اللہ بچائے گا تو بچ جائے گا دل بھی — تم اپنی بلاخیز نظر دیکھتے رہنا
صیاد تری قید سے چھٹنا تو ہے معلوم — آفات سے کہہ دے مرا گھر دیکھتے رہنا

یوں اکیلا دشتِ غربت میں دلِ ناکام تھا — پیچھے پیچھے موت تھی آگے خدا کا نام تھا

کیا زمانہ کا گلا ثاقب کسی کا کیا قصور — یہ دلِ غم دوست خود ہی دشمنِ آرام تھا

کلبۂ تنگ میں وحشت کا مزا کیا ثاقب — خاک اڑائی بھی تو گھر اپنا بیاباں نہ ہوا

میت تو اٹھ گئی وہ نہ آئے نہیں سہی ثاقب کسی کے دل پہ کوئی اختیار تھا

قفس میں نالے ہیں ان میں مزا کہاں صیاد تجھے میں نغمے سناتا جو آشیاں ہوتا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا
غنچۂ گل ہو گئے سو طرح کے قیدی چھوٹے کس سے ہم پوچھیں کہ واکیوں درِ زنداں نہ ہوا

وہ اٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے میں یہ سمجھا حشر برپا ہو گیا
اب کہاں ثاقب وہ بزم آرائے عشق بجھ گئیں شمعیں اندھیرا ہو گیا

مری قسمت کا دل شکن ماجرا تھا بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

لحد پر تاسف کے معنے نہ سمجھا یہ کلہے کا رونا تھا جب میں بُرا تھا

عمر بھر جلتا رہا میں اور خاموشی کے ساتھ شمع کو اک رات کے سوزِ دلی پہ ناز تھا

ردیف ر

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

جہاں تھا تنگ جس طولِ امل کے پھیل جانے سے لحد میں آ گیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

ہزاروں کاروانِ غم ہیں منزل پھر بھی خالی ہے یہ دل کتنا بڑھا لے وسعت تیری رہگذر ہو کر

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

ردیف ل

میں نہیں کہتا کہ دنیا کو بدل کر راہ چل خار ہیں پیراہنِ گل میں سنبھل کر راہ چل

ردیف ن

خدا آباد رکھے ہم صفیرانِ گلستاں کو جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

کہوں کیونکر کہ میں کچھ بھول آیا ہوں نشیمن میں مرا صیاد کہتا ہے کہ کیا رکھا ہے گلشن میں

بند ہوتے ہیں دریچے مگر ان آنکھوں کے کب تک اے بھولنے والے ترا رستہ دیکھیں

جواب زخمِ جگر دے رہا ہے ہنس ہنس کے وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں

نہیں معلوم میں کس حال میں ہوں باغِ عالم میں قفس والے بھی مجھ کو دیکھ کر فریاد کرتے ہیں

اس کے نیرنگ کا تماشا ہوں جز فریبِ نگاہ میں کیا ہوں

ردیف ی

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی اللہ رے سناٹا ! آواز نہیں آتی

پسر اور پائے درباں ! وحشتِ دل کا تقاضا تھا مجھے اس بے بسی پر خود ہنسی بے اختیار آئی

گلشن کی طرف منہ کئے بیٹھا ہوں قفس میں شاید کوئی دمساز نکل آئے ادھر بھی

میرے نالوں سے ہے برہم باغباں
یہ خفا ہونے کی کوئی بات تھی ؟

لہرائے دل کی طرح گلستاں کبھی کبھی
میری طرح جو ابر ہو گریاں کبھی کبھی

بے شانہ اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے
میں دیکھتا ہوں خوابِ پریشاں کبھی کبھی

نازاں نہ ہو کہ محفلِ دنیا میں سازِ عیش
ہوتا ہے بارِ خاطرِ انساں کبھی کبھی

خدا جانے اسیرِ غم کی حالت کیا ہے دنیا میں
بہت چپ چپ سی ہیں کچھ رات سے کڑیاں سلاسل کی

ہجر کی شب نالۂ دل یوں صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

آیئے حالِ دلِ مجروح سنئے۔ دیکھئے
کیا کہا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہو گا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے
تڑپتا ہے شبِ غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
بتادے نامرادی کونسی باتیں کروں دل سے

وہی الفت ہے جس کو نشتروں کا کام آتا ہے
لہو دیتی ہے دل کی رگ جو تیرا نام آتا ہے
شبِ غم ہے تو ہو لے دل نہ گھبرا صولِ محنت سے
ہمیشہ آفتوں کے بھیس میں آرام آتا ہے

سوائے رحمتِ رب کچھ نہیں ہے
بہت کچھ تھا مگر اب کچھ نہیں ہے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے
ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

بہت سے یاد ہیں محفل کے بیٹھنے والے
کبھی تو بھول کے کوئی سرِ مزار آئے
جواب مل تو گیا گو وہ دل شکن ہی سہی
یہی صدا مرے مالک پھر ایک بار آئے

سامنے آتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
قیس اتنا دیکھ تو لیتا کہ کیا محمل میں ہے

دو روز کی زندگی ہے ثاقبؔ
ہم کشور و تاج کیا کریں گے؟

بہار آئے گی پھر صیاد لیکن یہ سمجھ دل میں
بڑی مشکل سے جا کر طاقتِ پرواز آتی ہے

انفعال وداد خواہی کا سماں دیکھا کئے وہ زمیں دیکھا کئے ہم آسماں دیکھا کئے
ایک ہم تھے آتشِ گل پر جو روئے مدتوں ایک وہ بھی تھے جو جلتا آشیاں دیکھا کئے

آرزو لکھنوی

سید انور حسین نام۔ منجھو صاحب عرف۔ آرزو تخلص۔ ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے خاص باشندے تھے۔ تین دیوان فغانِ آرزو، جہانِ آرزو، نشانِ آرزو ہیں۔ خالص اردو کا مجموعہ سریلی بانسری ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ، سلام، رباعی، مرثیئے، گیت، ڈرامے اور داستانیں لکھیں۔ گیتوں میں وہ درجہ حاصل کیا جو ابھی تک کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

ردیف الف

آرزو! اتنا سمجھ رکھو یہ ہے چسکا برا بڑھتے بڑھتے دکھ نہ بن جائے کہیں یہ تاک جھانک

کیا زمانے کا انقلاب ہوا یاریوں دور جا بسے اللہ

جس کی شادابی پسند آئی وہ صحرا جل گیا سبز قدمی کے اثر کی پیش قدمی دیکھئے

آجائے اگر دل پہ حکومت کرنا پھر دونوں جہاں کی سلطنت حاصل ہے

اب آنکھوں کے آگے اندھیرا رہے گا جھلک ڈوبتے چاند کی دیکھ لی ہے

دوست نے دل کو توڑ کر نقشِ وفا مٹا دیا　　سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

معما بن گیا رازِ محبت آرزوؔ یوں ہی　　وہ مجھ سے پوچھتے جھجکے مجھے کہتے حجاب آیا

ردیف ب

بجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب　　دھواں سا تو ہے تو نکلنا کہاں اب
وہ ہر آنے والے پہ دھوکا انھیں کا　　وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

کھا کے چپ کے رہو یہ بات ہے اور　　آرزوؔ جی ہی جانتا ہو گا !

ردیف ڑ

آرزوؔ توڑا ہے جس نے آسرا　　پھر بھروسہ کر اسی پر جی نہ چھوڑ

ردیف ل

جنھیں سمجھتے تھے دیدارِ یار کے قابل　　وہ آنکھیں ہو گئیں اب انتظار کے قابل
مجھی سے عہد قسم کھا کے میرے ہی سر کی　　کرو وہ بات جو ہو اعتبار کے قابل
جمال تو نے دکھا کر بگاڑ دی عادت　　یہ آنکھیں اب نہ رہیں انتظار کے قابل

ردیف ن

بیٹھے ہیں کہاں اہلِ سند آغاز و نیک انجام یہ بد　　یا بزم طرب یا کنج لحد، یا وہ مجمع یا کوئی نہیں
قتالِ جہاں معشوق جو تھے سوتے ہیں پڑے مرقد ان کے　　یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں

کوس کٹ سے تھے چاہ کے ۔ دھوپ میں بتور آ گئے　　ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں
آگ سی ہے لگی ہوئی چھوڑ و ہٹو ، الگ رہو　　بجلی ہے ایک ایک نس ہاتھ کہیں نہ جھنجھنائیں

جس نے کہ چین کھو دیا ہے وہی جی کا چین بھی
یہ بھی نہیں کہ رکھیں دھیان یہ بھی نہیں کہ بھول جائیں

ترکِ مے کرتے ہی گھنگھور گھٹائیں آئیں
لیجئے پھر سرِ توبہ پہ بلائیں آئیں

وہ تڑپا کے اے آرزو ہنس دیئے کیوں
یہ جی چاہتا ہے کہ اب سر پہ کھیلیں

ردیف ی

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا؟ ہنسنے لگی کلی کلی!
کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں مَلی دَلی

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی
ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی
غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہیے جی کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی
دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

درِ دل آرزو دروازۂ کعبہ سے بہتر تھا
ارے غفلت کے مارے تو نے پیشانی کہاں رکھ دی

سمجھے تو ہر بات میں لاکھ گھاتیں
جو سنئے تو باتیں بڑی بھولی بھالی

کالی گھٹائیں کوندا لپکا اُڑ کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

ردیف ے

جذبِ نگاہ شعبدہ گر دیکھتے رہے — دنیا انہی کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

وحشت ہم اپنی بعدِ فنا چھوڑ جائیں گے — اب تم پھرو گے چاک گریباں کئے ہوئے

نہ ٹوکا کسی نے ستانا برا ہے — بُرے تم نہیں ہو زمانہ بُرا ہے
یہ بے رنج کا رنج سہنے سے حاصل — بُری بات کا یاد آنا بُرا ہے
نہ کہئے برا آپ تو آرزو کو — وہ ہے آپ ہی کا۔ یہ مانا بُرا ہے

دل کو وہ امتحانِ محبت میں آرزو — پہروں بدل بدل کے نظر دیکھتے رہے

گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے — رات دو رات کا بسیرا ہے
جی کو بڑھتی ہوئی اُداسی نے — کیا اکیلا سمجھ کے گھیرا ہے
جب سے اوجھل ہے تو۔ ان آنکھوں میں — رات کیسی کہ دن اندھیرا ہے
چاہ میں یوں ہوا ہے جی بے آپ — کہ نہ تیرا ہے اب نہ میرا ہے
آرزو بوجھ بڑھتا جائے گا — چل کھڑا ہو ابھی سویرا ہے

تیرے تو ڈھنگ ہیں یہی اپنا بنا کے چھوڑ دے
وہ بھی بڑا ہے باؤلا تجھ کو جو پا کے چھوڑ دے
بیڑا ہو پار کیا بھلا، باندھا ہے اس سے آسرا
کھول کے ناؤ بے چلے دھارے پہ لا کے چھوڑ دے
اس نے لبھا کے آرزو بدلی ہے مجھ سے آنکھ یوں — جیسے کوئی چھڑک کے تیل آگ لگا کے چھوڑ دے

چھری لا ہمیں دیدے ڈرجانیوالے — نڈر تجھ سے بڑھ کر ہیں مرجانیوالے

کھکھیڑیں ہمیں آرزو تونے پھر بھی — وہی جی کی آن بن ۔ وہی بانکپن ہے

کہہ کے یہ ۔ اور کچھ کہا نہ گیا — کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے

ہر برائی سے بچائے رکھتی ہے اتنی سی بات — آرزو ہر ایک کو اپنے سے اچھا جانئے

مذاقِ عشق یہ ہے نکتہ چیں نہ بن ناصح — پسند میری پرکھ میری آنکھ میری ہے

آگئی پیری جوانی ختم ہے — صبح ہوتی ہے کہانی ختم ہے
آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ — اسکی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

متفرق

رسوائی مزید کا امکاں نہیں رہا — ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

رسائی کا اُن تک نہ تھا کوئی حیلہ — بہت خوش ہے مجرم گرفتار ہو کر
پہونچتے ہیں اُن تک پہنچ جانے والے — تہ تیغ ہو کر سر دار ہو کر
خجالت کی آئینہ بندی ہے ہر سو — کدھر جاؤں اپنے سے بیزار ہو کر

مٹا کر اس کے اک فقرے نے ساری داستاں رکھدی — کہ نا ئید سخن پر تہمت حسنِ بیاں رکھدی

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے — کوئی گردش ایسی بھی ملے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے

اُستاد تحمل حسین خاں

"واکھوس"

چونکہ یہ واکھوس بہت زمانہ ہوا لکھنؤ کے بڑے مشہور رسالہ "اودھ پنچ" میں دیکھا تھا۔ اس لئے حسب ذیل عبارت بھی اسی پرچہ جلد ۱۸ نمبر ۴ (مورخہ ۵۔ فروری ۱۹۳۳ء) بعنوان مضامین غیر، سے نقل کرنا ضروری ہوگیا تاکہ پڑھنے والوں کے لئے سہولت ہو سکے۔

"فتحپور ضلع بارہ بنکی کے ایک شاعر بالطبع ظریف اور فطری لطیف تھے۔ اُردو کا کلام بھی اُن کا خوب ہوتا تھا اور "دہقانی" زبان اس فصاحت کے ساتھ نظم کرتے تھے کہ آج تک ان کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔ ذیل کا مسدس بنام واکھوس (جو کہ واسوخت کا دہقانی نام ہے) ممدوح نے بہت زمانہ ہوا کہ بفرمائش امیر الدولہ سعید الملک راجہ سر محمد امیر حسن خاں بہادر مرحوم والئی محمود آباد نظم فرمایا۔ اور صلہ بھی معقول پایا۔ یہ گوہر نایاب آج تک بعض احباب کے خزانہ میں محفوظ تھا۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ عرض بازار ہو۔ عید الفطر کی خوشی میں ہم نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ ناظرین کی خدمت میں بطور تحفۂ عید پیش کریں۔

انشاء اللہ خاں مرحوم نے "گیان چند بنئے" اور "بھنگی امیر بخش" کی ہجو میں دلی کے مہنتوں کی زبان حسن خوبی سے نظم کی ہے فتحپوری شاعر نے دہقانی ٹھاکر کی زبان نظم کرنے میں انشاء اللہ خاں سے کچھ کم حذاقت و مہارت کا ثبوت نہیں دیا۔ مگر جس طرح انشاء کی ہجو کا پڑھنا اجنبی کے لئے دشوار ہے اسی طرح ٹھاکر کی دہقانی فصاحت بھی خاص لہجہ کی پابند ہے۔ ہم بعض علامات مقرر کرتے ہیں۔ اگر ان علامات کی پابندی کا خیال آپ نے ملحوظ رکھا تو لطف کامل حاصل ہوگا۔"

— تلے اوپر نقطے علامت یائے مجہول (ہے)

— کھڑا زبر علامت یائے معروف (ہی)

زیر بہ ایں شکل ِ ، علامت کسرۂ معروف
" " " " مجہول
الٹا پیش بہ ایں شکل ، علامت ضمۂ مجہول
" " " " "آوٗ" کی آواز کے لئے
زیر بہ ایں شکل ۔ "آوٗ" کے لئے ۔ باقی اعراب معمولی ہیں۔

ٹھاکر صاحب عشق میں مبتلا ہو کے اپنے نائب کو وصی مقرر فرماتے ہیں اور اپنے عشق کی رام کہانی یوں سناتے ہیں۔

کاہی کبھو الاکے کار کھت چیت رہی — گاؤں ماں جانے کے کنکوت کرت کھیت رہی
(علاقے) (میں)
آپ پٹا ہم اساہن کا سد اوبیت رہی — اپنے مہتو سے بجر بھبنیٹ بھی لے لیت رہی
(مزارعے) (نذر)

کاہے جر جائے کریج اب نہ ممتا کو ہو لے کے
(جل) (کلیجہ) (تمباکو)
ینہہ کے بھونچھ ماں ہم بیٹھ ہیں اُلّو ہو کے
(محبت) (گھونسلا)

جو کہی تم تے وہی ست گجو دھر جانیو — ہم کا منئی نہ کبھو منئی کا مانجھر جانیو
(سے) (سچ) (آدمی) (ڈھانچہ)
تم کا نائب کی ہا آپن تم اپن گھر جانیو — آس کیہو کام نہ اب آپ کا نوکر جانیو
(کیا) (اپنا) (ایسا) (کرتا)

کھرچ کی اور تے تنگی نہ دیہو تم ان کا
(خرچ) (طرف سے)
تم کا سونپت ہیں رکھیو جین سے ٹھکرائن کا

جو تو بیاکل ہے بہت کاکہی ہم اپنی کہہا　　　پیت تو ہوت مہار وگ ہے بس منیٔ کا

(جی، (بیکل)　　　(کہانی)　　　(محبت)　　　(بہت بڑا عارضہ)

کھیمہ چور پور وا ماں جہ دن سے سُناصاحب کا　　　کھوب بالن مان ملا تیل کا جلبیھیں ایچا

(خیمہ)　　　(جس دن سے)　　　(خوب، بالوں میں　　　زلفیں سنواریں

دھر کے موڑے پہ چمکدار پیٹر یا نکسن!

رکھ کے سرپر ٹوپی نکلے

جیسے تن جات ہے بھن کاڑھ کے کریا نکسن!

سانپ

کالھ دُدیٔ کوُس پہ ان کا جو سناسبے مکام　　　جیو ماں آو اکہ کرن جایئے کے صاحب کا سلام

کُل　دو　مقام

چڑھ کے گھوڑے سے پڑے ٹھاٹ سے تھان جو لگام　　　گھوڑ کس پینگ بھرس! کاکہی تم تے کا نام

پکڑا　　　کیا

پاؤں دھر دین رکابن ماں جو کھتیلا ایسے!

رکاب

ہم چلے جات رہین راہ ماں چھیلا ایسے!

ایک بگیا ماں پڑا پال رہے کھسبورت　　　بیٹھی وہ ماں رہی اک کامنی سُندر مورت

نائیٔب اب کاکہی بس رام دہے اس بھل صورت　　　ہم جو دیکھا تو ہی دور سے ہم کا گھورت

رام قسم　بھلی　　　ہم کو

دھر کے کس مینیخ دہس ہمرا کریجن جیسے!

کیا مسل دیا　کلیجہ　گویا

میکوا کا ہے کہی ہے نا؟ کہت ۂن جیسے

کیوں　کہتا ہوں　جو

ا خطاب بہ خادم خاص

پھر کہاں تاب رہی گھوڑے سے کو دن جھم سے　　من ماں یہ سوچ بھا کیسے ملن جالم سے

ظالم

ہائے دیدی کہا اور بھوئیں ماں گرن لبس دھم سے　　ہوئے گئیں گست تجب بوڑگوا جیو گم سے

بہن　　زمین　　غش عضب　　جی غم

میکوا حال یہ دیکھس تو بہت گھبراوا
بولا دوڑ کو آؤ! ٹھاکر کا ہے مرچھا آوا

غش

ہمری چھاتی ماں لگی سانس چلے جب گُھر گُھر　　دوڑے گجراج ۔ مہاپال ۔ بھون ۔ ملبھدر

گوڑ میچس کواوا اور کواو سنگھاس انتر

پاؤں دبائے　　سنگھایا　عطر　　کواو بولا کہ تنک ہوس ماں آؤ ٹھاکر!

زرا　ہوش

ہم مُداو کواو جتن سے نہ جگائے جاگن
لیکن　کسی طرح
گڑبڑ اوا جو بہت پیٹے تلائے بھاگن

تالاب

ہم تلائے جو گئن تب تو وہ چنچل بدکھاؤ　　میکو اسے ہنس کا ہے لیسے باری ات آؤ

بدخو

پال تے کھینچ کے پلکا تنئی باہر تو بچھاؤ　　تم سے ٹھاکر کا تو ہم بوجھ گئیں سب چھپاؤ

پلنگ　ذرا　　　　فیل

یہی پلکا پہ ابہئے تو بیٹھا اُن کا
اُن کے پھینن کا مجا کھوب چکھیا اُن کا

نخروں　مزا　خوب　چکھاؤں گی

ہم تلائے تے پھرن باگ ماں پلکا پاوا　　تب اوہے چھیل چھبیلی کا تنک بلوا وا

پاس بٹھلائے کے اورن تے یو ہم کہلاوا　　　تم تو بجیا ماں ہوا کھویب کرت ہو کھاوا!
ہم کہا ان سے کہیں آنکھ سے لگی نہ کرو
میکو اکا سے کہن ہنس کے دل لگی نہ کرو
وہس تو بیت گو! ہم کا یوہی بات بات　　　جب سورج بوڑ گئے اور تنک آئی رات
دن گزر گیا باتوں باتوں میں
ہم کہا ان تے کہ ہم تو ہیں اب گھر کا جات　　　بولیں رہ چلتے کی کچھ ہوت نہیں مولیکات
اس نہ تم ہکی ہنک کو اوکا جی جار کے جاؤ
ناحق　　　جلا کے
جی کے اب کا کربی جات ہو تو مار کے جاؤ
ان کی آنکھن تے لگے آنس بہے جب جھر جھر　　　پھر تو تھامے نہ تھما جیو کا مسوسا دھر دھر
ہم کہا روؤ نہ جیو ہمرا رہت ہے بر بر　　　ہاتھ چھاتی پہ رکھو آنچ ہے نکست بھربھر
نکلتی ہے　　　ہمارا
ہوئے سکت اب تو ہے اہ تیر تے جاوب کیسے
اس جگہ سے
بن کہے مر تے بھلا گوڑ اٹھاوب کیسے
پاؤں
پھر تو بس ریجھ گئیں بیٹھ ماں مکا مارن　　　اٹھ کے پلکا سے گئن پال ماں دیا بارن
مانگ کے ہم تے انگوچھے کا بچھونا جھاڑن　　　اور سوئن کی جہا گاہ اوسے ہم پر دھارن
ہم کہا ان تے کی ہیہو کام نہ ایسا دیکھو
کھر پچ آپن نہ کہو ساتھ ہے سیدھا دیکھو
آٹا دال

بولیں تم روج ہیاں کا ہے کا آوا کر یہو اور پھر آئی کے تم روج نہ گھاوا کر یہو
روز یہاں کیوں آیا کرو گے

ہم تو جانت ہیں کبھو منہ نہ دکھاوا کر یہو بیٹھو بس تم یوہنی بکو اس مچاوا کر یہو

میکوا پیڑ تلے جائی کے چوکا دیدے
دیدی کھٹیا تلے چیلا ہیں تو اوکا دیدے
پلنگ لکڑی

میکوا پھیر کے منہ ہمری طرپھ دیکھے لاگ ہم کہا ہمری یہ مرجات رہی سارے بھاگ
چولھا آپن تو الگ بارلے اور لائی کے آگ جا کرٹھیا ماں جو کا نرڈ کا ملے بھونج لے ساگ
جلا لے کڑاہی مرضی سرسوں کا ساگ

ہم جہت ان کا کوئی بات کی تکلیپھ نہ ہوئے
ان کی دیدی سے نہ ڈر دیدی کوئی چیپھ نہ ہوئے

سانجھ تو ہونے لگی اب جائی کے کربی اشنان آگے ٹنٹا ہے یہی ہم کا بتت ہے اوسان
شام طوالت آسان
آج کر من ماں تو پوری کی لکھت ہے بھگوان سیر آٹھ اک توئی اُبھیں کا ڈھلے تھیلا سے پسان
قسمت میں نکال لے آٹا

ہم او او دئی دوئی ہیں منئی بھوک ہے کم ہوئی جے ہے
وہ دو
پن پیا دب کے لئے اتنی رکم ہوئی جے ہے
پانی پینے کے لئے

بانٹ پھر ساتھ کے منئی کا دیہا ہم چٹھا اور کہا باگ ماں تم جائی کے سینکو بھوز!
آدمیوں کا پرچہ لکھ دیا

گھوڑ کا پیڑ تلے باگ ماں بندھوائی دیہا   آپ کنوئیا پہ گئن جائے نہاوا دھووا

بستر کے پر جوں پھرن آئے لگاوا بیسڑا

ہم اور اوئی دونوں چنے بیٹھ کے کھاوا بیڑا

معشوقہ   پان

میکو اتنے ماں چوکا سے کھس ہمسے پکار   آئے بھوجن کرو ٹھاکر ہے رسوئیں تیار

ہم تو چوکا ماں گئن او پیہا پنہن کا اُتار   گوڑ کا دھوئے کے اور بیٹھ گئن پلتھی مار

لیا   جوتے

میکو اپرس دہس ساگ۔ اور پوری جھٹ سے

نکال دیا

ایک گھنٹہ ماں تو سرپیٹ گئن سب سٹ سے

پھر تو چوکا سے بہن جھاڑ کے چُوترا بھر   پیٹ پر پھیر کے ہاتھ اور ڈکارن "ارار"

پال ماں جائے اُڑائن تنی سٹ سٹ نریر   گوڑ پھیلائیکے پھر پوڑ رہن پلکا پر

حقہ   لیٹ رہے

اوئی کہن آئے کے لیٹت جو بنے سوئی رہی

ٹر چلو ٹھور کرو ہم ہو تنی سوئے رہی

کھسک چلو جگہ کرو

ٹھور پائن تو گرے لاگ کے پھر سوئے رہن   پھر تو اس سوئیں کہ دونوں نہ جگائے جاگیں

جگہ پائی   گلے لگ کے

اوئی مڈا ہوت بھر رہے جو تنک چیت بہن   ٹینٹ ماں ہمرے رُوپیا رہن ٹووَن لاگیں

لیکن ہوتے صبح   کمر   ٹوٹنے لگیں

ہم کہا کا کریو بولین جو پیتن ہے ستم

گوٹ ہنگا مان گر نئے کی لگن تن پہ ستم!

دس روپیا رہن بس ٹینٹ ماں ہم کھول دیہا اور کہا لیو پران آج سیا دٔ لہنگا

سلاؤ جان لو

پھر کہا ان تے کہ اَیہو؟ جو بُلیبا تمُکا بولیں ہم کاہی یو حال تو جانے د دیا

سن کے یو آنس تو آنکھین ماں تنک بھر لائیں

ہم مُدا گھوڑ پہ اسوار بھیئن گھر آئیں

عاشق حسین سیماب اکبر آبادی

۱۲۱۹ھ جمادی الثانی مطابق ۱۸۸۰ء کی صبح کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ الف اے پاس کر کے، ا سال کی عمر میں کالج چھوڑ دیا۔ ۱۸۹۸ء میں داغ کے شاگرد ہوئے ملازمت کی اور ساتھ ہی ساتھ رسالوں کی ادارت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں ملازمت چھوڑ دی اور آگرہ میں علمی مشاغل کا سلسلہ شروع کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئے اور وہیں ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ اُن کی تصانیف "سازِ و آہنگ"، "نفیرِ غم"، "سرودِ غم"، "دستور الاصلاح" اور "کارِ امروز" مشہور ہیں۔

ردیف الف

اب تو یہ حال ہے نظر سوگوار کا کیفِ جمال ہے نہ مزہ انتظار کا

منہ زرد خون یاس میں پلکیں بھری ہوئی عالم تو دیکھئے سحرِ انتظار کا

یہ ناز منفعل یہ ادائیں حجاب کی منہ ہو تو چوم لوں نگہِ شرمسار کا

نامہ گیا کوئی۔ نہ کوئی نامہ بر گیا — تیری خبر نہ آئی۔ زمانہ گزر گیا
اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے — دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

ردیف ن

ہر چیز پہ بہار ہر اک شے پہ حسن تھا — دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں — اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال میں — جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

ردیف ے

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے
قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے — کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جوش ملیح آبادی

نام شبیر حسن خاں تخلص جوش ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ وطن ملیح آباد ہے لیکن رہے زیادہ تر وطن سے باہر۔ زیادہ تر حیدر آباد دکن اور دلی رہے اب مستقل قیام پاکستان میں ہے جوش طبعاً آزاد اور بے دھڑک قسم کے انسان ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے یہاں ڈھلتے ہیں۔ کتنا ہی کہہ جائیں نئے نئے لفظوں کی ارزانی اور سہولت ہی دکھائی دیتی ہے الفاظ زوردار اور معنویت سے پُر ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہوں تو زیادہ صحیح ہوگا کہ بڑی جیّد شاعری ان کی ہوتی تھی۔

ان کی تصانیف روح ادب۔ نقش ونگار۔ شعلہ وشبنم۔ حرف وحکایت۔ جنون وحکمت

فکر و نشاط، آیات و نغمات۔ عرش و فرش حسینؓ اور انقلاب۔ سرود و خروش اور سموم و صبا ہیں۔

ردیف الف

کرم آشنا ہے کہ سفاک ہے
بہر رنگ عورت خطرناک ہے
جو بھاگے گا اس سے اماں پائے گا
نہ بھاگا تو کمبخت پچھتائے گا

دل ہوا اتنا خوشی سے ہم کنار
روح کو احساسِ غم ہونے لگا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

یہی تو ہیں دوستو محکم انھیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم نگاہ میری شباب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیم دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا
جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جائیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے وہی مہرِ دبستاں کیا کہنا
ذرّے ذرّے پر جہنم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا

کب سے ہے ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام　　وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا!
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلب گاری میں　　چشمِ انسان ہے ہر سو نگراں کیا کہنا!
ہاں بایں شدتِ آیات و احادیثِ حجاب　　دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا!
ترش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے　　پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا!
کب سے قرنوں کا ہے سینے پہ اٹھائے ہوئے بار　　پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں کیا کہنا!
للہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے باوصف　　ہے وہی گرمیِٔ بازارِ بتاں کیا کہنا!

ردیف ب

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب　　آفریں اے نگاہِ عالمتاب
آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں　　مشورے دیکے ہٹ گئے احباب
بار سے اٹھے تو ناصحِ مشفق!　　ہاں! کدھر ہے صراحیِٔ مےناب
شب جو وہ بیٹھے میرے پہلو میں　　مسکرانے لگی شبِ مہتاب

ردیف ر

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا باربار　　ظلمتوں پہ مارتا ہے جس طرح رستم کے تیر
یونہی وحشت ناک عصیاں کی اندھیری رات میں　　آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوشؔ　　بنتا نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

ہاں یاد کر سحر

ہاں یاد کر سحر وہ صبا کی حکایتیں　　مہکی وہ کاکلیں وہ بہکتی روایتیں

شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے / نیچی نظر میں عشق و جوانی کی عنایتیں
زلفوں کی وہ نسیم سے برہم کہانیاں / پلکوں کی وہ خمار سے بوجھل کہانیاں
آنکھوں پہ گیسوؤں سے برستے وہ بوستاں / کانوں پہ لعل لب سے اترتی وہ آیتیں
ناشستہ رخ سے سرخ دھندلکے ہیں ہائے جوش / چھلکے پہر وہ شکوے سے بہتر شکایتیں

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے / سرد مہری سے قدیم احباب کے رخ زرد ہیں

جہنم سرد ہے جنت کے دکھلائے جاتے ہیں / سر محشر بچاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں
غضب ہے یہ ادا ان کی دم آرائش گیسو / جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں
کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی / بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

گدائے راہ ہے رسم وفا سے حلقہ بگوش / جہاں پناہ کے طبل و علم کی بات نہیں
خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پاؤں کی زنجیر / حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں
دل اپنی وضعِ محبت سے ہے رہینِ وفا / خطا معاف یہ لطف و کرم کی بات نہیں
یہاں مزاج کی افتاد میں ہے ذوقِ سجود / کسی کی شوخیٔ نقشِ قدم کی بات نہیں

لدھیانی ۔ ے

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے / چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی / ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر واعظ / وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے
شکایت کیوں اسے کہتے ہو یہ فطرت ہے انساں کی / مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل مگر یہ زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

نمایاں منتہائے سعیٔ بیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

نسیم بے نیازی آ رہی ہے بامِ گردوں سے
عروسِ مدعا کی زلف برہم ہوتی جاتی ہے

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ تماشا کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

سمجھ میں آئیں کیا باریکیاں قانونِ قدرت کی
عبارت کثرتِ معنیٰ سے مبہم ہوتی جاتی ہے

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی رکسک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوائیں پلّو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

وہ پہلو میں اک سیم بر نوجوانے
یہ کاکل سحابے یہ عارض بہارے

یہ مژگاں خدنگے یہ ابرو کمانے
یہ تمکین خوابے یہ شوخی شرارے

کبھی لیٹ جانا وہ کہنی کے بل پر
کبھی بیٹھ جانا وہ میرے سہارے

کبھی دیکھ کر مجھ کو نرمی سے کہنا
بڑے دکھ میں رہتے ہیں عاشق بچارے

وہ میرا یہ کہنا کہ گو بعدِ مدت
مگر تم مرے پاس آئیں تو بارے

وہ اک دردسا فرطِ حرماں کے باعث
وہ اک غم سا بارِ مسرت کے مارے

وہ بھولا سا اک گیت غلطاں فضا میں   سجن آج آئے ہمارے دوارے

اے عقل جنوں زار میں جاؤں کہ نہ جاؤں   پھر دامنِ کہسار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
پھر دشتِ جنوں بار میں جاؤں کہ نہ جاؤں   منزل گہ دشوار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
اب کوچۂ دلدار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

بیٹھا ہوں سرِ جلوہ گہِ عام تقشکر   رگ رگ میں لئے بادۂ گلفام تقشکر
اک عمر سے ہوں معتکفِ بامِ تصور   مدت سے ہوں منجملۂ خدامِ تقشکر
اب حسن کی سرکار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

حسینؑ اور انقلاب

بیگانۂ حدود ہے انساں کی آرزو   پیچیدہ ہر نظر میں ہے اک تازہ جستجو
تھمتی نہیں کہیں بھی تمنائے برق خو   ساقی کا وہ کرم ہے کہ بھرتا نہیں سبو
ارماں کی شاہراہ میں منزل نہیں کوئی
اس بحرِ بیکنار کا ساحل نہیں کوئی

یوں تو غمِ معاش کا سوز نہاں ہے اور   تکلیفِ جانگدازئ عشقِ بتاں ہے اور
لب تشنگیٔ شیب و عذابِ خزاں ہے اور   اعلانِ امرِ حق کی مگر داستاں ہے اور
گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود (صائب)

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا   رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کجکلاہ کی ہیبت کا سامنا   قرناوطبل و ناوک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا وہ حسینؑ
جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا وہ حسینؑ
جو خلوتی شاہدِ قدرت تھا وہ حسینؑ
جس کا وجود فخرِ مشیت تھا وہ حسینؑ
سانچے میں ڈھالنے کے لئے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسینؑ
جس کی نگاہ مرگِ حکومت ہے وہ حسینؑ
اب بھی جو محوِ درسِ بغاوت ہے وہ حسینؑ
آدم کی جو دلیلِ شرافت ہے وہ حسینؑ
واحد جو اک نمونہ ہے ذبحِ عظیم کا
شاہد ہے جو خدا کے مذاقِ سلیم کا

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج
جو مرگ و زندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج
سر دے دیا مگر نہ دیا ظلم کو خراج
جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیاء کی لاج
سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مردِ سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات

یہ صبحِ انقلاب کی جو آجکل ہے ضو
یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرا رہی ہے لو
در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ سازِ دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

ہر چند ایک شاخ چمن میں ہری نہ تھی
ماتھا عرق عرق تھا لبوں پر تری نہ تھی
باطل کی ان بلاؤں پہ بھی چاکری نہ تھی
یہ داوری تھی اصل میں پیغمبری نہ تھی
رنگ اڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا

عزمِ حسینؑ عزم تھا پروردگار کا

تھی جس کے دوشِ پاک پہ اہلِ وفا کی لاش
انصار سرفروش کی لاش اقربا کی لاش
عباس سے مجاہدِ تیغ آزما کی لاش
قاسم سے شاہزادۂ گلگوں قبا کی لاش
پھر بھی یہ دُھن تھی صبر کی زلفوں سے بل نہ جائے
اس خوف سے کہ حق کا جنازہ نکل نہ جائے!

پھر حق ہے آفتابِ لبِ بام اے حسینؑ
پھر بزمِ آب و گل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسینؑ
پھر حریت ہے موردِ الزام اے حسینؑ
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لئے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

اے جانشینِ حیدرِ کرار المدد
اے ممتحن دلوں کے قافلہ سالار المدد
اے امرِ حق کی گرمیٔ بازار المدد
اے جنسِ زندگی کے خریدار المدد
دُنیا تری نظیرِ شہادت لئے ہوئے
اب تک کھڑی ہے شمعِ ہدایت لئے ہوئے

اس کے آگے دولتِ دنیا کا ذکر او ابن سعد
کھیلتی ہو جس کی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ
اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ

سیّد الشہداءؑ

شادی و الم رنج و خوشی۔ مدح و مذمت
آشفتگی و عیش و طرب درد و مصیبت
آشوبِ جہاں شامِ بلا صبحِ مسرت
سب ایک نظر آئیں جو ہو روح میں قوت

صد شکر مرے دل پہ حقیقت یہ عیاں ہے
ہر آئینے میں دوست کی تصویر نہاں ہے

دب جاتے ہیں غم سے جو خیالات ہیں اسفل　　ہو جاتے ہیں انسان کے اخلاق مکمّل
غم نفس کا قاتل ہے تو باطن کی ہے صیقل　　مر جاتا ہے جب سانپ نکل جاتے ہیں سب بل
جی کھول کے رونا ہے علاج آنکھ کے تل کا
ہر آہ سے کچھ زہر نکل جاتا ہے دل کا

یہ غم ہے وہ راحت ہے یہ عقبیٰ ہے وہ دنیا　　ان تنگ خیالات کے سائے سے نکل آ
ہر فکر سے منہ پھیر لے ہر رنج کو ٹھکرا　　اونچا ہو، بلندی پہ جھلک روح کو چمکا
بجلی ہے جہاں میں رخِ جاناں کی تجلّی
وہ دیکھ بلندی پہ ہے عرفاں کی تجلّی

اس بزم کے آداب ہیں سرچشمۂ حکمت!　　آرام سے وحشت ہے تو لذات سے نفرت
پھر جائے جو ہستی سے نظر عین سعادت　　دل پچھلے پہر رات سے دھڑکے تو عبادت
ہر دن جو گزرتا ہے یہاں ایک صدی ہے
اس دائرے میں موت حیاتِ ابدی ہے

امامِ حسینؑ سے خطاب

قربان ترے نام کے اے میرے بہادر!　　تو جانِ سیاست تھا تو ایمانِ تدبّر
معلوم تھا باطل کے مٹانے کا تجھے گر　　کرتا ہے تری ذات پہ اسلام تفاخر
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا
تلوار کے نیچے بھی وہی نعرۂ حق تھا

جس قلب میں ہے کفر وہ دوزخ کا دھواں ہے　　جس دل میں معارف ہیں وہ اک برقِ تپاں ہے

باطل کا جو حامی ہے وہ بے نام ونشاں ہے
جو حق کا طرفدار ہے اک شیر ژیاں ہے
سچائی کے قدموں پہ سرِ فتح وظفر ہے
جرأت بھی اسی سمت ہے ایمان جدھر ہے
بیدرد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا
کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
ٹھوکر ہے یہ وہ جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا
وہ تخت ہے کس قبر میں وہ تاج کہاں ہے
اے خاک بتا۔ زور یزید آج کہاں ہے

مٹا ڈال احساس آزارِ غم کو
جو دانا ہے تو پھینک دے بارِ غم کو
جلا دے فرامینِ سرکارِ غم کو
جری ہے تو ہر ایک دیوارِ غم کو
ہلاتا۔ بھٹاتا۔ گراتا گزر جا
زمان ومکاں کی ستم رانیوں پر
مصائب کی ہنگامہ سامانیوں پر
حیاتِ دوروزہ کی نادانیوں پر
خطا اور خطا کی پشیمانیوں پر
نظر ڈالتا۔ مسکراتا گزر جا
مسافر کو کب ہے مفر گھاٹیوں سے
جھجکتا ہے کیوں آ گزر گھاٹیوں سے
نہ ڈر وادیوں سے نہ ڈر گھاٹیوں سے
زمانہ کی پر شور وشر گھاٹیوں سے
اگر مرد ہے گنگناتا گزر جا
جہاں کی روش ہے بہت ظالمانہ
ریا ہر فسوں ہے دغا ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوہ عامیانہ
کہ آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو زمانہ
زمانے کو آنکھیں دکھاتا گزر جا

اترا ہوا چہرہ

وادیوں کی یاد کہساروں کی یاد — گلرخوں کی یاد ۔ مہ پاروں کی یاد
روح میں عشق و جوانی کا مراق — پہلوؤں میں نشترِ ہجر و فراق
روز و شب اک تازہ درد و خلفشار — جنگ کے اعلان مر جانے کے تار
الغرض ہر آن دل جلتا رہا — کاروانِ زندگی چلتا رہا
دل متاعِ سرخوشی کھوتا رہا — عشوۂ شام و سحر ہوتا رہا
اور پھر کچھ دن کے بعد اے ہمنشیں — دیدہ ہائے صبح تھے جب سرمگیں
ابرِ غم ارضِ وسما پر چھا گیا — آئینہ دیکھا تو دل مرجھا گیا

کسی کی رکاکت سے مضطر نہیں ہوں — کسی کی سفاہت سے مضطر نہیں ہوں
کسی کی دناءت سے مضطر نہیں ہوں — کسی کی رذالت سے مضطر نہیں ہوں
خود اپنی شرافت کا مارا ہوا ہوں
ستایا نہیں خوئے نفرت نے اب تک — بُھلایا نہیں ذوقِ عزت نے اب تک
پکارا نہیں حبِّ دولت نے اب تک — چھوا تک نہیں ہے کثافت نے اب تک
سراسر لطافت کا مارا ہوا ہوں

اے آدمیو ۔ اے انسانو ۔ اے فتنۂ و شر کے دیوتاؤ
خوب آگ ہوس کی بھڑکاؤ
ہر قلب و جگر کو برماؤ
کام آؤ تو اپنے کام آؤ

خود سے نہ خدا سے شرماؤ

اے آدمیو۔ اے انسانو۔ اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا

پیٹ بڑا بدکار

ناداں بیٹھے کشتی پر اور دانا غوطے کھائے

کتا سوئے گدے پر اور ٹہلے چوکیدار

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا

پیٹ بڑا بدکار

سونے کی تلوار

کل پھر رہا تھا صحنِ چمن میں کشاں کشاں — اپنی ادھیڑ زوجہ کے ہمراہ اک جواں

شوہر کی بے وسیلہ جوانی پر الاماں — بیوی کے مالدار بڑھاپے کی سختیاں

بے مال و زر شباب کا تھا شیب پر مدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی روحِ بوستاں — سرشار ہو چلی تھی زمیں مست آسماں

زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر دواں دواں — اک موڑ پر مڑے ہی تھے دونوں کہ ناگہاں

گزری ادھر سے ہو کے اک آئینہ روزگار

شوہر کی اٹھ کے جم گئی اس شوخ پر نگاہ — پلکوں نے سسکیاں سی بھریں اور نظر نے آہ

جھپکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ — پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ

آفت گی کشمکش تھی قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہ گار توڑ دے | کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے | جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھکائی کمر ہو کے شرمسار

گرمی اور دیہاتی بازار

ہر روش پر چڑچڑاپن ہر صدا میں بے رُخی | ہر جگر پھکتا ہوا ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ | تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

رباعیات

بیگانۂ ابتدا نہیں ہوں یارب
ناواقفِ انتہا نہیں ہوں یارب
ہو طولِ حیات کی تمنّا مجھ کو
ایسا تو میں بےحیا نہیں ہوں یارب

انسان رہے گا مبتلائے آلام
پل بھر کو بھی حاصل نہیں ہوگا آرام
ہر آن دھڑکتے ہوئے دل کے منہ میں
جب تک کہ دماغ کی لگے گی نہ لگام

بدخواہِ پیمبر نہ کہیں ہوجاؤں
ہاں منکرِ داور نہ کہیں ہوجاؤں
انساں کی تباہی کا تماشا کر کے
ڈرتا ہوں کہ کافر نہ کہیں ہوجاؤں

یہ سلسلۂ ناتناہی ہے کہ زلف
گہوارۂ بادِ صبحگاہی ہے کہ زلف

زلف ہے کہ سیاہی ہے کہ رات کی ہوئی ڈھنکی
ترے پہ سیمیں دوش شباب جان اے

زلفیں ہیں کہ ژولیدہ خیالات کی رات
اے جانِ حیا ٹھہر بھی جا رات کی رات
ان تیرہ گھٹاؤں میں کدھر جائے گی
شانوں پہ لئے ہوئے یہ برسات کی رات

ہائے جوانی

کوپل پھوٹے ناز دکھانے
کلیاں چٹکیں ہوش اڑانے
کوئل کوکے ناچ نچانے
بدلی آئے بھاؤ بتانے
کنگن جھمکے ۔ رین جگانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

ہم بھی تھے اک دن متوالے
نین رسیلے جادو والے
مکھڑا گورا گیسو کالے
دُر جھمکائے بدّھی ڈالے
اپنی دھج پر آپ دوانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

جن پر بھونرے منڈلاتے تھے
ناز بہت جو فرماتے تھے
وہ بندے کے گن گاتے تھے
روٹھنے والے خود آتے تھے
اپنی خاطر ہم کو منانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

خطرے بڑھ کر غراتے تھے
خطرے میں ہم کب لاتے تھے
اندھیاروں میں اٹھلاتے تھے
اور محلوں پر چڑھ جاتے تھے

سرخ لبوں کے رنگ چرانے
ہائے جوانی ہائے زمانے
کنکر موتی - پتھر - کومل　　گھن کی رد میں بجتی چھاگل
روز و شب میں افشاں کاجل　　بدلی ہلکی بوندیں بوجھل
کانٹے افسوں - پھول افسانے
ہائے جوانی ہائے زمانے
جو دل میں رہتے سہتے تھے　　مکھڑوں کے دریا بہتے تھے
پہلو میں کم سن رہتے تھے　　ہو جاتا تھا جو کہتے تھے
پریاں حاضر ناز اٹھانے
ہائے جوانی ہائے زمانے
کیا کس بل تھے کیا برتے تھے　　تن من میں بادل گھرتے تھے
رس بوندیں بن کر گرتے تھے　　صراف بچوں میں پھرتے تھے
سیج بسانے رات بتانے
ہائے جوانی ہائے زمانے
مدھ میں ڈوبی بھولی بھالی　　چاہے گوری چاہے کالی
جن کو دیکھو جوبن والی　　صبح انوکھی شام نرالی
دھوپ رسیلی سائے سہانے
ہائے جوانی ہائے زمانے
روندا ذرّہ - توڑا تارا　　شاخ جھکائی - پھول ابھارا
اس کو بنوتا - اس کو اشارا　　جس کو تاکا - اس کو مارا
خالی کیسے جائیں نشانے

ہائے جوانی ہائے زمانے

حوریں خنداں پیمانے میں   عود پُر افشاں کاشانے میں
اور اپنے عشرت خانے میں   راتیں رقصاں میخانے میں
دھوم دھڑکا مجرے گانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

تالی تک تک ڈھولک دم دم   طبلے گھونگرو۔ تانیں سرگم
رم جھم جھم جھم جھُم جھَم جھُم جھُم   موے انگنا آؤ بالم
تُن تُن تُن تُن توم ترانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

رہیں باہر کے دلداروں میں   وحشت گھر کی تکراروں میں
شام کو غائب بازاروں میں   دل بستگیاں مہ پاروں میں
صبح کو حاضر قسمیں کھانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

چٹکی تھی جب مست جوانی   باتیں ہیں یہ جوشؔ پرانی
یہ ہے اپنی رام کہانی   اب تو ہے سر سے اونچا پانی
مانے چاہے کوئی نہ مانے
ہائے جوانی ہائے زمانے

جگر مراد آبادی

نام علی سکندر۔ جگر تخلص۔ وطن مراد آباد۔ سال پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء۔ اصغر حسین صاحب تاجر عینک، گونڈہ کے ایجنٹ اور معتقد ہیں۔ تعلیم زیادہ نہیں ہے۔

تصانیف داغِ جگر۔ دیوانِ جگر، شعلۂ طور اور آتشِ گل ہیں۔

ردیف الف

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے	جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

شکستِ توبہ

سرمستیٔ ازل جو مجھے یاد آ گئی	دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر	مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف	میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال	در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

جان ہی دیدی جگر نے اسکے پائے ناز پر	عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد	اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتا دوں	کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد
میں ترکِ رہ و رسمِ وفا کر ہی چکا تھا	کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد
کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو	جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن　　اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کام ادھورا اور آزادی　　نام بڑے اور تھوڑے درشن
علم بھی ٹھہرا علم کا باغی　　عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ہستیٔ شاعر اللہ اللہ　　حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت سادہ طبیعت　　فرش نشیں اور عرش نشیمن
کانٹوں کا بھی کچھ حق ہے آخر　　کون چھڑائے اپنا دامن

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی　　وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
فسردہ خاطریٔ عشق اے معاذ اللہ!　　خیالِ یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی
صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا　　گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی
خیالِ یار سلامت تجھے خدا رکھے　　ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی　　نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں　　پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

بہارِ رنگ و شباب ہی کیا ستارۂ ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں
یہ مست بلبل بہک رہی ہے کنارِ عارض چہک رہی ہے

گلوں کی چھاتی دہک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں
یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں
سینۂ نَے پہ جو گزرتی ہے
وہ لبِ نے نواز کیا جانے

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے نام۔ فراق تخلص۔ ۱۸۹۶ء میں بمقام گورکھپور پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔
تصانیف: شعلۂ ساز، مشعل، انداز ے، حاشئے، روپ۔

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو
عشق رسوا ہو چکا ہے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگسِ غماز کی باتیں کرو
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو
جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

کچھ ایسی بھی گزری ہیں شبِ ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

یاس یگانہ چنگیزی

نام واجد حسین ۔ تخلص یاس اور یگانہ ۔ ۱۸۷۵ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے ۔ زندگی بھر لکھنؤ میں ادبی معرکے رہے اور وہیں ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا ۔

تصانیف : غالب شکن ۔ چراغ سخن ۔ آیات وجدانی ۔ ترانہ اور گنجینہ ہیں ۔

ردیف الف

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
خوشا نصیب جسے فیضِ عشق سوز انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا
جواب کیا وہی آواز بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانگاہ کا مزا نہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی بیقرار تھا

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا
دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

ردیف ی

کس کی آواز کان میں آئی — دور کی بات دھیان میں آئی
آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا؟ — کیا غرض درمیان میں آئی

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی — دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ردیف ے

مزا گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے — بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

کاش مرا چراغِ زیست قبلِ سحر خموش ہو — آنکھیں نہ جانے کیا دکھائیں محفلِ یار دیکھ کر
آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے — سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ محفلِ یار دیکھ کر
سیرِ بہارِ آخری پھر کہیں یاد آ نہ جائے — ٹپکیں گے سرِ قفس پہ ہم پھولوں کا ہار دیکھ کر

رباعیات

ہر عید کو اک دلہن نئی کیوں کرتا — دو دن کی جوانی میں کئی کیوں کرتا
ہاں موت کو آغوش میں لیتے ہی بنی — خود آئی تو آئی یہ گئی کیوں کرتا

پیاری دنیا کے چاؤ دیکھے ہیں بہت — ٹیڑھے سیدھے سبھاؤ دیکھے ہیں بہت
کیا پیرِ فلک تاؤ دکھاتا ہے مجھے — ان آنکھوں نے تاؤ بھاؤ دیکھے ہیں بہت

جس بات پہ چاہے موڑتی ہے دنیا — کُتی ہے کبھی جھنجھوڑتی ہے دنیا

پائے ہمت کو توڑتی ہے دنیا — نامرد بنا کے چھوڑتی ہے دنیا

مفلس کو مزا زیست کا چکھنے نہ دیا — اس نقدِ شباب کو رکھنے نہ دیا
دنیا سے لپٹتے تو لپٹتے کیونکر — پیچھے پہ کبھی ہاتھ تو رکھنے نہ دیا

حکیم جلال لکھنوی

نام حکیم سید ضامن علی تخلص جلال ۔ حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے ۔ ۱۸۳۵ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے ۔ فارسی کی تکمیل کے بعد عربی شروع کی ہی تھی کہ شعر و شاعری کا شوق ہوا ۔ امیر علی خاں ہلال ، میر علی اوسط رشک اور مرزا محمد رضا برق کے شاگرد ہوئے ۔

ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ محاورہ کا تصرف برمحل کرتے ہیں ۔ بندش صاف اور چست ہوتی ہے ۔ ریاست رامپور میں بہت دنوں رہے ۔ کئی رسالے اور کتابیں اردو زبان کی اصلاح کے متعلق لکھیں ۔ ۷۶ برس کی عمر پاکر ۱۹۰۹ء میں وفات پائی ۔

ردیف الف

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو — پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا
اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد — وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا
بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا — کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے فراغ بھی نہ ملا
دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر — نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا
چراغ لیکے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں — شبِ فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا گم ہوئے ایسے   حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

کہتے ہیں نہ لیں گے دل کسی کا   پہلو یہ بتا ہے دلبری کا
کیا تم سے کہیں کہ مر کے تم پر   کیا لطف ملا ہے زندگی کا!
ہم ہیں شبِ فرقتِ صنم ہے   اللہ ہے یار بے کسی کا
ہم روتے ہیں آپ خندہ زن ہیں   انجام بخیر اس ہنسی کا

نگہ بے حجاب نے مارا   تیری چشمِ عتاب نے مارا
دیکھی زلف اسکی اور وشِ عدو   اس پریشان خواب نے مارا

ہم تھوڑے سے بھی جرم پہ شرمائے ہیں کیا کیا   اک جرعۂ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا
اے توبۂ مے آج خدا تیرا نگہباں   کیا ٹھنڈی ہوا چلتی ہے ابر آئے ہیں کیا کیا
پہنچے نہ وہاں تک یہ دعا مانگ رہا ہوں   قاصد کو اُدھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا
لکھنے جو لگے یار کو ہم شوقِ ملاقات   پہلوئے دلِ بیتاب نے بتلائے ہیں کیا کیا

ہم سے تو بتو بے طلب آیا نہیں جاتا   تم کیسے خدا ہو کہ بلایا نہیں جاتا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا   بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا
ہمیشہ جلوۂ رخ گیسوؤں میں دیکھیں ہم   رہے جہان میں روشن چراغ کالوں کا

ردیف ر

کہتے ہیں کہ ترکِ مدعا کر   اے عشقِ صنم خدا خدا کر

پہلا ہی دن تھا ہم کو کئے ترکِ مے کشی　　کیا کیا پڑا ہے رات کو مینہ ٹوٹ ٹوٹ کر
کر بندوبست ابھی سے نہ گلشن میں باغباں　　دو دن تو ہو کہ مرغِ قفس آئیں چھوٹ کر

(ردیف ن)

ہمہ تن آرزو و شوق و تمنا میں ہوں　　لاکھ جھگڑے ہیں مرے ساتھ وہ تنہا میں ہوں

اجی کچھ ہمیں سمجھا رہے ہیں　　جنابِ عشق کچھ فرما رہے ہیں
دلِ وحشی غنیمت ہجر میں تھا　　اکیلے اور ہم گھبرا رہے ہیں

بہت شرمندہ ہوں تھوڑی سی پی کر　　پسینے پر پسینے آ رہے ہیں
خدا سمجھے جلالؔ ان ناصحوں سے　　نہیں معلوم کیا سمجھا رہے ہیں

تمہاری شانِ کریمی سے شرمسار ہوں میں　　گناہ ڈر کے کئے ہیں گناہ گار ہوں میں
غبارِ کوچۂ جاناں ہوں وہ غبار ہوں میں　　مٹا ہوا ہوں مگر نقشِ پائے یار ہوں میں

جن کو دل عشق کے منجدھار میں نے ڈوبا ہے　　ان کے بیڑے بھی کبھی پار ہوئے ہیں کہ نہیں

ردیف و

خدا خوش رکھے دل میں درد بن کر آنے والے کو　　زمانے بھر کی راحت سے مرے تڑپانے والے کو
وہ ہجرِ یار کی راتیں دلِ وحشی کی وہ باتیں　　بہت ہم یاد کرتے ہیں اب اس گھبرانے والے کو

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا حال　　آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

---

۱ وعدہ کیوں بار بار کرتے ہو — خود کو بے اعتبار کرتے ہو

ردیف ی

شب کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی — رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی
رکھ دیا خلد میں منہ جا کے لبِ کوثر پر — بوسہ ہائے دہنِ یار کی حسرت نہ گئی
دل بھی آیا تو کمر ہی کی لچک پر آیا — آج تک اپنی طبیعت کی نزاکت نہ گئی
داغ مٹتے نہ سنا دل سے تری حسرت کا — آ کے جس گھر میں پھر اس گھر سے یہ دولت نہ گئی

اک حیلہ ہو گئی یہ گراں جانیٔ فراق — آئی تھی موت سر کی بلا ٹال کر چلی

وائے کیا برگشتہ قسمت ہو گئی — شکر کی ان کو شکایت ہو گئی
اک مسیحا سے جو الفت ہو گئی — بے اجل مرنے کی عادت ہو گئی
چپ ہمیں ضبطِ فغاں نے کر دیا — اے دلِ ناداں قیامت ہو گئی
بے نشاں ہو کر ہوئے ہم نامور — یوں مٹے تم پر کہ شہرت ہو گئی
اٹھنے ہی دیتا نہیں در سے ترے — ضعف کو کس درجہ قربت ہو گئی
کب وہ ٹھکرانے کو آئے ہیں جلال — بے نشاں جب اپنی تربت ہو گئی

خود پکار اٹھا جو دل میں راز ہے — تو بھی خاموشی بڑی غماز ہے
خیر ہے ہم سے عدو کا پوچھنا — کیا مزاجِ دشمناں ناساز ہے

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے — اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے
ملی ہے ہم کو بڑی جستجو میں بادِ صبا — بہت سی خاک اڑائی ہے نامہ بر کے لئے

جلیلؔ قدوائی

نام جلیل احمد قدوائی تخلص جلیلؔ۔ پیدائش ۱۹۰۴ء۔ اناؤ کے رہنے والے ہیں۔

حالِ دل کب بُرا نہیں ہوتا / درخورِ اعتنا نہیں ہوتا
زندگی جن کی یوں گزرتی ہے / شاید اُن کا خدا نہیں ہوتا
سچ تو یہ ہے بغیر رنج و الم / زندگی میں مزا نہیں ہوتا

مناتی تھیں دل نے جہاں رنگ رلیاں / وہ سونی پڑی ہیں محبت کی گلیاں

زندگی میں بہت غنیمت ہے / جو گھڑی لُطف سے گزر جائے

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا عندلیبِ زار کا / جس گھڑی سوئے قفس بادِ بہار آنے لگی

مدت کے بعد آن کے بیٹھی جو عندلیب
فرطِ خوشی سے جھوم گئی شاخسارِ گُل
نازاں بہارِ گُل پہ نہ ہو اس قدر جلیلؔ
کیا اعتبارِ خندۂ بے اعتبارِ گُل!

ہر وقت مبتلا ہے غم و اضطراب میں / لگ جائے آگ اس دلِ خانہ خراب میں

آہ وہ دن کہاں وہ رات کہاں — اپنے جینے میں اب وہ بات کہاں

مجھ کو دیکھا تو ہنس دیا وہ شوخ — اس تغافل شعار کی باتیں
چشمِ پُرشوق کے پیامِ لطیف — نگہِ شرمسار کی باتیں
دلِ مرحوم کی اٹھان کی شان — ہائے اس ہونہار کی باتیں
اب نہیں ہے بہار ۔ اب نہ کرو — اس خزاں میں بہار کی باتیں

جلیل مانک پوری

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی — آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی
ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی
پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل — بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

تلوار کھینچ کے پنجۂ قاتل میں رہ گئی — بسمل کی آرزو دلِ بسمل میں رہ گئی
اے یار تیری نیم نگاہی کے میں نثار — کچھ آرزو نکل گئی کچھ دل میں رہ گئی
سب کچھ ہم ان سے کہہ گئے لیکن یہ اتفاق — کہنے کی تھی جو بات وہی دل میں رہ گئی
محفل کی سب بہار ہوئی صبح تک ہوا — ہاں شمع اک بجھی ہوئی محفل میں رہ گئی
کی شست و شو ہزار مگر پھر بھی اے جلیل — رنگت لہو کی دامنِ قاتل میں رہ گئی

توبہ کرنے سے بدلتی نہیں عادت اپنی — آ گئی پھر کسی کافر پہ طبیعت اپنی

اللہ ری مجبوری آدابِ محبت کی　　سینے میں تلاطم ہے اور لب پہ ہے خاموشی

دل کی آہیں نہ گئیں رات کے نالے نہ گئے　　مرے غمخوار مرے چاہنے والے نہ گئے

کیا خبر تھی عشق کے بازار میں　　دل سی شے بھی دیکھی بھالی جائے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ　　شاید اس میں جان ڈالی جائے گی

آشوبِ جہاں آفتِ جاں فتنۂ دوراں　　دیکھے وہ تجھے جس نے قیامت نہیں دیکھی

آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویر شبابِ رفتہ　　یاد پھر آگئی بھولے ہوئے افسانوں کی
مرتے مرتے بھی یہی منہ سے نکلتا ہے جلیل　　شیشے آباد رہیں خیر ہو پیمانوں کی

گرمی کا زمانہ ہو کہ جاڑوں کا زمانہ　　ہم نے کبھی چھوٹی شبِ فرقت نہیں دیکھی

اب شکایت کروں کہ شکر کروں　　لطف دینے لگی جفا تیری

ردیف ے

ہوگئیں اور بھی قاتل آنکھیں　　جب سے کچھ ان میں حیا آئی ہے

ہے آرزو کہ جلوۂ جانانہ دیکھئے　　روشن جبینِ یار سے کاشانہ دیکھئے

برکھا آئی پیا نہ آئے　　بدری چھائی پیا نہ آئے

سونی سجیا جرانہ بھاوے　　دامن دیکھے جیا جراوے
کوئل بولی برہی باتی　　کون سُنے یہ رام کہانی
برکھا آئی آئے نہ سیّاں　　کون جتن اب کروں میں گوئیاں

بھرے آتے ہیں آنسو ہن کے حال گریۂ بلبل　　ارے دل ! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

خود سر بھے جسقدر سرِ منزل پہنچ گئے　　ہم آج تک ہیں راہ میں رہبر لئے ہوئے

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال　　مر مر کے ہجریار میں جینا کمال ہے

نہ خوشی اچھی ہے اے دل نہ ملال اچھا ہے　　یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

آفتاب الدولہ قلق لکھنوی

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گِلا دل کا　　بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
وہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر تو لوگ کہتے ہیں　　خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا
بھرا جو حیرت کا کل سے کوئی پوچھیں گے　　سنا ہے لٹ گیا رستے میں قافلہ دل کا
ہزار فصل گُل آئے جنوں وہ جوش کہاں　　گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا
بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا　　ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا
الٰہی خیر ہو کچھ رنگ آج بیڈھب ہے　　ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا لے قلق انصاف　　بتوں سے حشر میں ہوگا مقابلہ دل کا

ہندی مل کر مرا ترکِ ستم ایجاد آیا　　خوں بہاتا ہوا مقتل پہ وہ جلاد آیا

ردیف و

آئے ہو سیر گاہِ چمن میں تو اے قلق　　طرزِ شکار تیر فگن دیکھتے چلو

ردیف ے

بہارِ حسن کے گاہک ہزار دیکھ چکے　　خزاں میں بلبل و گل کا بھی پیار دیکھ چکے
زوالِ حسن میں کیا ترک کیجیے اُلفت　　خزاں بھی دیکھ لیں جس کی بہار دیکھ چکے
گلے کروگے تو کیا ہوگا؟ دیکھنے والے　　ہمارا طور تمہارا اشعار دیکھ چکے
قلق! کوئی نہ برے وقت کا شریک ملا　　بہت شریک بہت دوستدار دیکھ چکے

رہ گئے حسن و محبت کے جہاں میں چرچے　　پھر نہ ہم تم وہ رہے اور نہ وہ ہنگام رہے

بیخود موہانی

ردیف ن

ٹوٹی ہوئی ناؤ دیکھتا ہوں　　دریا کا بہاؤ دیکھتا ہوں

ساقیا! اللہ ری بے پروائیاں　　کس طرح دیکھی گئیں انگڑائیاں

ردیف ے

مل آئیے دیکھ آئیے آج آپ بھی جا کر — بیخود کئی روز سے حالت نہیں اچھی

نمازوں پر نمازیں پڑھ رہا ہے — مگر زاہد نے کوئی حور تما کی
بتوں کو جس نے دیکھا بول اٹھا — نظر آتی ہے اک قدرت خدا کی

لرز خیال کی دنیا کے انقلابوں سے — انھیں کا روپ ہیں نیرنگیاں زمانے کی
تڑپ تڑپ کے وہ شعلوں کے منہ پہ آجانا — ستم نہ دوں کی وہ دھن آشیاں بچانے کی
یہ کیسی قید تھی یارب کہ چھوٹنے والا — ہمیں کی پوچھئے کہتا ہے قید خانے کی

حیرانیٔ نگاہ تماشا کرے کوئی — صورت وہ سامنے ہے کہ دیکھا کرے کوئی

اب یہ ترے خیال کے قابل نہیں رہا — اس دل میں رہ چکی ہے تمنا گناہ کی

تم نے ہمارے دل پہ یہ کیسی نگاہ کی — اب تک ہے زلزلہ میں زمیں قبلہ گاہ کی

کیا آستانِ غیر پہ جھک جائے سر مرا — وہ کر کہ تیرے سجدے کے قابل جبیں رہے

روندتا آتشِ دوزخ کو نکل جاؤں گا — نظر آتی رہے لیکن تری تصویر مجھے

تصویر کیوں دکھائیں تمہیں نام کیوں بتائیں — لائے ہیں کہیں سے ہم یہ کسی بے وفا کی ہے

بیخود بدایونی

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی دشمنی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالعِ بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

بیخود دہلوی (شاگرد داغ)

ردیف الف

درد سے آشنا نہ ہو جب تک
آدمی کام کا نہیں ہوتا

ابھی غم ہے ابھی شادی ابھی رونا ابھی ہنسنا
تماشا دید کے قابل ہے اس دنیائے فانی کا

تم نے دیکھے ہی نہیں اہلِ وفا کے نقشے
یہ جو مٹتے ہیں تو پھر نقش بٹھا جاتے ہیں

کسے دماغ کہ دیکھے بہارِ گلشن کی
بسی ہوئی ہے یہاں بزمِ یار آنکھوں میں

مرزا ہادی رُسوا

پیدائش سنہ ۱۸۵۷ء ـــ وفات سنہ ۱۹۳۱ء

(از امراؤ جان ادا)

بہارِ حسن کو بیگانہ وار دیکھنا تھا — نگہ نے چھیڑ دیا مسئلہ محبت کا

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم — کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

ہرچند بہت غور کیا ہم نے شب و روز — دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دلآویزی — تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

وصل میں ذکرِ عدو بھی دمبدم ہوتا رہا — شربتِ دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا
زاہدو دونوں سے چرچا حق پرستی کا ہوا — ورنہ کعبہ میں سدا ذکرِ صنم ہوتا رہا
واعظا کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو — جس کا سر نقشِ قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

یہ فقط آپ کی عنایت ہے — ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا
فرض ہے ضبطِ نالہ و فریاد — جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

ابتدا آوارگی جوشِ وحشت کا سبب — ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

اک حال میں انساں کی بسر ہو نہیں سکتی　　اب رنگِ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

ردیف ر

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو　　بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کئے بغیر
رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم　　چھوڑے گا اب نہ وہ تمہیں رسوا کئے بغیر

دشتِ جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل　　زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کر

ردیف ت

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں　　لیکن اب تمہیدِ ذکرِ درد و ماتم ہو گئیں
دل یہ کہتا ہے فراقِ ماہ و انجم دیکھ کر　　طولِ فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلفِ رسا کھولے ہوئے　　حسرتیں میری شریکِ بزمِ ماتم ہو گئیں
ہم نشیں! دیکھی نحوست داستانِ ہجر کی　　صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

قیدیٔ الفتِ صیاد رہا ہوتے ہیں　　خوشنوایانِ چمن شاد رہا ہوتے ہیں
تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو　　کوئی ہم سے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں
حسرت اے ذوقِ اسیری کہ خفا ہے صیاد　　آج ہم با دلِ ناشاد رہا ہوتے ہیں
غمِ دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں　　قیدِ ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں
اے ادا قیدِ محبت سے رہائی معلوم　　کب اسیرِ غمِ صیاد رہا ہوتے ہیں

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں　　یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

جوان ہوتے ہی وہ کچھ اور ہی اب ہو گئے اے دل — کہاں کی پاکبازی! ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

ردیف و

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارتگر ہوش — جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی — دیکے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

مزاح

کسی صورت سے بہلالیں گے ہم معشوق کمسن کو — ڈبل پیسہ نہ ہو، ریوڑی نہ ہو تو گول گپّا ہو

کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے — حکومت کا مزا آئے اگر معشوق اراذل ہو

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں — شرر کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھلبل ہو

تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے — نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو نہ مسّی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان ادا طوائف کی طرف سے

روکے گا ذرا طبیعت کو — کہیں ایسا نہ ہو کہ خفّت ہو

ردیف ی

لطف ہے کونسی کہانی میں — آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد   شب اوّل ہے گرفتاری کی

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی   ایمان بچ گیا۔ مرے مولا نے خیر کی
کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ   آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

جی لئے چار دن جوانی میں   زندگی عمر بھر نہیں ہوتی
شور فریاد تا فلک پہنچا   مگر اس کو خبر نہیں ہوتی
تیرے کوچے کے بے نواؤں کو   ہوسِ مال و زر نہیں ہوتی
جان دینی کسی پہ لازم ہے   زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی   کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی
ہم اسیرانِ عشق کو صیاد   ہوسِ بال و پر نہیں ہوتی
اے اداؔ ہم کبھی نہ مانیں گے   دل کی دل کو خبر نہیں ہوتی

کل رات کو انھیں جو کہیں دیر ہو گئی   دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات   تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ   ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہشِ گناہ   چمکارنے سے پھول گئی شیر ہو گئی

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو   یاد آئی تو خیر یاد آئی
دیکھ کر مشہدِ ادا اُن کو   لالہ و گل کی سیر یاد آئی
کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ   پھر وہی راہِ دیر یاد آئی

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے — کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اُسی کافر کی ادا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی — کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

مومن

حیرانی نگاہ تماشا کرے کوئی — صورت وہ سامنے ہے کہ دیکھا کرے کوئی
ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط — ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

دال ارہر کی ہے نمک پھیکی — مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

آتش

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو — اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے — دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

نالہ رکتا ہے تو سر گرمِ جفا ہوتا ہے — درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے
عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا — دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے
حالِ دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے — اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

کیا کہیں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم — ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مرجانے سے

نواب مرزا شوق

از مثنوی "زہرِ عشق"

ایک قصہ عجیب لکھتا ہوں — داستانِ غریب لکھتا ہوں
جس محلے میں تھا ہمارا گھر — اس میں رہتا تھا ایک سوداگر
مردِ اشراف صاحبِ دولت — تاجروں میں کمال ذی عزت
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں — شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
سبزۂ نخلِ گل جوانی تھا — حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر — آنکھ بھر کے نہ دیکھتے تھے اُدھر

ایک دن چرخ پر جو ابر آیا — کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا — سیر کرنے کو بام پر آیا
سامنے وہ کھڑی تھی ماہِ منیر — چپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر
گو میں رو کے ہوئے ہزار رہا — دل پہ لیکن نہ اختیار رہا

اسی صورت سے ہو گئی جب شام / لائی پاس اس کے اک کنیز پیام
بیٹھی ناحق بھی ہولیں کھاتی ہیں / اماں جان آپ کی بلاتی ہیں
گیسوئے رخ پر ہوا سے بلتے ہیں / چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں
سن کے لونڈی کے منہ سے یہ پیغام / گئی کوٹھے کے نیچے وہ گل فام
اس کا جلوہ نہ جب نظر آیا / میں بھی روتا ہوا اتر آیا
دن میں سو بار بام پر جانا / دیکھنا بھالنا چلے آنا
رنج لاکھوں طرح کے سہتے تھے / لب تھے خاموش اشک بہتے تھے
دیکھے ماں باپ نے جو یہ انداز / روح قالب سے کر گئی پرواز
پوچھا مجھ سے یہ کیا ہے حال ترا / کس طرف ہے بندھا خیال ترا
کون سے ماہرو پہ مرتے ہو؟ / سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو
کھاتے ہو پیتے ہو نہ سوتے ہو / روز اٹھ اٹھ کے شب کو روتے ہو
اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں / آپ آفت میں جان یوں ڈالیں
پالا کس کس طرح تمہیں جانی / کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی / جا کے درگاہ جو کی بھرتی تھی
کیسا دو دن میں جی نڈھال ہوا / دائی بندی کا کیا یہ حال ہوا
یوں ہی گر ہو گیا تو سودائی / دور پہونچے گی اس کی رسوائی
ایسے دیوانے کو بھرے گا کون / شادی اور بیاہ پھر کرے گا کون
میرے تو دیکھ کر گئے اوسان / لیلیٰ مجنوں کے تو نے کاٹے کان

گزرا یاں تک تو یہ ہمارا حال / اب یہاں ان کا ہوتا ہے احوال
چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے / دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
موج الفت اسے ڈبونے لگی / ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی

نہ رکا اس کے رو کے سے دلِ زار | جی میں باقی رہا نہ صبر و قرار
لکھنے پڑھنے سے تھا اُسے جو ذوق | سوچ کر دل میں اک لکھا خطِ شوق

نامۂ معشوق پہلی بار

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام | غمِ فرقت سے دل ہے بے آرام
اپنے کوٹھے پہ تو نہیں آتا | دل ہمارا بہت ہے گھبراتا
شکل دکھلا دے کبریا کے لئے | بام پر آ ذرا خدا کے لئے
اس محبت پہ ہو خدا کی مار | جس نے یوں کر دیا مجھے لاچار
سارے الفت نے کھو دیئے اوسان | ورنہ یہ لکھتی میں خدا کی شان
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے | جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

پڑھ کے میں نے اُسے لکھا یہ جواب | کیا لکھوں تم کو اپنا حالِ خراب
ہجر میں مر کے زندگانی کی | اب بھی پوچھا تو مہربانی کی
کہوں کس کس سے اس کہانی کو | آگ لگ جائے اس جوانی کو
ہل کے پانی پیا نہیں جاتا | ورنہ حکم آپ کا بجا لاتا
رنج راحت سے گر بدل جائے | کیا عجب ہے جو دل سنبھل جائے
پاتا طاقت جو طالبِ دیدار | بام پر دن میں آتا سو سو بار
دل پہ آفت عجب آئی ہے | جان بچ جائے تو خدائی ہے
جھوٹ سمجھیں اسے حضور نہیں | جان جاتی رہے تو دور نہیں
اب جو بھیجی ہے آپ نے تحریر | ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر

سختیاں ہجر کی بدل جائیں　　دل کی سب حسرتیں نکل جائیں

پھر کیا یہ جواب میں تحریر　　کچھ قضا تو نہیں ہے دامنگیر
تجھ پہ میں مرتی کیا قیامت تھی　　کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب کو یہ گماں، کیا خوب!　　جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
کالا دانہ ذرا اتروا لو　　رائی نون اس بشر پہ کر ڈالو
دیکھ تحریر فیل لائے آپ　　خوب جلدی مزے میں آئے آپ
طالبِ وصل جو ہوئے ہم سے　　ہے گا سادہ مزاج جم جم سے

رہی کچھ روز تو یہی تحریر　　پھر موافق ہوئی مری تقدیر
ہوتے اس گل سے وصل کے اقرار　　اٹھ گئی درمیان سے تکرار

دو مہینے کے بعد معشوقہ کا پھر آنا اور کہنا

اقربا میرے ہوگئے آگاہ　　تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں　　بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں　　جبر کیونکر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس　　پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے　　موردِ مرگِ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے　　اک فقط نام ہی نام باقی ہے

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے　　نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے　　استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
بوئے الفت تمام پھیلی ہے　　باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کے سم　　تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا　　یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور　　ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی　　ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم　　ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
رنج کرنا نہ میرا میں قربان　　سن لو گر جان ہے تو ہے جہان
دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی درد　　ہوتا نازک کمال ہے دل مرد
میری منت پہ دھیان رکھئے گا　　بند اپنی زبان رکھئے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مرا　　نام منہ سے نہ لیجئے گا مرا
آپ کا نہ ہمانہ دیجئے گا مجھے　　سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے
رنگ رخ کا بدل نہ جائے کہیں　　منہ سے نالہ نکل نہ جائے کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے　　تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے　　توڑ جاتے ہیں توڑنے والے
رنج فرقت مرا اٹھا لینا　　جی کسی اور جا لگا لینا
آنسو چپکے سے دو بہا لینا　　قبر میری گلے لگا لینا

غنچۂ دل مرا کھلا جانا | پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دیکھئے کس طرح پڑے گی کل | سخت ہوتی ہے منزلِ اوّل
میرے مرقد پہ روز آنا تم | فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے | مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے | کون صاحب کسی کا ہوتا ہے!
کبھی آجائے گر ھمارا دھیان | جاننا ہم پہ ہو گئی قربان
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال | خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو | آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں | ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
عمر تم کو تو ہے ابھی کھینا | دن بہت سے پڑے ہیں ۔ رو لینا
پھر خدا جانے کیا مشیت ہے | اتنی صحبت بہت غنیمت ہے
کل گلے سے کسے لگاؤ گے | یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
یاد اپنی ہمیں دلاتے جائیں | پان کل کے لئے لگاتے جائیں
خاک میں ملتی ہے یہ صورتِ عیش | پھر کہاں ہم کہاں یہ صورتِ عیش
چُپ رہو کیوں عبث بھی روتے ہو | مفت کا ہے کو جان کھوتے ہو
چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن | اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن
اب تم اتنی دعا کرو مری جاں | کل کی مشکل خدا کرے آساں
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا | نہ ملا کچھ مزا جوانی کا
دل میں لے کر تمہاری یاد چلے | باغِ عالم سے نامراد چلے

کہتی ہے بار بار ہمّتِ عشق — ہائے یہی مقتضائے غیرتِ عشق
چارپائی پہ کون پڑ کے مرے — کون یوں ایڑیاں رگڑ کے مرے
جب تلک چرخ بے مدار رہے — یہ فسانہ بھی یادگار رہے
حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے — اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی — بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر لبوں کو چبا کے بات کرو — پھر ذرا مسکرا کے بات کرو
پھر بلائیں تمہاری یار لیں ہم — آؤ پھر سے سر اتار دیں ہم
اشک ہوتے ہیں ناگوار تجھے — تو نہ رو ہو گئی نثار تجھے
ایسے قصّے ہزار ہوتے ہیں — یوں کہیں مردوئے بھی روتے ہیں
اپنے مرنے کا کچھ نہیں ہے الم — دل میں میرے فقط ہے تیرا غم
جان ہم نے تو اس طرح کھوئی — کون تیری کرے گا دلجوئی
کون روکے گا اس طبیعت کو — کس سے کہہ جاؤں اس وصیّت کو
پر میں اب اس کو کیا کروں کم بخت! — آسماں دور ہے زمیں ہے سخت
گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی — لیکن اپنی سی میں نباہ چلی
خاک تسکینِ جانِ زار کریں — اب وصیّت کریں کہ پیار کریں

جواب عاشق کا

مجھ پہ یہ دن تو کبریا نہ کرے — تم مرو۔ میں جیوں خدا نہ کرے
دل ہی دل میں الم اٹھاتی ہو — جان دیتی ہو زہر کھاتی ہو

معشوقہ کا کہنا

طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے — موت بہتر ہے ایسے جینے سے

خونِ دل کب تلک پیئے کوئی
بے حیا بن کے کیا جیئے کوئی

نوعِ انسان بے حمیت ہو
آدمی کیا نہ جس کو غیرت ہو

وہ سنے جس کو اس کی عادت ہے
اس میں کیا اپنی اپنی غیرت ہے

لطف دنیا کے جب اٹھاؤ گے
ہم کو دو دن میں بھول جاؤ گے

سر سے لے کر بلائیں تا بقدم
بولی کم پر نثار ہوتے ہیں ہم

آگ لگ جائے وہ گھڑی کمبخت
بام پہ آئی تھی میں کون سے وقت

پھر یہ بولی وہ پونچھ کر آنسو
میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو!

دوسرے روز

یاد آتی تھی جب وصیتِ یار
وہم لاتا تھا دل ہزار ہزار

محبوبہ زہر کھا کر مر گئی رونیکی آواز بلند ہے سننے والے دوڑتے اسی طرف چلے جاتے ہیں عاشق کان لگاتا ہے

یوں تو اک شور راہ بھر میں ہے
پر یہ آفت انھی کے گھر میں ہے

محبوبہ کا جنازہ جاتا ہے

شامیانہ بنا زری کا ہے
نیچے تابوت اس پری کا ہے

سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار
جیسے گلشن کی آخری ہو بہار

بھیڑ تابوت کے تھی ایسی ساتھ
جیسے آئے کسی دلہن کی برات

پیچھے سب کے قفس میں تھی مادر
کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار
کم سخن ہائے میری غیرت دار

دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی
کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے　　جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
ہوئیں کس بات پر خفا بولو!　　اماں واری ذرا جواب تو دو
کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا　　کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا!

قبر کھدتی جو واں نظر آئی　　لاکھ روکا پہ چشم بھر آئی
دلِ آفت زدہ کو بہلا کر　　چھپکے بیٹھا میں اک طرف جا کر
غل ہوا اتنے میں سب آتے جائیں　　فاتحہ پڑھتے جائیں جاتے جائیں

پائی تنہا جو میں نے یار کی قبر　　دل کو باقی رہی نہ طاقتِ صبر
دل عجب کچھ مزا اٹھاتا تھا　　قبر اس کی گلے لگاتا تھا

حاصل اتنا تھا اس کہانی سے　　ہم رہے جلتے سخت جانی سے
عشق میں ہم نے یہ کمائی کی　　دل دیا غم سے آشنائی کی

انتخاب از غزل

چمن میں شب کو گھرا ابرِ نوبہار رہا　　حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا

لگے جو عیش کے دن میں شباب کیا کرتا　　لگا کے جان کو اپنی عذاب کیا کرتا

خیر سے موسم شباب کٹا　　چلو اچھا ہوا عذاب کٹا!

ردیف ی

آپ کی گر مہربانی ہو چکی   تو ہماری زندگانی ہو چکی
بیٹھ کر اٹھے نہ کوئے یار سے   انتہائے ناتوانی ہو چکی
ہنس دیئے رونے پہ وہ اے چشمِ تر   آبروئے اشکوں کی پانی ہو چکی

جی لئے چار دن جوانی میں   زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

ردیف ے

تصورِ مژۂ اشکبار باقی ہے   برس کے کھل گیا بادل بہار باقی ہے

اثر لکھنوی

نام مرزا جعفر علی خاں اثرؔ تخلص۔ ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے جولائی ۱۹۴۰ء میں کلکٹر کے عہدہ سے پنشن لی۔ اور اب بھی لکھنؤ ہی میں جو وطن ہے مقیم ہیں۔

تصانیف: اثرستان۔ بہاراں منظوم تراجم کا مجموعہ بعنوان رنگ بست جز اہیر دو جلد (انتخاب کلام میرؔ) چھان بین۔ انیس کی مرثیہ نگاری اور مطالعۂ غالبؔ ہیں۔

ردیف الف

اثرؔ عرض حال ان سے بے سوچے سمجھے   کہا تھا کہ پہلے نظر دیکھ لینا

ایسی توبہ سے تو میخوار ہی رہنا تھا اثر　　دل پہ اک ہاتھ ہے اک ہاتھ میں ساغر ٹوٹا

جھجک نکل گئی دل سے مرے نظارے کی　　یہ کس طرح نگہِ پُر حجاب دیکھ لیا

تیرے اندازِ تغافل کے نثار　　نگہِ شوق کو بیباک کیا

سمجھ تو شرحِ تمنّا کی مصلحت ہمدم　　خموش رہنے سے وہ اور بدگماں ہوتا

دل سے رخصت ہر اک اُمید ہوئی　　آج ہم غمزدوں کی عید ہوئی

لاکھ نیّت کی مگر واعظا اسے کیا کیجئے　　جب خیالِ توبہ آیا۔ سامنے جام آگیا

اُدھر سے جو گزرا وہ بیگانہ وار　　چراغِ لحد جھلملانے لگا

حیا میں اک ادا انکی اداؤں سے حجاب آیا　　شباب آیا اور اس انداز سے ان کا شباب آیا
جوانی اور آئینہ تبسم اور انگڑائی　　حیا بے اختیار آئی، اداؤں پر عتاب آیا
نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موجِ شراب اٹھی　　مجسّم کیفِ رنگیں بن کے وہ مست شباب آیا
گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے　　اسی انداز سے اُن پُرخمار آنکھوں میں خواب آیا

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلماں دیکھا　　میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

بھولنے والے کو شاید یاد وعدہ آگیا　　مجھ کو دیکھا مسکرایا، خود بخود شرما گیا

ردیف ن

رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر　　شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے　　مستی میں چھوا صبا نے دامن
کیا سیرِ چمن کو تم گئے تھے　　ہے بلبل و گل میں آج ان بن

ردیف و

خود سے گریباں پھٹتے تھے اکثر چاک ہوا میں اڑتے تھے　　اب وہ جنوں کا جوش نہیں آئی ہے بہار تو آنے دو
یادِ دلِ گم گشتہ میں میں ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا　　ہنس کے ستمگر کہتا ہے بات ہی کیا ہے جانے دو
صورتِ منزل آئے نظر کیا ثبت ہیں دل پر نقشِ خودی　　عقل ہے دشمن نفس ہے رہزن ٹھوکریں کچھ دن کھانے دو

صبح کو جلوہ بر سرِ منبر شب کو پیر مے خانہ　　اب کہئے تو بھلا کیا کہئے ایسی مقدس ذاتوں کو

ردیف ہ

پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا　　اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ!

دلِ غم دیدہ کانپ کانپ اٹھا　　یاس کے بعد جب امید ہوئی
جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی　　بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی
مشاطۂ بہار عجب گل کتر گئی　　منہ بند جو کلی تھی کھلی اور سنور گئی
کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شفق　　پھولوں کی گود موجِ نسیم آکے بھر گئی

ردیف ی

کچھ دن کی اور کشمکش زیست ہے اثر
اچھی بُری گزرنی تھی جیسی گزر گئی

کمر ہر قدم پر لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب چھو گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی

اثرؔ کی سی شیوہ بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

متاعِ عیش پہ قرباں کیا نہ عزت کو
ہزار شکر رہا پاسِ آبرو باقی

ردیف ے

دُلہن بنی ہوئی اب کے چمن میں آئی ہے
بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے

شمیمِ دوست لئے پیرہن میں آئی ہے
نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے

کچھ نشیمن تو گلوں سے چھا گئے
اور کچھ بجلی کی زد میں آ گئے

سر جھکا کر کچھ کہا شرما گئے
دل وہی کو آئنے بھی شرما گئے

آنے والے آ کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا تارے بھی کمہلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں حل ہو گئیں
ناگہاں دو دل جہاں ٹکرا گئے

سعیٔ ضبطِ اشک کے باوصف اثرؔ
چند آنسو نے مژہ تک آ گئے

دل عشق کی مے سے چھلک رہا ہے
اک پھول ہے جو مہک رہا ہے

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں — کوندا اب تک لپک رہا ہے
اب آئے بہار یا نہ آئے — آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

جب آشیاں کی یاد اسیری میں آگئی — اڑتے ہوئے ہوا میں شرر دیکھتے رہے

اے کاش سوئے دل بھی ہو مائل کبھی کبھی — وہ گوشۂ نگاہ گلستاں لئے ہوئے

دماغ عرش پہ رہتا ہے خاکساروں کا — غرور شرط ہے تیر سے مزاج داں کے لئے

کون آیا فاتحہ پڑھنے اثر کی قبر پر — پھول مرجھائے ہوئے لوٹے وفا دینے لگے

ہم دل میں کسی سے کبھی کینہ نہیں رکھتے — یہ شیوۂ رندان مے آشام نہیں ہے

رباعی

ہے شام کا وقت دم بخود ہے ساحل — کہسار پہ چھایا ہے سکوت کامل
فطرت کی خموشیوں میں گویائی ہے — محفل کو ہے انتظار میر محفل

بیدم وارثی

ردیف الف

یہ کیفیت کہاں دیر و حرم کی سجدہ گاہوں میں
جو لطف جبہ سائی آستان یار میں آیا

اہلِ بیداد کے جب نام پکارے جائیں
تم نہ گھبرا کے سرِ حشر کہیں ہاں کرنا

شیخ کی باتوں میں بیدم مرا جی کیا بہلے
اس کو آتا نہیں کچھ دوزخ و جنت کے سوا

ردیف ن

محفل میں تو شوخی سے کئے قتل ہزاروں
خلوت میں جو آئے ہیں تو شرمائے ہوئے ہیں

معشوق ہیں کچھ کاکل پیچاں تو نہیں آپ
کیوں الجھے ہوئے بیٹھے ہیں بل کھائے ہوئے ہیں

ردیف و

کاش مری جبینِ ناز سجدوں سے سرفراز ہو
یار کی خاکِ آستاں تاجِ سرِ نیاز ہو

سامنے روئے یار ہو سجدے میں ہو سرِ نیاز
یونہی حریمِ ناز میں آٹھوں پہر نماز ہو

بیدمِ خستہ ہجر میں بن گئی جانِ زار پر
جس نے دیا ہے دردِ دل کاش وہ چارہ ساز ہو

ردیف ہ

سراج منیرا لنگار مدینہ
تجلیٔ مکہ، بہارِ مدینہ

کھڑا ہوں اکیلا میں اندوہ و غم میں
دہائی ہے اے تاجدارِ مدینہ

الٰہی دمِ واپسیں سامنے ہو — وہ محبوبِ عالم نگارِ مدینہ
دلِ مبتلا کے ٹھکانے نہ پوچھو — جوارِ محمدؐ، دیارِ مدینہ
کہاں باغِ عالم کی بیدمؔ ہوائیں — کہاں وہ نسیمِ بہارِ مدینہ

ردیف ی

ناوک انداز مجھے اپنی اداؤں کی قسم — ترکشِ ناز میں رہ جائے نہ پیکاں کوئی

چومی رکاب اٹھ کے کسی شہسوار کی — ہمت تو دیکھئے مرے مشتِ غبار کی؟
اچھا ہوا کہ حسرت و ارمان مٹ گئے — اب چین سے کٹے گی دلِ بیقرار کی

تم تو کرتے ہو دل لگی دل کی — کیا مٹاؤ گے بےکلی دل کی؟
عہد تھا ان کے گھر نہ جانے کا — ہائے بیتابی لے چلی دل کی
بیخودی میں بتا دیا میں نے — بات ظالم نے پوچھ لی دل کی
ہم وہ دردآشنا کہ دل دے کر — مول لیتے ہیں بےکلی دل کی
کس کی باتوں میں آ گیا بیدمؔ — تو نے مٹی خراب کی دل کی

پھر کسی بت کی عنایت ہو گئی — پھر وہی پہلی سی حالت ہو گئی
کھاتے کھاتے غم کسی کے عشق میں — ہم کو غم کھانے کی عادت ہو گئی
بھول کر بھی ہم نہ دیتے دل انہیں — کیا کہیں اب تو حماقت ہو گئی
یہ تو کہئے کیا ہوئی مجھ سے خطا — کیوں مری صورت سے نفرت ہو گئی
پھر گئیں بیدمؔ نگاہیں یار کی — چشمِ جاناں بے مروت ہو گئی

اُدھر پردہ اٹھا اور اس طرف موسیٰ کو غش آیا اسی پر کہہ رہے تھے ہم جمالِ یار دیکھیں گے

یہ مانا خلد کی آب و ہوا کچھ اور کہتی ہے مگر اس بُت کے کوچے کی فضا کچھ اور کہتی ہے

وضو ہو خونِ دل سے موت کو سجدے پہ سبقت ہو جنابِ شیخ ارکانِ نمازِ عاشقاں سمجھے

بہزاد لکھنوی

ردیف الف

لگ گیا دل فضائے صحرا میں یاد اب اپنا گھر نہیں آتا

ردیف ن

اللہ اللہ کیا عنایت کر گئی مضرابِ عشق ورنہ سازِ زندگی کو بے صدا سمجھا تھا میں

نمازِ محبت کو بہزادِ مضطر قضا کر چکے تھے ادا کر رہے ہیں

ردیف ی

محبت نے بہزاد جب مجھ کو تاکا مری موت پر زندگی مسکرا دی

ردیف ے

بدلی بدلی تری نگاہ رہے ہاں مری زندگی تباہ رہے

آہ کرتا ہوں اس لئے ہمدم — میرے غم کا خدا گواہ رہے
حسن والے تری نظر کے نثار — امتیاز دل و نگاہ رہے
عاشقی کا مزا جب ہی تک ہے — لب پہ نالہ رہے نہ آہ رہے
تیری رحمت ترے کرم کے نثار — ہم گنہ کر کے بے گناہ رہے

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے — ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے
اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو — تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے
میں دل سے پپیہے تری آواز کے صدقے — دو لفظوں میں میرا بھی اک افسانہ بنا دے
میں ڈھونڈ رہا ہوں مری وہ شمع کہاں ہے — جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے

ردیف ے

ہمیں تو خود ہی بھٹکنے میں لطف آتا ہے — وگرنہ منزل مقصود دور ہی کیا ہے
کبھی نظر نے کبھی دل نے کر لئے سجدے — ہمیں خبر نہیں انداز بندگی کیا ہے

ہر ذرۂ لطیف کی پروا نہ کیجئے — جس جا نہ سر جھکے وہاں سجدا نہ کیجئے

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے — منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے
آتا ہے جو طوفاں آنے دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے — مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے
اے شمع قسم پروانوں کی اتنا تو مری خاطر کرنا — اُس وقت بھڑک کر گل ہونا جب بانیٔ محفل آ جائے
اے برق تجلی کیا تو نے مجھ کو بھی موسیٰ سمجھا ہے — میں طور نہیں جو جل جاؤں جو چاہے مقابل آ جائے
اس جذبۂ دل کے بارے میں اک مشورہ تم سے لیتا ہوں — اُس وقت مجھے کیا لازم ہے جب تم پہ مرا دل آ جائے
اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں اُن کی محفل میں — اُس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

ھادی سلطانپوری

آمنہ کا مایۂ نازش ، ابوطالب کا فخر　　حمزہ و جعفر کی صبح آرزو کا آفتاب
آسماں سے جاکے چُن لایا وہی استادِ خلق　　واں کے سرکاری کتب خانہ سے چوٹی کی کتاب
ایک ہی نسخے سے سکھلایا ادب معنی ۔ بیاں　　فقہ، منطق، فلسفہ، تاریخ، طب، حکمت، حساب
کفر کے بیہوش بیماروں کی آنکھیں کھل گئیں　　اپنے دینی کارخانہ کا جہاں چھڑکا گلاب
کلیہ فرمادیا خذ ما صفا ۔ دع ما کدر　　توڑ لو کانٹے ہٹا کر ہر گلستاں سے گلاب
چن لئے ہر کھیت سے اخلاق کے خوش رنگ پھول　　بیٹھ کر جنگل میں ان پھولوں سے ٹپکایا گلاب

منقبت

بھولے بھٹکے خدا علیؑ کہتے ہیں　　سلجھے مشکلکشا علیؑ کہتے ہیں
چلنے والے طریقِ حق کے ھادی　　لغزش ہو کبھی تو یا علیؑ کہتے ہیں

قوی ایسے کہ جن میں قوتیں دینی اشاعت کی　　ہوا ایسا کہ جسمیں جوش پیغمبر کی نصرت کا

وہ تلاطم خیز موجیں وہ سمندر کا چڑھاؤ　　وہ لبِ ساحل کے پیچ ہٹتے جوانوں کا دباؤ
جزر و مد کے وہ تھپیڑے وہ کناروں کا کٹاؤ　　کھے رہا تھا اک نڈر کپتان پیغمبر کی ناؤ
صاف جو دُھن تک دکھادے پاس ہے وہ دوربیں

ذکرِ حسنِ خوب ہیں وہ خوش بیانی کے گناہ ۔۔۔ ہجوِ زہدِ خشک ہیں وہ تر زبانی کے گناہ
نوکری کرنے میں شوقِ حکمرانی کے گناہ ۔۔۔ کیا کروں ان گنت ہیں ہادی جوانی کے گناہ
کیا کیا اس عمر میں توبہ اگر سو بار کی

منقبت

لڑے یا طرح دی یا صلح کی یا مصلحت برتی ۔۔۔ غرض جو بات کی وہ ٹھیک ٹھیک اپنے عمل پر کی
دلِ بے خوف تھا اس درجہ مملو خوفِ خالق سے ۔۔۔ کہ گنجائش نہ تھی اس میں کسی مخلوق کے ڈر کی

زباں سے جز ثنائے حق کچھ اور کام کم کئے ۔۔۔ ہوئے محل تو بات کی جو بات کی تو کام کی
دل ایک صفحہ نور کا اور اس پہ لاکھ حسن سے ۔۔۔ عبارتیں لکھی ہوئی خدا کے ہر کلام کی

مرزا قربان علی بیگ سالک لکھنوی

یوں تو کہنے کو چمن ہے آج بھی تیرے بغیر ۔۔۔ دور ہے غنچوں سے لیکن دلکشی تیرے بغیر

دورِ جوشش گریہ غم گزرنے والے کھول آنکھیں ۔۔۔ کسی نے آکے چشم نم پہ میرے آستیں رکھ دی

ترے دھوکے میں بندہ ہو گیا سارے زمانے کا　　نہیں معلوم کن کن آستانوں پر جبیں رکھ دی

ہوائے نامرادی چل رہی ہے　　چراغ عمر جھونکے کھا رہا ہے
اٹھے جاتے ہو کیوں بالیں سے میری　　زمانہ اب مرنے پر آ رہا ہے
بہر صورت شب غم کٹ رہی ہے　　میں دل کو دل مجھے سمجھا رہا ہے

مجھے لوٹا اپنے در سے خالی ہاتھ پھیرنے والے　　کہیں ایسا نہ ہو دنیا کا یہ دستور ہو جائے

شمس العلماء مولانا سبط حسن

ہے وقت ابھی ہو سکتی ہے شکووں کی تلافی　　کیا فائدہ محشر میں اِدھر میں ہوں اُدھر آپ؟
اک دن وہ آئیگا کہ اُلٹے جائے گا ورق　　جاگیں گے آپ چین سے سویا کریں گے ہم
کشتی عمر روانہ شب در جد میں ہے　　کتنا پانی مرے رستے ہوئے ناسور میں ہے
ہستی ہے مری بادِ حوادث سے پریشاں　　میں شمع کی لَو ہوں مجھے آرام نہیں ہے

ایضاً

دیکھی نہ ہو جس نے کبھی دنیا کی کوئی راہ　　اٹھے وہ اگر در سے تمہارے تو کدھر جائیے
یوں منتظرِ دید کی پھرتی ہیں نگاہیں　　جیسے کوئی دیوانہ اِدھر آئے اُدھر جائے

نیاز و ناز میں ڈوبا ہوا ہے سارا میخانہ　　صراحی سر جھکاتے، ہاتھ پھیلاتے ہے پیمانہ

حفیظ جالندھری

وطن جالندھر۔ ولادت بقول ڈاکٹر باقر صاحب ۱۸۹۹ء۔ لیکن خود حفیظ کا بیان ہے کہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تصنیف: جوئے شیر ہے۔

سوز و ساز

جاگ سوزِ عشق جاگ ۔ جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ کام دیوتا ۔ فتنہ ہائے نو جگا ۔ بجھ گیا ہے دل مرا ۔ پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ ۔ جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ
تو نے آنکھ بند کی ۔ کائنات سو گئی ۔ حسن خود پسند کی ۔ دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ ۔ جاگ سوزِ عشق جاگ
تو جو چشم وا کرے ۔ ہر اُمنگ جاگ اٹھے ۔ آہ و نالہ جاگ اٹھے ۔ راگ رنگ جاگ اٹھے
جوگ سے ملے بہاگ ۔ جاگ سوزِ عشق جاگ

نشہ شراب میں ہے نہ مستی شباب میں اس رنگ سے بہشت میں رہنا عذاب ہے

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

تن کے اجلے من کے میلے　　دُھن کی دُھن اسوار
اوپر اوپر راہ بتائیں　　اندر سے بٹ مار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

جھوٹا سب سنسار
پیارے جھوٹا سب سنسار
چھلے دھاریں دین دھرم کے　　نکلیں چور چکار
ان چولوں کی آڑ میں چھپ کے　　دو دھاری تلوار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
گیان دھیان کے پتر باچیں　　بیچیں سرگ ادھار
گیانی پاتر بن کے ناچیں　　نقد کریں بیوپار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں پیارے تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسالے
اپنے من میں پریت
دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہو جلدی کرلے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسالے
اپنے من میں پریت

سیّد آلِ رضا نیوتنوی

نام سیّد آلِ رضا تخلص رضاؔ کرتے ہیں۔ پیدائش غالباً ۱۸۹۴ء۔ والد ان کے سید محمد رضا صاحب آخر عمر میں لکھنؤ چیف کورٹ کے جج تھے۔ اسی وجہ سے زیادہ قیام لکھنؤ میں رہا۔ ورنہ در اصل وطن نیوتنی تھا۔ پہلے لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ جب سے پاکستان بنا، کراچی آ گئے۔ اب بھی وہیں قیام ہے۔ دیوان ان کا "نوائے رضا" لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مگر اب مفقود ہے۔ مرثیے بھی کافی اچھے کہے ہیں۔

ردیف الف

قفس نصیب کی چشمِ پُر آب کے ڈورے
پتہ بتاتے ہیں برباد آشیانے کا
رضاؔ وہ آ چکے اٹھو خدا کو یاد کرو
کہ وقت آ گیا تاروں کے جھلملانے کا

قفس سے چھوٹ کے گلشن نظر میں صحرا ہے
چمن چمن تھا سلامت جو آشیاں ہوتا

مجھ کو مرے کریم نے حد سے سوا دیا
سب کچھ دیا جو اک دلِ بے مدعا دیا

پردۂ محمل نظر آتا ہے آج اٹھا ہوا
صاحبِ محمل پریشاں ہے کہ مجنوں کیا ہوا
اعتبار اور ایک نا اہلِ وفا پر اعتبار
جا خیالِ عہد و پیماں، جا! مجھے دھوکا ہوا
وہ زمانہ جب اسی دل پر تھی چشمِ التفات
خواب سا ہے ایک لیکن بارہا دیکھا ہوا
ایک دیوانے کو دیکھا پیچھے پیچھے آپ کے
ہنس کے بیٹھا نقشِ پا چوما، چلا روتا ہوا
حُسن کو محدود کب کرتا ہوں لیکن ہر حسیں
اتنا ہی دلکش ہے جتنا تجھ سے ہے ملتا ہوا

اے رضاؔ دیکھو نہ اس شعلے کے لہرانے کی سیر — جھلملایا جب چراغِ آرزو، ٹھنڈا ہوا

چشمِ بد دور رضاؔ! نورِ نظر کا سہرا — میری آنکھیں مرا دل میرے قمر کا سہرا

نام بڑھ جانے سے کیا یا قدر گھٹ جانے سے کیا — لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانے سے کیا
وہ رضاؔ وہ جانکنی وہ بے بسی وہ انتظار — ہو گا، سچ ہو گا مگر مطلب اس افسانے سے کیا

یاد کس کس طرح کیا ان کو — یاد کرنے کا حق ادا نہ ہوا،
کچھ کچھ رہ گئی کمی ہر بار — کیا کمی تھی؟ یہ عقدہ وا نہ ہوا

جلوۂ پنہاں کو دیکھو ہو اگر ذوقِ نظر — بس اسی کو دیکھتے ہو جس نے سجدہ کر دیا

گئی بہار، مٹے باغ میں دھواں دیکھا — قفس نصیب نے کیا چھٹ کے آشیاں دیکھا
ادھر سے تیر چلیں دل کو پھول بن کے چھوئیں — نثارِ حسنِ عقیدت عجب سماں دیکھا
یہی ہے سیر فقیروں کی اور یہی فریاد — زمیں پہ بیٹھ گئے سوئے آسماں دیکھا
چمن چمن تری سیریں نظر بہار بہار — چٹک چٹک پڑے غنچے جہاں جہاں دیکھا
کہاں کہاں کے چھپتے دیکھ دیکھ کر تنکے — بنا تو پھر نہ ان آنکھوں سے آشیاں دیکھا

دل نے کیا کیا نہیں دیکھا اسے کیا سمجھاؤں — اب تو کمبخت تسلّی کا بھی قائل نہ رہا

جو خود نہ اپنے ارادے سے بدگماں ہوتا — قدم اٹھاتے ہی منزل پہ کارواں ہوتا

فریب دے کے تغافل وبالِ جاں ہوتا — جو اک لطیفِ تبسم نہ درمیاں ہوتا
دماغ عرش پہ ہے تیرے در کی ٹھوکر سے — نصیب ہوتا جو سجدہ تو میں کہاں ہوتا
بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا — اجڑ نہ جاتا تو پھولوں میں آشیاں ہوتا
ہم ہی نے انکی طرف سے منا لیا دل کو — وہ عذر کرتے تو یہ اور بھی گراں ہوتا
اُدھر یہ شرم منانے میں ربط بڑھتا ہے — اِدھر یہ شوق وہ پھر ہم سے سرگراں ہوتا
یہ کیا کہ قتل کیا سوگ لے کے بیٹھ گئے — شہیدِ ناز کا کچھ اور امتحاں ہوتا
قفس سے دیکھ کے گلشن ٹپک پڑے آنسو — جہاں نظر ہے مگر وہاں کاش آشیاں ہوتا
حسین قدموں سے لپٹی ہوئی کشش تھی جہاں — وہیں تھا دل بھی رضا اور دل کہاں ہوتا

قیدِ الفت میں مزا قید کا حاصل نہ رہا — بیڑیاں رہ گئیں اور شورِ سلاسل نہ رہا
ہجر میں تیرے رضا جینے کے قابل نہ رہا — دل تری یاد کا بھی اب متحمل نہ رہا
انقلابات نے کر ڈالا ہے زندہ درگور — بڑھ گئی قوتِ احساس مگر دل نہ رہا

ان سے ہم انتقام کیا لیتے — اپنے ہی دل سے انتقام لیا
ان کو گویا بھلا دیا اکثر — بارہا پھر انھیں کا نام لیا
واہ! ذکرِ حبیب کیا کہنا — آہ کس بے وفا کا نام لیا
تذکرہ ہے عجیب یہ بھی رضا — جیسے گرتے ہوئے کو تھام لیا

ہائے کیا وقت تھا، کیا کیف تھا، کیا عالم تھا — جب ترے لب پہ مرا پہلے پہل نام آیا
اے رضا پڑھ لو محبت کی نمازِ آخر — عصر کا وقت ہے خورشید لبِ بام آیا

ردیف ر

کیا رازداریوں میں بے اختیاریاں ہیں ۔ دامن بچا کے روئے منہ رکھ کے آستیں پر

ساتھ کے اڑنے والے ہنسیں گے رحم کے قابل ہیں صیاد ۔ ٹوٹے پروں کی لاج یہی ہے رہنے دے آزادہ کر

گلشن تتر بتر ہے اجڑا جو اک نشیمن ۔ بلبل کہیں، کہیں گل، تنکے کہیں کہیں پر

ردیف م

جو دل میں تھا وہ ملتا ہے ساتھ اپنے خاک میں ۔ تم دور اور کہہ نہ سکے کچھ کسی سے ہم

ردیف ن

جو ستا جاتا ہے قیدی سوئے زندانِ وفا ۔ نغمۂ ساز ہے زنجیر کی جھنکار نہیں

پردہ اٹھ جانے سے مٹ جائیگا اے لذتِ دید ۔ وہ جو اک لطف ہے بجلی سی چمک جانے میں

جو سن سکو تو مری داستان ختم نہ ہو ۔ نہ سن سکو تو کوئی حدِ اختصار نہیں

کچھ میری نظر نے اٹھ کے کہا کچھ ان کی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو نہ برسوں میں چکتا طے ہو گیا باتوں باتوں میں

ہے دل کو حیرت گھر کا سکوں یاد آتا ہے وہ عہدِ جنوں
سو بار تپے میدانوں میں سو بار گھرے برساتوں میں

یہ اس کا ستانا تو نہ تھا جب آس لگائے بیٹھے تھے

مانا کہ تھا دھوکا ہی دھوکا ان میٹھی میٹھی باتوں میں
تم جتنے خفا ہوتے ہو سو اب بڑھ جاتی ہیں امیدیں دل کی
بادل کی گرج بجلی کی چمک دیکھی ہے بھری برساتوں میں
اک خواب سا میں نے دیکھا تھا ہاں سچ ہے تمہیں کیوں یاد آئے
بالوں کا وہ بڑھنا راتوں میں راتوں کا وہ کٹنا باتوں میں
سب سے ہے نرالی شان اس کی کیا شے ہے جوانی کا موسم
یہ جیٹھ کا ایسا تپتا ہے برسات کی بھیگی راتوں میں

جنھیں آنا تھا آ پہنچے جنھیں جانا ہے جاتے ہیں
رضاؔ اٹھو سحر ہوتی ہے تارے جھلملاتے ہیں

ہے چھیڑ امید کی پُر لطف اشکوں کی روانی میں
شعاعیں چاند کی جس طرح کھیلیں بہتے پانی میں

مجھ پہ رحمت کی نظر پڑتی ہی تخصیص کیا تھا
شکر ہے مجھ سے سوا کوئی گنہگار نہیں
عشق کی شان جنوں حسن کی خو ناز و غرور
آپ مجبور ہیں بندہ بھی خطاوار نہیں
اے رضاؔ لائے کہاں جنسِ وفا آؤ چلو!
گرد بازار ہے کوئی بھی خریدار نہیں

تنکے بو ضعِ آشیاں کرتے تھے جن پہ ناز ہم
کھا گئی اپنی ہی نظر اور بھری بہاریں
یاس نہ کر مجھے خجل ان کا خیال اور یہ دل
اک یہی یادگار اجڑے ہوئے دیار ہیں

جن کی مہک تھی ان پھولوں میں اگلے برس کا پاس نہیں
بیلا دلیا ہی پھولا ہے اب کے وہ بُو باس نہیں

حسن کی فطرت میں دل آزاریاں / اس پہ ظالم نت نئی تیاریاں
سادگی میں آگئیں دلداریاں / پھول اٹھیں اک پھول میں پھلواریاں
متصل طفلی سے آغازِ شباب / خواب کے آغوش میں بیداریاں
چارہ سازوں کی وہ قاتل غفلتیں / دردمندوں کی وہ غیرت داریاں
عشق اور قیدیں یہ رسم و راہ کی / ہائے دنیا، اف ری دنیا داریاں
بس ہجومِ شوق اب اس بھیڑ میں / کھوئی جاتی ہیں مری خودداریاں
دردِ دل اور جان لیوا پرسشیں / ایک بیماری کی سو بیماریاں
کون مرنا چاہتا ہے اے رضا / بے ارادہ ہوتی ہیں تیاریاں

انقلاباتِ زمانہ جو دکھائیں دیکھئے / جن نگاہوں میں محبت تھی شناسائی نہیں
نام ان کا پہروں بیٹھے لکھتے رہتے تھے کبھی / اب تو بے مطلب کی بھی وہ خامہ فرسائی نہیں

ردیف و

جو چاہتے ہو سو کہتے ہو چپ رہنے کی لذت کیا جانو / یہ رازِ محبت ہے پیارے تم رازِ محبت کیا جانو
للچائی نظر سے فرقت کا اندازہ کر لو جو چاہو / جب ڈھونڈتی ہیں آنکھیں تم کو اس وقت کی حالت کیا جانو
کیوں چھیڑا تھا کیوں پوچھا تھا کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے / جس درد پہ آجاتی ہے ہنسی اس درد کی شدت کیا جانو
اک جذبہ میری نظر سے لیا اور آنکھ بدل کر پھینک دیا / جو مفت گنوا دینے کو ملے اس چیز کی قیمت کیا جانو
کیا حسن کی بھیک بھی ہوتی ہے جب چپکے چپکے جڑتی ہے / ہم اہلِ غرض جانیں اس کو تم صاحبِ دولت کیا جانو
الفاظ کہاں سے لائیں ہم چھالے کی تپک سمجھانے کو / اظہارِ محبت دیکھتے ہو احساسِ محبت کیا جانو
ہے فرق بڑا اے جانِ رضا دل لینے میں دل دینے میں / الفت کا تعلق جان کے بھی رشتے کی نزاکت کیا جانو

جو ساتھ ان کے گیا اتنی جھلک ہے اس اُجالے کی
اندھیرا گھر کا مجھ کو دیکھتا ہے میں اندھیرے کو

تھیں وہ راتیں بھی جن جن کے لئے کاٹے نہ کٹتے تھے
وہ راتیں آئیں اب جن میں ترستا ہوں سویرے کو

یہاں جب تجھ سے اجالا تھا جہاں اب ہیں اجالا ہے
وہ کیا سمجھیں وہ کیا جانیں مرے گھر کے اندھیرے کو

ردیف ی

دل میں مرے ابتک ہے مستی اس بچھڑے متوالے کی
باسی پھول میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی

ایک کی خصلت آگ لگانا ایک کی خو جلنا خاموش
حسن لپک سمجھو شعلے کی عشق تپک ہے چھالے کی

جوڑ کے توڑیں بندھا سہارا توڑ کے جوڑیں ٹوٹی آس
بانکی ادائیں بھولی باتیں تیکھی چتون والے کی

زور وحشت کا ہے اور باعثِ وحشت بدلی
ڈھاتی آئی ہے قیامت پہ قیامت بدلی

پھونک کر ایک نشیمن کو ہٹے گا کب تک
باغباں دیکھ اُدھر پھولوں کی رنگت بدلی

اب جدھر دیکھئے ہے کیف ہم آغوشِ جمال
ایک دل بدلا تو ہر چیز کی حالت بدلی

بندگی میں بھی وہ در رسم کی قیدیں ٹوٹیں
سر جھکا جوش میں سجدے کی حقیقت بدلی

زندگی بن کے عروس آئی مجھے ہوش نہ تھا
ہائے وہ وقت کہ قسمت پلٹی طبیعت بدلی

خیر اجڑنا ہی سہی جمع کروں پھر تنکے
دیکھی جاتی نہیں گلشن کی یہ حالت بدلی

اے رضا آئیں یہ کمبخت گھٹائیں کس وقت
ہاتھ تکبیر کو اٹھے تھے کہ نیت بدلی

جوانی جا چکی کیا دل کا اب بجھتا کنول دیکھیں
وہ محفل دیکھ کر شمع سحر دیکھی نہیں جاتی

وہ آنکھیں ہجر کی وہ بے چراغ گھر کا فلک
تمام رات ستاروں میں روشنی نہ ہوئی

یہ تیرِ ناز کی مرضی چلا چلا نہ چلا
غریب دل کی خوشی کیا ہوئی ہوئی نہ ہوئی

دل کی رنگت نہ تم نے پہچانی — خون اشکوں کا بن گیا پانی
اک قطرہ ایک انقلابِ حیات — یہ بھی قصہ بہت ہے طولانی
کچھ محبت کی کارسازی ہے — کچھ ہے خود ساختہ پریشانی

ہمیں کو غیر بنائے نہ بن پڑا تم سے — ہمیں کو اپنا سمجھنے میں بدگمانی کی
کسی کو فارغِ اندوہ پاؤں تو پوچھوں — کہ اور بھی کوئی صورت ہو زندگانی کی

اُسی جگہ ہوئی منزل جہاں پہ ٹوٹی آس — تھکائے ڈالتی ہیں گردشیں مقدر کی
جگہ اُمید کی آخر کو یاس نے لے لی ! — فضا بدل گئی دنیائے یاد پرور کی

(رالعین سے

پھینکے گئے اس در سے جس کو یہ سمجھتے تھے — جینے کا سہارا ہے مرنے کا ٹھکانا ہے

دلِ مردہ کو رو، بے کیفیِ ہستی کا رونا کیا — بجھا کر شمعِ محفل رنگِ محفل دیکھنے والے
بچائیں انتہائے شوق کو جھوٹی اُمیدوں سے — قدم اٹھنے سے پہلے خوابِ منزل دیکھنے والے
وہ بلوا کر رضا کو بزم میں ذلت سے اٹھوانا — سبق لیں انقلابِ رنگِ محفل دیکھنے والے

ابھی باقی ہے ٹھوکر کھا کے سر قدموں پہ رکھ دینا — ابھی تم مجھ پرستارِ محبت کو کہاں سمجھے
ہمارا ذکر اور جتنی زبانیں اتنی باتیں تھیں — وہی بس ایک چپ تھے ہم انہی کو رازداں سمجھے

کون اتنا پیام پہنچا دے — آخری اک سلام پہنچا دے

میں فدا اے ادھر کو جاتی صبا　　جا رضاؔ کا سلام پہنچا دے

فریاد کر رہی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ　　دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

وہ بارگہ خاص کہاں اور کہاں میں　　اک سجدہ یہیں یہ بھی اسی در کی زمیں ہے
دل آنکی دل جانکی دل ٹوٹنے کی حالت　　ہاں یاد ہے کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں ہے
پروانہ تھا جب شعلے کے پہلو میں تھا رقصاں　　اب خاک ہے اور خاک کہیں شمع کہیں ہے

غرض رات دن شام پچھلے سویرے　　محبت کی گلیاں ۔ اندھا دھندھ پھیرے
چھڑائے نہ چھوٹے گی دامن سے لالی　　ارے بندہ پرور یہ آنسو ہیں میرے
نکل کر کہاں جاؤں ان کی جفا سے　　وفاؤں نے ڈالے ہیں گھیروں پہ گھیرے
ہوئی شام اور دل کی منزل نہ پائی　　چلے تھے بڑے شوق سے منہ اندھیرے
جو میں حسن سمجھا جو تو عشق سمجھا　　یہ دھوکے ہیں دل کے نہ میرے نہ تیرے
دعائیں جو لینا ہیں لے لو رضاؔ سے　　نہیں روز ہوتے فقیروں کے پھیرے

وہ جوانی اور وہ اس کے واقعاتِ دلنواز　　آنکھ جب سے کھل گئی خواب پریشاں ہو گئے

مرحبا! خوب کیا رنج سے آزاد مجھے　　یوں مٹایا ہے کہ مٹنا بھی نہیں یاد مجھے
تم وہ تم ہی نہ رہو بھول سکوں گر تم کو　　میں وہ میں ہی نہ رہوں تم جو کرو یاد مجھے
بڑھتا جاتا تھا رضاؔ حسنِ شبِ مہ جتنا　　اور آتا تھا مرا وعدہ شکن یاد مجھے

اللہ رے بند و بستِ خود آرائی شباب
غنچے چٹک کے پھول بنے اور سنور گئے

مایوس خود بخود دلِ امیدوار ہے
اس گل میں بو خزاں کی ہے رنگ بہار ہے
طے ہو چکیں شکستِ تمنا کی منزلیں
اب اس کے بعد گریہ بے اختیار ہے

دیکھو، جادوِ نگہہ لطف غضب ڈھاتی ہے
پھر مری مردہ تمناؤں میں جان آتی ہے

قسمت میں خوشی جتنی تھی ہوئی اور غم بھی جتنا ہونا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب جنگل جنگل رونا ہے
غم کاہے کو یارو؟ ماتم کیا؟ بدلو گے نظامِ عالم کیا؟
مرنا تھا رضا کو مرتا ہے یہ کاہے کا رونا دھونا ہے

قیامِ حدِ نظر کو نہیں مگر پھر بھی
میں بڑھ رہا ہوں اس امید پر کہ منزل ہے

رضا! کتنی حسیں اور مختصر شرحِ محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

چاہے جدھر کو آزادی سے کوئل جائے پپیہا آئے
کالی گھٹا آ کے قفس پر آپ بھی روئے ہمیں بھی رلائے
شرم کہاں کی شرم گنوا کر یہ بھی مار ہے قسمت کی
بھیک جو منہ مانگی لینے میں ہاتھ بڑھائے اور رہ جائے
دل کی لگی یوں پھونک دے مجھ کو گھر سے باہر آنچ نہ جائے
ان کے دشمن کیوں غم کھائیں پھول سا چہرہ کیوں کملائے
حسن کی گرمی نئی جوانی پہلی محبت نازک دل
جلتی تپتی ریگ پہ گر کر جیسے تازہ کلی کمہلائے

نقشِ قدم پر ان کے جس جا پہلے پہل سر رکھا تھا
پھر جب ہوگا ادھر کا پھیرا سجدے کو جھک جائیں گے

ہوتا زمانہ دشمن ہوتا تم تو نہ دیتے سب کا ساتھ
کس کے لئے ہم مجرم ٹھہرے کس کو یہ اب سمجھائیں گے

ہر جا رہ کے بڑھا سکتے ہیں ٹھوکر کھائے سر کا وقار
سجدے کریں گے نام پہ تیرے در پہ نہ تیرے آئیں گے

گھر سونا ہے بن سونا ہے ساری دنیا سونی ہے
دل کا سکھ لے جانیوالے کیا نہ پلٹ کر آئیں گے؟

ابھی باقی ہے ٹھوکر کھا کے سر قدموں پہ رکھ دینا ‏ ‏ ابھی تم مجھ پرستارِ محبت کو کہاں سمجھے

چھوٹ کر بیٹھا ہوں سر رکھ کے قفس کے در پر ‏ ‏ پر نہیں اور نشیمن حدِ پرواز میں ہے
عشق کس شوق سے ہے محوِ تماشا خاموش ‏ ‏ حسن کس شان سے آرام گہہ ناز میں ہے
جس سے ہونٹوں پہ ہنسی آنکھوں میں آنسو آجائیں ‏ ‏ تیرے لہجہ کی شباہت اسی آواز میں ہے

ہر وقت یہی ذکر کہ مطلب نہیں اُن سے ‏ ‏ کچھ تم کو رضاؔ عشق کا سودا تو نہیں ہے

یہ کیا کہ ابھی ہوش ۔ ابھی ہوش نہیں ہے ‏ ‏ دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
کیا اس لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے ‏ ‏ بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ان سے چھٹ جانے کے سامان خدا خیر کرے ‏ ‏ اور بڑھتے ہوئے ارمان خدا خیر کرے

ان کو جلیسے کوئی چھینے لئے جاتا ہے رضاؔ وہم اور شوق کے سامان خدا خیر کرے

چراغ کتنے نذر رکھے شب جوانی کے ہوا کے رخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

جھجکتی ہیں اٹھتے ہوئے سوئے گلشن جن آنکھوں کے آگے نشیمن جلا ہے

تاروں کی چمک میں آ جھکو، پھولوں کی مہک میں آ جھکو
جس دل میں ہی تم بستے ہو اس دل کو یہیں بہلانا ہے
جو میں نے کہانی چھیڑی تھی بے نام کی تھی اک جگ بیتی
کیوں اشک بھر آئے خیر تو ہے افسانا ہے افسانہ ہے

محبت کا بدلا کوئی اور کیا دے سزا دینے والے مکرر سزا دے
بجھانے کا احسان رکھنے کی خاطر کسی دل میں کیوں آگ کوئی لگا دے
جو دل تیرے قدموں میں زندہ ہوا ہے اسے اپنے قدموں کے قابل بنا دے
محبت ہے اک حادثہ زندگی کا محبت ہی نعمت ہے جس کو خدا دے
چراغِ تمنا یہ کیوں چاہتا ہے بجھانے سے پہلے کوئی کو بڑھا دے
کرم سب نے جانا ستم کون سمجھے مرے کچھ نہ کہنے کو ظالم دعا دے
بس اب آج ان سے نگاہیں ملی ہیں قیامت سے کہہ دو کہ پردا گرا دے
میں جس دل کو انمول سمجھے ہوئے ہوں غضب ہے اگر کوئی قیمت لگا دے
یہ پھر رفتہ رفتہ کدھر جا رہے ہو رضاؔ کیا ہوئے وہ مصمم ارادے

جس طرح چاہے کرم فرمائیے — دل میں رہیئے در پہ بیٹھے جائیے
ہو چکی تسکین کیوں سمجھائیے — آپ کو جانا ہے اچھا جائیے
خوئے الفت چھوڑ کر زندہ رہوں — خوب فرمایا ہے پھر فرمائیے
دل تو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی — میں سمجھتا ہوں مجھے سمجھائیے
حضرت دل چھٹ گئی فردوسِ ہوش — آئیے اپنی زمیں پر آئیے
ہو گئیں ہلکی امانت داریاں — چند آنسو ہیں انھیں پی جائیے
ٹھنڈی سانسوں پر جنھیں ہے اعتراض — دل کی بپتا نہیں ان کو کیا دکھلائیے
ہو گیا آخر محبت کا سوال — دم بخود سائل ہے کچھ فرمائیے
سوچئے تو حسن کافر کچھ نہیں — دیکھئے تو دیکھتے رہ جائیے
اُن کے گھر اور صرف ان کے گھر رضاؔ — جائیے اور بے بلائے جائیے

کربلائے معلیٰ کی زیارت کے بعد

خوشا نصیب دیارِ حسینؑ دیکھ لیا — خدا کا شکر! مزارِ حسینؑ دیکھ لیا
مقامِ سجدہ وقارِ حسینؑ دیکھ لیا — جو سن رہے تھے نثارِ حسینؑ دیکھ لیا

شعاعِ ابنِ شہِ بوتراب کا کیا کہنا!
زمیں پہ سر بفلک آفتاب کیا کہنا

وہ آفتاب جو آئے بقدرِ ہوش نظر — وہ آفتاب سکھا دے جو دیکھنے کا ہنر
وہ آفتاب جو ہے دیں پناہ و دیں پرور — وہ آفتاب جو رحمت گنا ہگاروں پر

نظر نواز شعاعوں کا طور کیا کہنا

بس ایک نور برستا ہے اور کیا کہیے!

وصالِ حسن علی لا الٰہ الا اللہ — کمال جس کی صدا لا الٰہ الا اللہ
جمال جس کی ادا لا الٰہ الا اللہ — جلال جس سے سوا لا الٰہ الا اللہ

نظر کو اذن بہ کیف وفورِ جلوہ گری
ادب ادب کی نقابت حضورِ جلوہ گری

وہ نور جس کی ضیا لا الٰہ الا اللہ — وہ بزم جس کی فضا لا الٰہ الا اللہ
وہ فیض جس کی بنا لا الٰہ الا اللہ — وہ درد جس کا مزا لا الٰہ الا اللہ

وہ اہلِ درد کے پہلو رہِ رضا سے ملے
خود اپنے خوں میں تڑپتے ہوئے خدا سے ملے

کہ دل خدا کے لئے ہیں کہاں کہاں سجدے — صدائیں آتی ہیں ہر سمت سے یہاں سجدے
ہیں امتیاز سے بالا یہاں وہاں سجدے — درِ قبول ہے ہو جائیں اب جہاں سجدے

یہیں سے دل میں عبادت گزار راہیں ہیں
یہیں کی خاک کی خوبو میں سجدہ گاہیں ہیں

بنی ہوئی ہے مصلیٰ فضائے قبرِ امام — بلند دائم و پیہم خدا رسول کا نام
سماں وہ جیسے شبِ قتل شاہِ دیں کا خیام — وہی قعود و قیام اور وہی درود و سلام

یہ التزام اقیموا الصلوٰۃ راز نہیں
شہیدِ حق کی زیارت بھی بے نماز نہیں

وہ ربطِ قبلہ نمازی کی شان سے ایوان — زبانِ حالِ منارہ کہ ہو چکی ہے اذان
ضریح تک جو اسی دھن میں آ گیا انساں — دکھائی دیگا تشہد کی شکل میں ایماں

سرِ مزارِ شہیداں عبادتیں زندہ
درِ حسینؑ سلامت شہادتیں زندہ

نماز و قبلہ میں اک ربطِ حق نما بھی ہے — رجوعِ قلب بھی ہے مرضیٔ خدا بھی ہے
زمانے بھر میں اسی پر عمل رہا بھی ہے — مگر یہاں تو اسی رخ میں مرثیہ بھی ہے
وقارِ قبلہ پہ سب کچھ نثار فرمایا
اسی طرف سے شہیدوں کا قافلہ آیا
حسینؑ نازِ مشیت حسینؑ امامِ نیاز — حسینؑ ایسی حقیقت جو اصل میں اعجاز
حسینؑ اپنے ہی حد کی یہ مستقل آواز — ہزار کرب و بلا ہو مگر نماز۔ نماز
جناں کی سمت یہ وقتِ نماز پڑھ کے چلے
ناز رہ گئی ایسی نماز پڑھ کے چلے
رجوع جس میں کہ دل سوئے حق لپکتا تھا — خشوع جس کو بصیرت خلوص تکتا تھا
خضوع جس میں نظامِ نفس کو سکتا تھا — رکوع جس میں کہ تازہ لہو ٹپکتا تھا
پھر اپنے خون سے محکم بنائے دیں رکھ دی
زمیں کو ہو گئی معراج یوں جبیں رکھ دی

اقتباس از مرثیہ

بہار پر ہے زمانہ نزولِ قرآں کا — نکھار پر ہے توازن حیاتِ انساں کا
نمونہ پیش ہوا مسلکِ مسلماں کا — عمل کے گھر میں چراغاں ہے نورِ ایماں کا
نہ گوشہ گیر نہ رہبانیت کے دام میں ہے
جمالِ فکر و عمل جلوہ گاہِ عام میں ہے
نظر کے سامنے آنکھوں کے آ گئی فطرت — جو صاف و سادہ تھا جلوہ دکھا گئی فطرت
نظر کو دید کے قابل بنا گئی فطرت — جو چاہتی تھی طبیعت وہ پا گئی فطرت

نہ کم نہ وسعتِ تکلیف سے زیادہ ہے
وہی ہے دین بھی فطرت کا جو تقاضا ہے

سما رہا ہے نگاہوں میں مسلکِ اسلام — خدا شناس تمدن کا خُلق ساز نظام
بہ فیضِ مرکزِ توحید، سب کا ایک مقام — خدا کی ساری خدائی، خدا کے سب احکام
خیال ایک ہی مرکز پہ ہے جما سب کا
کسی کا کچھ نہیں، جو کچھ ہے سب اُسی رب کا

بشر کا فخر ہو انسانیت کے درد کی لاج — غنی کا فرض رہے دستگیریٔ محتاج
یہی ہے دل کی شرافت غم آشنا ہو مزاج — حقیر ظلم تو مظلومیت رہے سرتاج
نہ ظلم و جبر میں کس بل نہ دور فوجوں میں
کشش ہو درد کی ہمدردیوں کی موجوں میں

ہوئے دماغ جو آراستہ خیالوں سے — نگاہ لڑ ہی گئی خوش نما جمالوں سے
کچھ اور نور نکلنے لگا کمالوں سے — قلوب ہو گئے روشن خلوص والوں سے
ترقی بشریت کی منزلیں دیکھو
نظر بلند ہوئی دل کی محفلیں دیکھو

بشر کو مل گئی معراج بھی رسالت بھی — جگہ بنا ہی گئی دین میں محبت کی
جھلک رہی ہے ضیا آیۂ مودت کی — نبی کے ہاتھ میں تصویر ہے امامت کی
دلوں کا ظرف نظر حق کو آزمانا ہے
حسینؑ جس میں پلے تھے یہ وہ زمانا ہے

خدا جمیل ہے اس کا جمال بن کے رہیں — خیال کی ہو وہ تہ خوش خیال بن کے رہیں
عمل سے نیک عمل کی مثال بن کے رہیں — چمن بنائیں چمن میں نہال بن کے رہیں
یہی نہیں کہ مسلمان ہوں تو ایسے ہوں

زمانہ کہہ دے کہ انسان ہوں تو ایسے ہوں

وہ تاجدارِ دو عالم کی مسندِ زیبا یہی زمین کبھی اس سے بڑھ کے اپنی عبا
گدا نواز وہ ملبوس شاہِ ہر دوسرا تکلفات پہ ہنستا ہوا پھٹا کپڑا

وہ سادگی، طبیعت جو کھینچ لے دل کو
وہ شمع جل کے جو خود جگمگا دے محفل کو

وہ انتہائے امانت کہ سب کو اطمینان وہ انتہائے دیانت کہ معترف قرآن
وہ انتہائے امامت کہ ہر امام کی شان وہ انتہائے رسالت کہ سب رسولوں کی شان

بیان اس شہِ لولاک کا بھلا کیا ہو
رحیم نے جسے رحمت بنا کے بھیجا ہو

جو یہ سمجھتا ہے کیا ہوگا میرے بعد یہ گھر جسے ہدایتِ امت کی دھن ہے آٹھ پہر
عرب کے بغض و حسد سے جو باخبر ہے مگر اٹھا کے رکھ دیا اولاد کو اسی زد پر

بتائے ان کے مراتب مگر نہ شدت کی
یہ عظمتیں ہیں یہ قربانیاں محبت کی

ادھر علیؑ کا وہ شغلِ معاش مزدوری بہت ہے نانِ جویں اور نہیں تو مجبوری
دلِ کشادہ امامت کی شان سے دوری بس آرزو ہے کہ ہو سائل کی آرزو پوری

سبھی ہیں آپ روزے فقیروں کی میزبانی سے
نمازیں شکر کی افطار کر کے پانی سے

جہادِ عہدِ نبی کے پکارتے ہیں علیؑ بتوں کو جائے علو سے اتارتے ہیں علیؑ
نبی کا نقشِ ہدایت ابھارتے ہیں علیؑ مٹا کے نفس کو مذہب سنوارتے ہیں علیؑ

امام رہتا ہے مصروف حق سکھانے میں
کھلا ہوا ہے درِ علم ہر زمانے میں

وہ ایک چھوٹا سا گھر اصطلاحِ دہر میں خام
وہ پائگاہِ پیمبر وہ جلوہ گاہ امام

وہ جس میں دیتی تھیں جاروب بنت شاہِ امم
حسینؑ جس میں چلے گھٹنیوں وہ پاک مقام

وہ گھر کہ جس میں شہادت کا تاج بنتا ہے
وہ گھر کہ جس میں حسینی مزاج بنتا ہے

وہ گھر کہ جس نے نہ دنیا کو اپنا گھر جانا
حیات و موت کے جادہ کو رہگذر جانا

اسی خیال میں جینے کو خوب تر جانا
کسے نصیب ہے راہ خدا میں مر جانا

خدا کو اپنا بنا لے تو سب پہ چھا کے رہے
بنانے والا ہو، تاریخ خود بنا کے رہے

وہ گھر جو صاف دکھاتا ہے زندگی کا یہ طور
رہے نہ پردہ کہ دنیا ہے اور دین ہے اور

ہے ایک مسلک اسلام بس اسی کا ہے دور
اسی کی فکر اسی پر عمل اسی پہ ہے غور

روایتوں میں زمانہ کی ڈھل نہیں سکتا
نظامِ دیں ہے مکمل بدل نہیں سکتا

یہی ہے جس کا بھی مسلک موافقت اس سے
جو جتنا بھی ہو موافق موافقت اس سے

جو اس سے صلح کا خواہاں مصالحت اس سے
جو جتنا اس کے مخالف مخالفت اس سے

وقارِ عدل بھی قائم ہے آدمیتؐ بھی
حدوں میں اپنی موالات بھی بریت بھی

حسینؑ اور وہ تعلیم گاہِ روحانی
حسینؑ اور وہ ماحول خاص ایمانی

حسینؑ اور وہ کامل فضائے قرآنی
حسینؑ اور وہ معراج دروانانی

حسینؑ اپنے بزرگوں کے دل کے چین ہوئے
جو لے کے آئے جو دیکھا وہی حسینؑ ہوئے

جنابِ ختمِ رسلؐ کی بھی عادتیں پائیں
علیؑ کی تیغ بھی پائی ریاضتیں پائیں

شبانہ روز کی ماں کی عبادتیں پائیں   تمام خلقِ حسنؑ کی رعایتیں پائیں

خصوصیات یہ زہراؑ کے نورِ عین میں ہیں
بزرگ اٹھ گئے سب مل کے اب حسینؑ میں ہیں

وہ احترامِ رسول اور وہ ذمہ دار حسینؑ   وہ انقلابِ زمانہ وہ دلفگار حسینؑ
بھری بہارِ ہدایت کی یادگار حسینؑ   وہ کج نگاہِ سیاست کو ناگوار حسینؑ

بھٹک کے لوگ نہ حق کوششِ معرفت سمجھے
غضب ہے مرکزِ مذہب کو سلطنت سمجھے

حسینؑ کی رگ و پے میں ہے دینِ حق کا نظام   خدا کا خوف، رسالت کی لاج، فرضِ امام
زمانہ بھر کے لئے امن و صلح کا پیغام   صحیح معنوں میں مذہب حقیقتاً اسلام

کبھی رہا نہ کوئی ذاتیات سے مطلب
خدا سے کام ہے مذہب کی بات سے مطلب

حسینؑ میں ہے نبی کی گرانبہائی خوں   عیاں ہوئے ہیں مراتب بطرزِ گوناگوں
نبی کا قول ہو کہاں ان کے حق میں اس سے فزوں   حسینؑ مجھ سے ہے اپنے حسینؑ سے میں ہوں

اُدھر تھا حق کی اشاعت کو شان دے دینا
اِدھر تھا حق کی حفاظت میں جان دے دینا

اس اہتمام کا مقصد سمجھ چکے ہیں حسینؑ   جچی تلی نظرِ جد سمجھ چکے ہیں حسینؑ
مآلِ آلِ محمدؐ سمجھ چکے ہیں حسینؑ   اور اپنے فرض کی بھی حد سمجھ چکے ہیں حسینؑ

ہیں سرخرو کہ سند پائی دیں پناہی کی
بڑا ہے فخر کہ نانا نے خود گواہی کی

حسینؑ نے بھی مقرر کیا وہی معیار   اسی سے جانچ رہے ہیں بُرے بھلے کردار
اٹھی ہے ایسی حکومت کے جبر کی تلوار   ہٹی ہے قوتِ احساس و جراتِ اظہار

فدائیانِ شریعت کا حال ابتر ہے
گلوئے دیں پہ مسلمان ہی کا خنجر ہے

تباہ حالیٔ مذہب کی بیدھڑک تشہیر نشانِ حق کے لئے تازیانہ و زنجیر
جلا وطن کوئی حق گو۔ کوئی ہدفِ شمشیر رسول زادے کے مرنے پہ نعرۂ تکبیر

چھپا کے زہر دیا جائے برملا خوش ہیں
گلے کو کاٹ کے اپنے رسولؐ کا خوش ہیں

ہوئے ہیں آلِ محمدؐ بس اس لئے معتوب کہ ان سے لوگ سمجھ لیں گے دین کے اسلوب
علیؑ و آلِ علیؑ پہ ہیں گالیاں مرغوب اور اس عناد کو کرتے ہیں دین سے منسوب

زبان کا ہے ٹھکانہ کوئی نہ دل ہی کا
عجیب دور ہے طوفانِ بد تمیزی کا

ہے ایسے عالمِ بیچارگی میں حق کی تلاش دیارِ غیر میں جیسے کسی غیور کی لاش
ہوئی وہ دین خدا ساز میں تراش خراش بگڑ گیا ہے توازن بدل گئی ہے معاش

دل سیاہ ہے اور حرص و آز کی موجیں
دماغ میں ہے فتوحات سلطنت۔ فوجیں

سبب ہو کچھ مگر اس میں کوئی نہیں ہے کلام یزید پا کے اثر آ گئی حکومتِ شام
حدود میں رہنے جو پاتا بگڑ کے بھی یہ نظام یزید سا نہ بنتا محافظِ اسلام

چلا نہ صلح سے بھی کام واہ رے دنیا
اس ابتدا کا یہ انجام واہ رے دنیا

مئے غرورِ حکومت کے تیز نشے میں چور سمجھ نہ سکتا تھا کیا اہلِ دیں کا ہے مقدور
تمام کرتے ہیں حجت مگر نہیں معذور یہ اہلِ بیت ہیں ان کا ہے اور ہی دستور

رگوں میں خون ہے والله مصطفیٰ والا

جو کھول کھول کے بنتا ہے کربلا والا

حکومت اور سیاست کی چال ڈھال ہے اور — امامت اور ہدایت کی دیکھ بھال ہے اور
رکے نہ سلسلۂ ظلم وہ خیال ہے اور — کہاں پہ ٹوک دیا جائے یہ سوال ہے اور
دیا گیا جو بالآخر جواب کیا کہنا
حسینؑ کی نگہِ انتخاب کیا کہنا

شفیق نانا کی رحلت حسینؑ نے دیکھی — جو ماں پہ گزری مصیبت حسینؑ نے دیکھی
پدر کے خون کی رنگت حسینؑ نے دیکھی — غریب بھائی پہ آفت حسینؑ نے دیکھی
کس احتیاط سے کانٹوں پہ چل رہے ہیں حسینؑ
گزر رہا ہے زمانہ سنبھل رہے ہیں حسینؑ

اصول دیں کو لگائے ہوئے کلیجے سے — شعار حق کو بچائے ہر ایک حملے سے
صلاحِ نیک حریفوں کو ہر ذریعے سے — خیال وقت کا واقف مگر نتیجے سے
نہ جانے بھیس میں کتنے قضا نظر آئی
نہ جانے کتنی جگہ کربلا نظر آئی

کہا حسینؑ کی حکمت نے کربلا تھم جا — ترا مقام ہے دل میں ابھی ذرا تھم جا
ہماری صلح کی عزت کا واسطہ تھم جا — بچھے ہیں جال سیاست کے جا بجا تھم جا
پڑے ہوئے ہیں جو پردے نہ رہ سکیں باقی
ابھی ہیں صلح سے تا جنگ منزلیں باقی

ہمیں تو ایک نظامِ عمل پہ چلنا ہے — رہے گی ایک ہی تعلیم رخ بدلنا ہے
ہمارے ہاتھوں پہ ملت کو بھی سنبھلنا ہے — ہمیں کو سر سے کفن باندھ کر نکلنا ہے
حق اپنا چھا کے رہے یوں ہجوم باطل پر
گلا کٹے تو شہادت کی صاف منزل پر

جہاں سے دین کی حقانیت کا ہو اعلان — جہاں شہید کے ہر زخم میں ہو اک زبان
کھلیں جہاں پہ برابر حسینؑ اور قرآن — جہاں کی خاک پہ سجدے کیا کرے انسان
وہ یادگار، زمانہ جسے بھلا نہ سکے
وہ کارنامہ! سیاست جسے مٹا نہ سکے

وہ کارنامہ! جو مذہب کا پاسبان رہے — وہ کارنامہ! جو انسانیت کی جان رہے
وہ کارنامہ! جو ہر عصر میں جوان رہے — وہ کارنامہ! جو اللہ کا نشان رہے
زبانِ حق پہ ہمیشہ رہے حسینؑ حسینؑ
خدا خدا بھی کہے جو کہے حسینؑ حسینؑ

یزیدیت کا جو طوفان آخرش آیا — رہا سہا تھا جو اسلام اس نے بکھرایا
ابھی تک آڑ سے جس کا پڑا کیا سایہ — اس انحراف نے کھل کھل کے رنگ دکھلایا
وفورِ فسق ہے اور طنطنہ خلافت کا
حسینؑ سبطِ نبی سے سوال بیعت کا

اس ایک زہر کے قطرہ میں اتنی تھی طاقت — گلے سے اترا اور اسلام ہو گیا رخصت
ہر ایک چیز کی ہے اپنے وقت پر قیمت — جو کی حسینؑ نے تو پنجتن نے کی بیعت
حسینیت نے صدا دی شتاب لیتا جائے
سوال جس نے کیا ہے جواب لیتا جائے

یزیدیت کو بس اب بے نقاب کرنا ہے — علاجِ زعمِ خلافت مآب کرنا ہے
گھر اپنا فدیۂ راہِ ثواب کرنا ہے — اک انقلاب کا ڈھنگ اختیار کرنا ہے
ابھی تو یہ ہے کوئی اور راہ ہے کہ نہیں
حصارِ کعبہ بھی جائے پناہ ہے کہ نہیں

ستم ہے دین کی تخریب کا یہ "کروفر" — سمجھ سمجھ کے بھلایا ہے درسِ پیغمبرؑ

غضب ہے معنیٔ قرآں ہوتے ہیں زیر و زبر ابھی حسینؑ کی گردن پہ ہے حسینؑ کا سر
اسی سے خدمتِ دینِ خدا کریگا حسینؑ
یہ فرض قرض سمجھ کر ادا کرے گا حسینؑ

یزیدیت کی سیاہی کو ٹوک دو کہ سنبھل دکھا رہے ہیں ہدایت کی راہ میں مشعل
حسینیت میں نمایاں بدرجۂ اکمل ضمیر و خوبیٔ تدبیر و عزم و قول و عمل
یہ سازِ حق ہے ہر آوازِ حق نما نکلے
جہاں چھو دیں تکبیر کی صدا نکلے

لہو میں ڈوب کے اپنے ہی جب ابھرنا بھی دکھا تا راہ بھی اور سکھ سے گزرنا بھی
ادائے فرض بھی حجت تمام کرنا بھی مدافعت بھی ضروری ہو حق پہ مرنا بھی
جب ایسا سخت پڑے وقت کیا کیا جائے
حسینؑ دل سے کہو اور سمجھ میں آجائے

حسینؑ بے کجائی انساں میں شانِ ربانی حسینؑ حُسنِ عمل کا سرورِ وجدانی
حسینؑ صاحبِ تکمیل و درس قسمت آنی حسینؑ عقل کی حد میں کمالِ انسانی
عمل جو پیش کیا نفس سے معرّا تھا
وہ معجزہ نظر آیا جو روز مرّا تھا

ہیں دل میں دیکھنے کے قابل مدارجِ رفتار نبی کا روضہ ہے اور دین کا امانت دار
بل ابروؤں پہ بھی آنکھ میں کلیجہ فگار زبانِ حال سے بے ساختہ یہی اظہار
خدا کا دین مدد کے لئے بلاتا ہے
سلام لیجئے نانا حسینؑ جاتا ہے

سلام نانا کے مرقد سلام ماں کے مزار سلام بھائی حسنؑ کی تربت سلام دل کے قرار
نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ جد نہ جد کا دیار حسینؑ سب کی طرف سے اکیلا ذمہ دار

شریکِ حال ہو فضلِ خدا خدا حافظ
حسین ہو بارِ گراں لے چلا خدا حافظ

پورا مرثیہ طویل ہے اور اس کے آگے مکہ کی حالت، مدینہ کی حالت اور وہاں سے رخصت، آخری نمازیں، مناجاتیں، دعائیں اور وصیت وغیرہ کے مقامات نظم کئے گئے ہیں جو سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے یہاں صرف آخری دو بند اور لکھے جا رہے ہیں

حسینؑ موقفِ کرب و بلا میں آتے ہیں
گواہ کرکے خدا کو قدم بڑھاتے ہیں
امانتیں بھی پیمبرؐ کی ساتھ لاتے ہیں
لہو سے جادۂ قبلہ نما بناتے ہیں
کھنچا ہوا خطِ تقدیر انتہا تک ہے
لکیر خون کی کعبہ سے کربلا تک ہے

نظر ملائے گا کعبہ سے کربلا کا مقام
کہاں بنا وہ پانی کہ بچ گیا اسلام
بلند ہوگا یہیں سے با اہتمام تمام
جبینِ بندگیٔ پنجتن کا یہ پیغام
اٹھایا جس سے نہ سر بڑھ گیا وہی سجدہ
اب اپنے حال پہ قائم ہے آخری سجدہ

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن (کاشمیری) نام حسرت تخلص۔ وطن بمیار (کشمیر) سن پیدائش ۱۹۰۵ء
تصانیف: سرگذشتِ اسلام۔ پریت کی ریتی۔ بغاوتِ عرب۔ پنجاب کا جغرافیہ
دو ڈاکٹر۔ کیلے کا چھلکا۔ مطائبات۔ قائداعظم۔ کشمیر۔ مردم دیدہ ہیں۔
جون ۱۹۵۵ء میں لاہور میں وفات پائی۔

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں — زلف کی رخسار کی باتیں کریں
زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں — طرۂ طرار کی باتیں کریں
پھول برسائیں بساطِ عیش پر — روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں
ان کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں — سایۂ دیوار کی باتیں کریں

دل بلا سے نثار ہو جائے — آپ کو اعتبار ہو جائے
قہر تو بار بار ہوتا ہے — لطف بھی ایک بار ہو جائے
زندگی چارہ ساز غم نہ سہی — موت ہی غمگسار ہو جائے
دل یہ مانا کہ اختیار نہیں — اور اگر اختیار ہو جائے

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے — کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا
جدائی مٹ گئی لیکن خلشِ دردِ محبت کی — جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
زلف برہم ہے دلِ آشفتہ صبا آوارہ — خوابِ ہستی سا نہیں خوابِ پریشاں کوئی

ظریف لکھنوی

نام سید مقبول حسین تخلص ظریف۔ والد ان کے مولانا سید فضل حسین خانوادۂ علم و فضل کے رکن تھے آبائی وطن پہلے فیض آباد پھر عہد شاہی سے شہر لکھنؤ تھا۔ مولوی گنج میں مکان مسکونہ تھا۔ مولانا صفی کے شاگرد اور حقیقی بھائی اُن سے آٹھ سال کچھ مہینے چھوٹے تھے۔ ۱۸۷۰ء ۲۲ فروری مطابق ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ بروز پنجشنبہ کو پیدا ہوئے۔ پہلے شہزادے سلیمان قدر بہادر کے یہاں میر منشی رہے پھر ان کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں عراق میں بھی ڈیڑھ سال رہنا پڑا۔ اُس زمانہ میں فارسی مذاق شاعری سے کافی اثر حاصل کیا۔ پھر ریاست محمود آباد میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ ملازم رہے آخر ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔

افیونیوں کا رجز

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے — جرمن ترے نقشے کو مٹی میں ملا دیں گے
تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں — پینک سے ذرا چونکیں پھر تجھ کو جگا دیں گے
رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب میں — جب چائے میں بالائی تھوڑی سی ملا دیں گے
لٹھ لے کے جہاں پہنچے سر توڑ دیا فوراً — جرمن تیری توپوں میں ہم بانس چلا دیں گے
زیپلن جو اُڑاتا ہے جرمن ہمیں کیا پروا — کنکوے میں چپکا کر میداں میں گرا دیں گے
اتنے تجھے ہم ڈھیلے ماریں گے ارے جرمن — خاکی تری وردی کو مٹی میں ملا دیں گے
تو لاکھ بھی ڈالے گا تو یاد رکھ اے جرمن — بھتنا تجھے بن بن کے زنقوں کو ڈرا دیں گے

نجم آفندی

پروردگارِ درد

زباں پہ شکر، نگاہوں میں درد، دل میں تڑپ — نبی کی شان کے آئینہ دار کیا کہنا
بڑھا تھا کفر کہ اسلام کا نشاں نہ رہے — تڑپ کے روک لیا دل پہ وار کیا کہنا
بھلا دیا وہ تبسم بھی دردِ ملت نے — رہا نہ یادِ سکینہؑ کا پیار کیا کہنا

صبحِ عاشور

سجدہ سے سر کسی کا اٹھا روشنی ہوئی — عشرہ کی صبح آئی قیامت بنی ہوئی
وہ سامنے حسینؑ کے میدانِ کربلا — دل میں وہ کربلائے محبت بسی ہوئی
بر میں قبا تو سر پہ عمامہ رسول کا — تحت الحنک بندھی ہوئی زلفیں کھلی ہوئی
دستِ جہاں پناہ میں اسلام کی نجات — راہِ خدا ثباتِ قدم سے لگی ہوئی
وہ گرد و پیش مجمعِ ارواحِ انبیاء — دنیا ادب سے حدِ نظر پر رکی ہوئی
پانی کی بندشوں پہ حقارت کی اک نظر — عزت کی موت سے وہ نگاہیں لڑی ہوئی
وہ رفتہ رفتہ عالمِ تنہائیِ حسینؑ — ننھی سی قبر، ہاتھ میں مٹی بھری ہوئی
اک ذاتِ سرفروش اور اک ذاتِ کردگار — مرکز سے کائنات وہ عالم ہٹی ہوئی

ننھا مجاہد

اے معرکۂ قوتِ اسلام کے جوہر
چھ ماہ کی مدت میں قیامت کے برابر
لپٹے ہوئے بالوں پہ فدا شامِ شبِ غم
ڈوبی ہوئی نبضوں پہ ستاروں کی پچھاوڑ
چتون میں چھپائے ہوئے اکبرؑ کی جوانی
مٹھی میں دبائے ہوئے سجادؑ کے جوہر
تا حشر بجھے گی نہ کبھی شمعِ حقیقت
کو دے گئی ایسی ترے بجھتے ہوئے تیور

کیا چیز تھی جوانیِ اکبرؑ نہ پوچھئے
ان کا شباب دیکھنے والے جواں رہے

نیزہ و خنجر کے موہنہ پر وہ ترا اعلانِ حق
جانشینِ مرتضیٰؑ تجھ پر سلام اسلام کا
ایک صبر و ضبط کی آیات محکم تجھ میں تھیں
فاطمیؑ دولت ترا! تجھ پر سلام اسلام کا

شربت کی طرح پیتا ہوں آبِ دمِ شمشیر
دنیا مری ہمت کو تماشا نہ بنا دے

دربارِ شام

پُر درد ہے دربارِ یزیدی کا نظارا
دربار جسے ظلم کے ہاتھوں نے سنوارا
رسی میں بندھی سامنے اولادِ پیمبرؐ
اور تختِ حکومت پہ یزیدِ ستم آرا
اٹھتی ہوئی منظر پہ مسلمانوں کی نظریں
نظریں جنہیں اسلام کی توہین گوارا!
پہنے ہوئے زنجیر وہ مطلوبِ دو عالم
زنجیر بھی لپٹی ہوئی قدموں کا سہارا
ہم مرکزِ ایماں ہیں یہ تیور کی گواہی
ہم وارثِ قرآں ہیں یہ چتون کا اشارا

آئینۂ رخسار پہ وہ گردِ یتیمی
چمکا ہوا وہ صبر کے جوہر کا ستارا

نظروں میں وہ بھرتی ہوئی اکبرؑ کی جوانی
سینے میں وہ چبھتا ہوا اصغرؑ کا اشارا

دل میں وہ کسی لاشۂ بے سر کا تصور
آنکھوں سے وہ اک فرقِ مطہر کا نظارا

دیتی تھی جو منظور اذیت پہ اذیت
حاکم نے کیا ایک مقرر کو اشارا

منبر پہ ہوئی مصحفِ ناطق کی جو تکذیب
لفظوں نے کیا اپنے معانی سے کنارا

کس یاس سے تب سیدِ سجادؑ نے پوچھا
کچھ ہم بھی کہیں تجھ کو جو سننا ہو گوارا

یہ صاحبِ منبر تھے مگر ہائے زمانہ
دیتا تھا اجازت نہ یزیدِ ستم آرا

کچھ بس نہ چلا دیکھ کے دربار کا نقشا
حضار کا غل تھا کہ اجازت ہو خدارا

حلقے سے اسیروں کے بڑھا درد کی صورت
زنجیر سنبھالے ہوئے شبیرؑ کا پیارا

بوسہ لیا جبریلؑ نے دامانِ قبا کا
خم ہو کے دیا عرش نے منبر کو سہارا

پیدا ہوئی الفاظ کی اک سیل زباں سے
یا کوثر و تسنیم کا چڑھتا ہوا دھارا

عنوان تھا وہ حمد کا وہ نعت کی ترتیب
وہ لحن کہ جس لحن نے قرآں کو سنوارا

سن لو میں علیؑ ابن حسینؑ ابن علی ہوں
بیٹا میں خدیجہ کا ہوں زہراؑ کا دلارا

مکہ کا میں فرزند ہوں فرزندِ منیٰ ہوں
پیغمبرِ اسلام کے فرزند کا پیارا

جو صاحبِ معراج ہے میں اس کا خلف ہوں
جس کے لئے اللہ نے قرآن اتارا

بیٹا ہوں امام ابنِ امامِ دو جہاں کا
اک دشتِ پر آشوب میں پیاسا جسے مارا

جس کے لئے افلاک پہ روتے ہیں فرشتے
سر جس کا شقی نے پسِ گردن سے اتارا

دل ہل گئے سینوں میں اٹھا شورِ قیامت
تقریر سے دربار لرزنے لگا سارا

تقریر کی تاثیر چھپانے کو اذاں میں
گھبرا کے جفاجو نے مؤذن کو پکارا

جس وقت مؤذن نے لیا نامِ محمدؐ
سجادؑ مخاطب ہوئے ظالم سے دوبارا

پوچھا کہ بتا کس کو محمدؐ سے ہے رشتہ
کہتے ہی بن آئی کہ یہ نانا تھا ہمارا

تقریر کے قربان مقرر کے تصدق
اے نجمؔ ستمگر کا بھرم کھل گیا سارا

ہاشم رضا ہاشمؔ

یہ بھی سید محمود رضا صاحب (جج چیف کورٹ لکھنؤ) کے صاحبزادے ہیں۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں بی اے کرنے کے بعد آئی سی ایس کے امتحان میں آ گئے تھے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ایڈمنسٹریٹر رہے۔ اب بھی سنٹرل گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ جوانی میں شارٹ سٹوریز بھی خوب لکھتے تھے۔

کیا عہدِ محبت کی مسرت کا بیاں ہو　　جینے کا وہی لطف تم آباد جہاں ہو
مدت سے نہاں ہو گئیں اور اب بھی نہاں ہو　　اے جان مری، روح مری آج کہاں ہو؟
دیدار سے پھر دھوم مرے دل میں مچا دو
آواز سے سوتے ہوئے جذبات جگا دو
اُس کیف میں ڈوبی ہوئی آواز کے صدقے　　شرمائی ہوئی چشمِ فسوں ساز کے صدقے
رہ رہ کے مجھے تکنے کے انداز کے صدقے　　زیبا ہے تجھے ناز ترے ناز کے صدقے
دیکھو تو بڑی دیر سے میں در پہ کھڑا ہوں
برسوں کی محبت کو لئے سر پہ کھڑا ہوں
آ؛ کہ دلآویز ہر اک گل کی فضا ہے　　آ؛ کہ چمن پھولوں کی نکہت سے بسا ہے
آ؛ کہ بہار آ گئی اور جوشش سوا ہے　　آ؛ کہ شباب آخری منزل پہ رکا ہے

پھر تم میں یہ شوخی یہ شرارت نہ رہے گی
اور مجھ میں جوانی کی حرارت نہ رہے گی

اے یادگارِ عہدِ شباب آ کہ الوداع　　آنکھوں میں اپنی اشک نہ بھر لاؤ الوداع
سمجھا چکیں اب ہم کو نہ سمجھاؤ الوداع　　آؤ گی یاد ہم کو بہت ۔ جاؤ الوداع
جاتی ہو صد ہزار تمنا لئے ہوئے
چھٹتی ہو دل پہ داغِ محبت لیئے ہوئے
یورپ کی دلفریب فضاؤں میں جاؤ گی　　جا کر نئے دلوں سے محبت بڑھاؤ گی
سینے سے اگلے نقشِ مروت مٹاؤ گی　　ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو بھلاؤ گی
ہم کو عزیز ہے وہ تمھاری جفا سہی
تم اب ہماری ہو چکیں ۔ تم بیوفا سہی
یاد آ رہی ہیں عہدِ گزشتہ کی صحبتیں　　دل بھولتا نہیں وہ تمہاری محبتیں
آرائشِ شباب سے بنتی تھیں جنتیں　　فطرت کی زینتوں میں محبت کی زینتیں
جاؤ مگر یہ قصۂ الفت نہ بھولنا
تم کو قسم ہے عہدِ محبت نہ بھولنا
بن کر بہارِ حسن بہارِ نظر بنیں　　اتنی سجی گئیں کہ عروسِ ہنر بنیں
میرے لئے چراغِ سرِ رہگذر بنیں　　خوش ہو کہ راہِ دہر میں تم راہبر بنیں
رستے میں اپنے نقشِ قدم چھوڑتی چلو
ہم بھی اسی طرف سے ہیں آتے چلے چلو

کہتا ہے کون تم مجھے برباد کر گئیں　　ویرانیٔ شباب کو آباد کر گئیں

آ کر نئی بہار کی ایجاد کر گئیں — تم خوش رہو سدا کہ ہمیں شاد کر گئیں
دیکھو تو آ کے اپنی محبت کی برکتیں
ہر شے سے آ رہی ہیں مسرّت کی دعوتیں
تاروں کی آب و تاب میں پنہاں تمہیں تو ہو — مہتاب کی کرن میں درخشاں تمہیں تو ہو
بادل کے ساتھ ساتھ خراماں تمہیں تو ہو — پھولوں میں ایک پھول نمایاں تمہیں تو ہو
دل میں سما کے سارے جہاں میں سما گئیں
عالم کو ایک خوابِ محبت بنا گئیں
ان منظروں میں آپ کی تصویر دیکھ کر — جیتا ہوں اپنی خوبیٔ تقدیر دیکھ کر
حیراں ہوں دل کے درد کی تاثیر دیکھ کر — نازاں ہوں اپنے پاؤں کی زنجیر دیکھ کر
کیا اور تم کہیں مرے دل کے سوا بھی تھیں
مجھ کو یقیں نہیں کہ یہ روحیں جدا بھی تھیں

فرصت اگر ملے تو مری داستاں سنو — تقدیر لے گئی ہے کہاں سے کہاں سنو
سنتے ہیں ایک ہی یہ کہانی جہاں سنو — ہم خوب ہی بیان کریں گے بیاں سنو
کچھ اس میں شک نہیں کہ ادھورا کلام ہے
تم مسکرا پڑیں تو کہانی تمام ہے
پہلی نظر کے ساتھ وداعِ قرار تھی — خاموشیوں میں دل کی بلا کی پکار تھی
دیکھا تو جو امنگ تھی وہ سوگوار تھی — بربادیاں نہ تھیں یہ خزاں کی بہار تھی
تیری نگاہِ شوق اٹھی جتنی شان سے
دل اٹھ پہ مر مٹا بھی اسی آن بان سے
اب دل کہاں کہ نعرۂ مستانہ کیجئے — منزل کہاں کہ سجدۂ شکرانہ کیجئے

فرصت کہاں کہ شکوۂ بیگانہ کیجئے ہمت کہاں کہ نازِ گدایانہ کیجئے
پوچھو نہ دل کے رنگ جو رنج و محن میں ہیں
تم ہو کنارِ غیر میں اور ہم کفن میں ہیں

کیوں اک وفا شعار کو بیگانہ کر گئیں گزری ہوئی بہار کو افسانہ کر گئیں
آنکھوں میں خاکِ شیشہ و پیمانہ کر گئیں یاد آ کے آپ اور بھی دیوانہ کر گئیں
بکھرائے بال نیند کی مستیوں میں تھیں
صحرا میں تھیں غبار میں تھیں بستیوں میں تھیں

جہاں میں آج اداسی یہ کیوں برستی ہے یہ کس وجہ سے پریشاں نظامِ ہستی ہے
کہاں وہ آج مرا وہمِ خود پرستی ہے یہ آج کیوں مری تقدیر مجھ پہ ہنستی ہے
نہ وہ بہار ہیں اگلا سرور باقی ہے
قمر میں حلوہ نہ ستاروں میں نور باقی ہے

کس اوج پہ آج اپنے ستارے نظر آئے جینے کے ابھی اور سہارے نظر آئے
بدلے ہوئے انداز تمہارے نظر آئے آنکھوں میں محبت کے شرارے نظر آئے
اک بار خدا پھر اسی انداز سے دیکھو
میں نے نہیں دیکھا مجھے پھر ناز سے دیکھو
دیکھوں تو ذرا چشمِ محبت کے اشارے جو خواب میں دیکھے وہ دلآویز نظارے
سو بار تمنا یہ اٹھی دل میں ہمارے اک بار تو تم کہہ دو کہ ہاں ہم ہیں تمہارے
پھر دل کی امنگوں کے چھلک جانے کو دیکھو

بجلی سی ہر اک سمت چمک جانے کو دیکھو

مانا کہ فریبندہ نگاہیں ہیں تمہاری — دل چھین کے چھوڑیں وہ دفائیں ہیں تمہاری
الفت کو بڑھائیں وہ جفائیں ہیں تمھاری — کانوں میں ہزاروں کے صدائیں ہیں تمہاری
اک خلق پرستار سہی پھر بھی مری ہو
اس سے تمھیں انکار سہی پھر بھی مری ہو

تم آج پرسشِ دردِ جگر کو آئی ہو — جہانِ یاس میں جھوٹی امید لائی ہو
یہ اپنے جور کا نقشہ بھی دیکھتی جاؤ
یہاں ہماری محبت کی جلوہ گاہیں تھیں — سدا تمھارے لئے مضطرب نگاہیں تھیں
مزارِ عہدِ گزشتہ بھی دیکھتی جاؤ
بلا کا جس کے لئے ہر طرف اندھیرا ہے — جہاں کی تند ہواؤں نے جس کو گھیرا ہے
وہ بادبانِ شکستہ بھی دیکھتی جاؤ
فضا بدل گئی لذت رہی نہ جینے میں — سما گیا ہے قیامت کا درد سینے میں
یہ حسرتوں کا نوشتہ بھی دیکھتی جاؤ
ملیں گے خاک میں ہم آج بیزباں بن کر — دھواں اٹھے گا جوانی کا نوحہ خواں بن کر
لگا کے آگ تماشا بھی دیکھتی جاؤ

سلام

رسولِ پاکؐ کے احساں بھلائے جاتے ہیں — رسولؐ ہی کے مرقعے مٹائے جاتے ہیں
علیؑ کا نام کیا ہے حسینؑ کیا کہنا — یونہی بلاؤں کے خیبر اٹھائے جاتے ہیں

سکھائے جاتے ہیں آغوشِ فاطمہؑ کے سبق — حسینؑ حق کے لئے گھر لٹائے جاتے ہیں
حسینؑ ہی کا کلیجہ حسینؑ ہی کا جگر — رگوں میں خون نہیں مسکرائے جاتے ہیں
کٹے ہیں ہاتھ مگر بات کے دھنی عباسؑ — تڑپ کے مشکِ سکینہؑ بچائے جاتے ہیں
دو بالا کرتے ہیں مقتل کا مرتبہ اکبرؑ — زمیں میں خونِ پیمبر ملائے جاتے ہیں
وفا میں اصغرؑ کمسن کا حوصلہ دیکھو — ہمک کے گود میں سرور کے آئے جاتے ہیں
حسین بچوں کی میت ۔ غریب بھائی کی لاش — لٹی بہن کو یہ منظر دکھائے جاتے ہیں
اکیلے رہ گئے عابدؑ نمازِ عصر کے بعد — مزارِ دل میں بہتّر بنائے جاتے ہیں
ہزار حیف وہاں بھی چمک ہے تیغوں کی — جہاں ڈرے ہوئے بچّے سلائے جاتے ہیں
مجاہدوں نے عبادت کی شان دکھلا دی — اجل کے گھر میں مصلّے بچھائے جاتے ہیں

وہاں ضرور پیامِ جہاد ہوتا ہے
جہاں حسینؑ کے قصّے سنائے جاتے ہیں

(فرمودہ ۱۹۵۱ء)

سلام

اُداس ماہِ محرّم کے گرد سائے ہیں — حسینؑ سارے جہاں کی فضا پہ چھائے ہیں
یزید تخت پہ اسلام ہے اندھیرے میں — حسینؑ شمعِ رسالت جلانے آئے ہیں
اسی لئے تو ملا زورِ بازوئے حیدر — نبیؐ کے قول کا بارِ گراں اٹھائے ہیں
رسولؐ دیکھ رہے ہیں حسینؑ کی صورت — خدا کی راہ میں لاکھوں سے لڑ کے آئے ہیں
خدا کے سامنے یوں خالی ہاتھ کیا جاتے — تمام گھر کی بضاعت کو ساتھ لائے ہیں
دلوں کی پیاس بجھی خشک لب رہے تو کیا — شہیدِ راہِ خدا خون میں نہائے ہیں
قبول ہو گیا سرور کا آخری تحفہ — تبھی تو اصغرِ بے شیر مسکرائے ہیں

سیّد کاظم رضا رضاؔ

یہ بھی سیّد آل رضا صاحب کے منجھلے بھائی ہیں۔ پاکستان کی مشہور ہستیوں میں رہے ہیں۔ آجکل کراچی میں قیام ہے۔ وہ سال پہلے ڈائریکٹر آف انٹیلیجنس بیورو آف پاکستان تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ بارہ چودہ سال ہوئے کچھ کلام انھیں کے منہ سے سنا تھا۔ وہ اور دو تین گانے بھی اسی کے ساتھ ہیں۔

جس زمانے میں طبیعت رنگ پر ہوتی تھی تو گانے خود کہتے تھے۔ راگ، راگنیوں میں خود باندھتے تھے۔ اور گاتے بھی خود ہی تھے۔ گانا باقاعدہ سیکھا تھا اور اچھا خاصا گا لیتے تھے۔

اپنی ہمت پہ جس کو ناز رہا — وہ گنہ گار و سرفراز رہا
وہ خطاؤں کا بخشنے والا — میرے سجدوں سے بے نیاز رہا
زلف شانے پہ جب تری بکھری — کیا حجاب اور کیا نیاز رہا
جس کے دل میں نگہ اتر جائے — عمر بھر وہ پاکباز رہا
اس کے اظہارِ سادگی پہ نثار — جس کا انداز فتنہ ساز رہا
تیرے جلوؤں کی دلفروزی سے — بندۂ شرمندۂ نماز رہا
میری توبہ نے رُخ بہت بدلے — درِ میخانہ تھا کہ باز رہا
کس قدر مختصر ہے قصۂ عشق — دو نگاہوں میں سازِ باز رہا
اک نگاہِ کرم سے تیری رضاؔ — ساری دُنیا سے بے نیاز رہا

واں نگاہوں میں رازداری ہے — یاں تمنا میں بیقراری ہے

اس تماشے کا کیف کیا کہیئے — جس میں ہر اک ادا تمہاری ہے
مجھ کو منظور ہے ہر ایک جفا — کس لئے پھر یہ شعلہ باری ہے
مشق جور و جفا نے کروٹ لی — کیا پشیمانیوں کی باری ہے
عشق سے ہے بہار دنیا کی — ہر مصیبت خود اختیاری ہے
پیکر حسن صورت و سیرت — یہ پرستش میں رازداری ہے
تیرے دامن پہ جو نمازیں ہوں — اُن سے جنت میں میناکاری ہے
بزم مینا و جام ختم ہوئی — جنگ نار و نیاز جاری ہے

راگ بہار (گیت)

بہار آئی مہک رہیں کلیاں — کیسی مچی ہیں رنگ رلیاں
بہار آئی ۔ مہک رہیں کلیاں
ٹھنڈی ہوائیں ۔ رُت متوالی ۔ جھوم رہی ہیں پھولوں کی ڈالی
مست فضا ہے ۔ چاندنی رتیاں ۔ بہار آئی مہک رہیں کلیاں
وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے — بچھاؤں پھول کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر
مہک رہیں کلیاں — بہار آئی مہک رہیں کلیاں

راگ کھماج

متوارے نین والے — مدھ نین بان کاہے مارے
متوارے ۔ موہ لیو من چھب دکھلائے کے ۔ جین پرت نہیں پیارے

متوارے ۔ کسکت رہت پران نہیں نکست
شیام کبھن تھک ہارے ۔ متوارے نین والے

اختر شیرانی

داؤد خاں نام ۔ اختر تخلص ۔ حافظ محمود شیرانی کے صاحبزادے تھے۔ ریاست ٹونک میں سنہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا سنہ ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل ہوئے۔ پھر میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جب ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن گئے۔ یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد دوبارہ لاہور آئے اور یہیں ۹ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء کو وفات پائی۔ ان کا کلام پھولوں کا گیت ۔ نغمۂ حرم ۔ صبح بہار ۔ شہناز ۔ اختر ستان ۔ طیور آوارہ ۔ لالۂ طور ۔ شہروکتاب وغیرہ ہیں۔

جہاں ریحانہ رہتی تھی!

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور مثل نکہت مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم یہ نخلستان اک دن اس کا مسکن تھا

اسی کے خرمئی آغوش میں اس کا نشیمن تھا
اسی شاداب وادی میں وہ بیباکانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ پھولوں کی حسیں آبادیاں کاشانہ تھیں اس کا
وہ اک بت تھی یہ ساری وادیاں بتخانہ تھیں اس کا
وہ اس فردوس رقص و وجد میں مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے حسیں سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے شگوفے کھلکھلاتے تھے
فضا میں منتشر اک نکہت مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

شمیم زلف سے اس کی مہک جاتی تھی کل وادی
نگاہ مست سے اس کی بہک جاتی تھی کل وادی
ہوا میں پرفشاں روح مے و میخانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اسے پھولوں نے میری یاد میں بیتاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے رات بھر بیتاب دیکھا ہے
وہ شمع حسن تھی پر صورت پروانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں پروانہ رہتی تھی

پیام درد دل اخترؔ دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلام رخصت غمگیں کیے جاتا ہوں وادی کو
سلام اے وادئ ویراں جہاں ریحانہ رہتی تھی

غزل

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہِ مے فروش
جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی

عالمِ مستی کی توبہ الاماں!
پارسائی لشتر بن کر چھا گئی

آہ اس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کمھلا گئی

پارسائی کی جواں مردی نہ پوچھ
توبہ کر لی تھی کہ بدلی چھا گئی

(اختؔر) اس جانِ تمنّا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

علی سردار جعفری

خیر مقدم

مبارک ہو کہ وہ غم خوارِ جانِ بے قرار آیا
سوادِ لکھنؤ میں آہوئے دشتِ تتار آیا

نگارِ لو بہار و لو بہارِ گلعذار آیا
چمن ہے رنگ ساماں رنگِ سامانِ بہار آیا

عنادل سے کہو گائیں ترانے خیر مقدم کے
بہاروں کو خبر دو مطرب سازِ بہار آیا

دلِ بیتاب کی تسکین کو پہلے خبر آئی
بڑی مدت کے بعد آخر وہ جانِ انتظار آیا

جسے سمجھا تھا دل نے دشمنِ تسکین و ہوش اب تک
سکونِ روح و دل بن کر وہ یارِ غمگسار آیا

ادا کی برق چمکی زلفِ پیچاں کی گھٹا برسی
اودھ کے میکدے پر گھر کے ابرِ کوہسار آیا

ہوائے شوق سے کھلنے لگیں کلیاں تبسم کی
نویدِ موسمِ گل مژدۂ فصلِ بہار آیا

رگوں میں خون بن کر لذّتوں کی بجلیاں دوڑیں ۔۔۔ نگہ میں لوٹ کر شعلے عشرت کا خمار آیا
سنا کرتے تھے حسنِ وینس وہیلن کے افسانے ۔۔۔ جمالِ وینس وہیلن کا آخر اعتبار آیا

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عذار نرم پہ رنگِ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے

متاعِ حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

شکستہ ساز کے ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم

اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

تذبذب

آ مرے چاند! محبت کے افق سے ہو طلوع ۔۔۔ جگمگا آج فروغِ مہرِ تاباں ہو کر

موج کی طرح سے وابستۂ ساحل ہی نہ رہ / حسن کے بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں / پھیل جا نکہتِ گل رنگِ بہاراں ہو کر
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دے / تابشِ رخ سے اندھیرے میں اُجالا کر دے

سماج

نظامِ کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے نقشے ہیں / بہت سے بت ملوکیت کے آذر نے تراشے ہیں
تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائیگی / کھلونے دیکے کب تک مفلسی بہلائی جائیگی

مجاز ردولوی

اسرار الحق نام مجاز تخلص۔ ان کے والد چودھری سراج الحق اودھ ضلع بارہ بنکی قصبہ ردولی کے رہنے والے اور وہیں ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مجاز پیدا ہوئے۔ مجاز کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ بی اے ۱۹۳۵ء میں علیگڈھ سے پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء سے شاعری شروع کی اور ۱۹۵۵ء میں ۶۔ دسمبر کو ۴۴ سال دو مہینے کے لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ اُن کے والد کا بیان ہے کہ کچھ خراب صحبتوں میں پڑکر مجاز کو شراب نوشی کی عادت پڑگئی تھی ورنہ اس عیب سے قطع نظر مجاز کی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان میں سب ہی اخلاقی خوبیاں موجود تھیں۔ حلم، جود و کرم، احباب نوازی، عزیز پروری، ایثار، فرض شناسی، بزرگوں کے حفظ مراتب کا خیال، خودداری غرض کونسی اچھی بات تھی جو ان میں نہ تھی۔ شراب سے پیچھا چھڑانے کیلئے مجاز کی ماں ان کو اجمیر شریف وغیرہ لے گئیں۔ بڑی منتیں مانیں۔ باپ نے مجاز کو ۱ سال رانچی کے اسپتال میں رکھا اور ایک زمانے میں مجاز سے شراب چھڑوادی گئی تھی مگر شرابی دوستوں کی خود غرضیوں نے مجاز کو زیادہ دنوں جینے نہ دیا۔ بلکہ آج انکی موت بڑی عبرتناک اور سبق آموز ہے۔ مجاز کا کھری سردی میں پرجاڑے کی ساری رات پڑکر مرنا اور دوستوں کا یونہی چھوڑ کر چلے جانا بہت ہی درد انگیز ہے۔

ساقی گلفام باصد اہتمام آہی گیا
نغمہ برلب خُم بہ سر بادہ بجام آہی گیا

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے سر گردوں پہ مرا ماہ تمام آہی گیا

جھوم جھوم اٹھے شجر کلیوں نے آنکھیں کھول دیں
جانبِ گلشن کوئی مستِ خرام آہی گیا

پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آہی گیا

میری شب اب میری شب ہے میرا بادہ میرا جام
وہ مرا سرو رواں ماہِ تمام آہی گیا

زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آہی گیا

کھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے مجاز
خیریت گزری کہ شاہیں زیرِ دام آہی گیا

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ رو پہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں! اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر لگی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں۔ یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ حیا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لردیف ہی

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
جگمگاتی جاگتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کا گیت
ایک اک لَے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی ۔ کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
سینۂ کہسار پہ چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
رعشہ براندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آجائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں سے پھاندتی ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی مڑتی مچلتی تلملاتی ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی چیختی چنگھاڑتی گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
تیزیٔ رفتار کے سکّے جماتی جابجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پہ اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

ردیف ی

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجئے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

ہمنشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے

خوابِ سحر

آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے　　نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے
ابنِ مریمؑ بھی اٹھے موسیٰ عمرانؑ بھی اٹھے　　رام و گوتم بھی اٹھے فرعون و ہاماں بھی اٹھے

اہلِ سیف اٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
این جناب اٹھتے رہے اور آں جناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی　　ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پہ اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے　　مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی　　آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی　　دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام　　آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں　　زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب اس طرف دیکھا تو ہے

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے　　بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے　　وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

قیامت اس کے غمزے جاں لیوا ہیں ستم اس کے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اس کے
کہیں یہ خوں سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہے
کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

سبدِ گل

معین احسن جذبی

بیتے ہوئے دلوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں
سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا معاملہ
خاموشی نظر کی خطابت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں
ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی ہی نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں
سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے
اب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی

اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

مفتی صدر الدین آزردہ

میں اور ذوقِ بادہ کشی ! لے گئیں مجھے ۔ یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ناصری

وہ دیارِ عشق کی سختیاں وہ رواج و رسم کا لاماں ۔ وہی سر ہمیشہ قلم ہوئے جو جھکے سجودِ نیاز میں

آؤ بیٹھو دلِ گستاخ کا شکوہ ہے عبث ۔ ایسی بھولی ہوئی باتوں کو نہ اب یاد کرو

مرزا ہادی رسوا — وضع کے پابند ہم دیوانگی جدّت پسند ۔ پھر گلا یا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

نامعلوم — شبِ مہتاب میں یہ کون ماتمدار آئے ہیں ۔ نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں گورِ غریباں پر

محوی

ہائے رازِ زندگی اک دم میں افشا ہو گیا ۔ میرا مرنا ان کا آنا اک تماشا ہو گیا

اعجاز

نگاہِ مست اس ظالم کی جس پر وار کرتی ہے
عجب کی بیخودی چھاتی ہے اور سرشار کرتی ہے

تری شمشیرِ ابرو نے عجب ڈھایا زمانے میں
وہ قتلِ عام کرتی ہے جدھر کو وار کرتی ہے

بہت سی ہم نے دیکھی ہے زمانہ کی فسوں سازی
نہیں دیکھی مگر ایسی جو چشمِ یار کرتی ہے

•

عظیم

کرے گا یاد میرے زمزموں کو بعد میرے
ہوں چند روز ترے گھر میں میہماں صیّاد

قفس کو شام سے لٹکا کے فرشِ خواب کے پاس
سنا کیا مری تا صبح داستاں صیّاد

وہ میرے نالوں کو سن سن کے چیخ چیخ اٹھا
عجب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیّاد

کسی معشوقِ گل اندام کے آنیکی باتیں ہیں
دلِ پُر آرزو کے آج اترانے کی باتیں ہیں

•

قاسم

کون آتا ہے دلا رشکِ قمر آج کی رات
شام سے ہے جو عیاں رنگِ حنا آج کی رات

کس کی نکہت سے مہکتا ہے دماغِ عالم
کونسے گل کی ہے آمد کی خبر آج کی رات

•

ممتاز

کیا ہم سے پیا تقصیر بھئی کیوں درس دکھانا بھول گئے – اسکے بعد ڈھائی اشعار اور ہیں –

جب روپ دکھا کے من کو لیا وہ پچھلا زمانہ بھول گئے
یہ برہ اگن نے پھونک دیو سب تن من جل کر راکھ بھیو
بھڑکا کے پیت کی اگن سجن افسوس بجھانا بھول گئے
کیا ہم کو خبر تھی اس کی پیا یوں پھیر وگے چتون لیکے جیا
وہ صنم کہ ملنا جات رہو سپنے میں بھی آنا بھول گئے

طاہر

یار کی گلیوں میں کیونکر یار جانا چھوڑ دے — کس طرح بلبل چمن سے آشیانا چھوڑ دے
یہ مستی اچھی نہیں یاں دل پہ بجلی گر پڑی — نیچی نظروں سے مری جاں مسکرانا چھوڑ دے
یا الٰہی وہ نہ چھوٹے اس کا چھٹنا ہے غضب — یوں میں راضی ہوں مجھے چاہے زمانا چھوڑ دے

موسیٰ

حیا سے وہ گل تر آب ہوتا ہے — ٹپک ٹپک کے پسینہ گلاب ہوتا ہے
لو مجھ سے کر کے وہ وعدہ عدو سے کہتے ہیں — کسی کا دل بھی تو رکھنا ثواب ہوتا ہے

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا — کہاں کا جان کو میری دھرا تھا
میں کاش اس وقت آنکھیں موند لیتا — کہ میرا دیکھنا مجھ پر بلا تھا
وہ مجھ کو ذبح کرتا تھا چھری سے — میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

محمد شاکر ناجی

اے صبا کر بہار کی باتیں — اس بت گلعذار کی باتیں

چھوڑتے کب ہیں لقد دل کو صنم   جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں

•

اسیر

کہیں بن سنور کے جو آگئے تو بہار حسن دکھا گئے
مرے داغ دل کو لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
لگے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ محبت اپنے گلے پڑی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی وہ ہمیں یہ روگ لگا گئے
یہی ہے دعا کہ نہ آئے دل کوئی بیوفا نہ دکھائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
یہ خیال تھا ہمیں دمبدم کہ بہار ہے ختم گو کہ ہم
جو چھٹے اسیرؔ قفس سے ہم تو سنا خزاں کے دن آگئے

خواجہ مجذوب غوری

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

اب بھی مجذوب جو محروم پذیرائی ہے   کیا جنوں میں ابھی آمیزش دانائی ہے
اب اٹھائے سے کہیں اٹھتا ہے مجذوب کا سر   سجدہ بھلا ہے ترے در پہ جبیں نازمیں ہے

محمود شاہ

پریم نگری راہ کٹھن ہے سنبھل سنبھل کے چلا کرو   رام نام کو من میں جپو۔ تم بچن گرو کا کیا کرو
مندر میں کیا مورت پوجے مسجد میں کیا سجدہ کرے   ارے راہ ملن کی راہ نرالی من کی مالا جپا کرو

عیش

صلح ان سے ہمیں کئے ہی بنی	دل پہ جھگڑا تھا دل دیئے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے	ہاتھ سے اس کے مے پیئے ہی بنی
کس کا تھا پاسِ شوقِ ظلم اے عیش	ان جفاؤں پہ بھی جئے ہی بنی

رمز

غم وہ کیا ہے جو جانگزا نہ ہوا	درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر	بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا پر اے دلِ کم ظرف	تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا
شکوۂ یار اور زبانِ رقیب	کھیل ٹھہرا کوئی گلا نہ ہوا
تم رہو اور مجمعِ اغیار	میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

قاضی نجم الدّین

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک	میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

ظہیر کاشمیریؔ

مجھے شادابیٔ صحنِ چمن سے خوف آتا ہے	یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی
ظہیر اس چشمکِ اول پہ یوں محسوس ہوتا ہے	بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

آغا شاعر دہلویؔ

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے	کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمھارا

آدمی آدمی سے ملتا ہے بات کرنی کو کچھ گناہ نہیں

حاصل جسے آقا کی حضوری ہو جائے دنیا کے غم و رنج سے دوری ہو جائے
اے صلِّ علیٰ! مجلسِ پُر نورِ حسینؑ ناری بھی یہاں آئے تو نوری ہو جائے

•

میر شمس الدین ہوش

تیرے خط کا جواب آیا ہے ہوش! کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

•

پیر محمد شائق

نامہ جو ہاتھ میں لیا میں نے دیکھ قاصد کو رو دیا میں نے

•

شاہ کمال الدین حسین

ہم گدا دیکھتے ہیں اُس بُتِ گمراہ کی راہ یعنی آ نکلے تو کچھ مانگ لیں اللہ کی راہ

•

سیّد علی حیدر طباطبائیؒ

کہنے سُننے سے ذرا پاس آ کے بیٹھ گئے نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

•

غلام حسین شورش

کسی کو حج سے غرض ہے کسی کو جام سے کام قسم مغاں کی ہے ساقی کے مجھ کو نام سے کام

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے گھبرا کے کہیں دل مجھے پھیر کے کہتا ہے ادھر کو چلئے

آہ کنتوری

تیرے دیوانے کو دیکھا تھا درِ زنداں کے پاس
رو رہا تھا سر دھرے ٹوٹی ہوئی زنجیر پر

رحم آتا ہے نہ اپنے کو نہ بیگانے کو
آج سمجھے تری نظروں کے بدل جانے کو

•

مرزا عسکر

بات اب امتحان پر آئی
قصہ کوتاہ جان پر آئی

•

بسمل الہ آبادی

چلنے والے ذرا سنبھل کر چل
موت بھی زندگی کی راہ میں ہے

•

نادم سیتاپوری

دل گیا دل کے ولولے بھی گئے
آپ آئے بھی اور چلے بھی گئے

•

ناظر سیتاپوری

کیا گلا اہلِ دہر کا ناظرؔ
تم برے ہو زمانہ اچھا ہے

•

فارغ سیتاپوری

جہاں میں آئے نحیف و نزار بن کے چلے
ہوا چمن کی یہ بگڑی کہ خار بن کے چلے
درِ علیؓ پہ گدا بھی اگر گئے فارغ
کلاہِ فخر لیے تاجدار بن کے چلے
ملا دے خاک میں اے شوقِ روضۂ حیدرؓ
نجف کی سمت یہ مٹی غبار بن کے چلے

کلام قطع ہو فارغ یہ کیوں نہیں کہتا ‏ ‏ حسینؑ قدرتِ پروردگار بن کے چلے

میں بلبلِ حدیقۂ نظمِ انیس ہوں ‏ ‏ اقلیمِ تاجدارِ سخن کا رئیس ہوں

نور سمٹا ہوا خورشید کی قندیل میں تھا ‏ ‏ دم بخود حشر نہاں صورِ سرافیل میں تھا

•

روش صدیقی

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری ‏ ‏ مگر شکست کا امکان نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ امید ‏ ‏ ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

•

باقر رضوی

جس قدر دانائے رازِ خیر و شر ہوتی گئی ‏ ‏ زندگانی اتنی ہی دشوار تر ہوتی گئی

•

خالد بیگم (دخترِ نواب فخر الدین)

کہا تھا ساربان کے کان میں لیلیٰ نے آہستہ ‏ ‏ کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

•

مہاراجہ محمود آباد

بتوں کے جور کا شکوہ نہیں خدا کی قسم ‏ ‏ ہمیں تو طعنۂ اغیار ناگوار ہوئے

کم سنی کی شرم بھی کیا چیز ہے ‏ ‏ بند آنکھیں کرلیں پردہ ہوگیا

نہ جائیں آپ ابھی جان زار باقی ہے
تنِ مریض میں دم کا شمار باقی ہے
جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

صبح کو سو کے جو ہم بادہ گسار اٹھتے ہیں
اپنے ساقی کو اذاں میں بھی پکار اٹھتے ہیں

خواجہ میر درد

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

مرزا حسین علی جبت

احوال مراد عیاں سے سنتا تھا ولیکن
کچھ بات جو سمجھا تو کہا میں نہیں سنتا

★

دقیقی

چمن کا ذکر اے صیاد لب پر آ ہی جاتا ہے
زمانہ چاہیے اس کو کہ قیدی کی زباں بدلے

آسی الدنی

حال دنیا کی غلط فہمی کا مرنے پر کھلا
اک جہانِ معصیت کا "زندگانی" نام تھا
دشمنِ راحت ہے آسی میرا احساسِ خرد
مجھ کو ورنہ بے حسی میں ہر جگہ آرام تھا

اے بدگماں شدائدِ دنیا پہ صبر کر
فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

صبر پر دل کو تو آمادہ کیا ہے لیکن
ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کے ساتھ

ماجد الہ آبادی

جو تم چاہو تو دم بھر میں نظام دو جہاں بدلے
ذرا میری طرف دیکھو تو رنگ داستاں بدلے

کامل

کہاں ہے کون سنے گا کوئی اس دکھ کی کہانی
وہ کون ہے دنیا میں جسے کام نہیں ہے

ضیاء الحسن موسوی (مولانا ناصر حسن صاحب کے نواسے)

کربلا سجدہ گہ عزم ویقیں ہے کہ نہیں
خاک یہ عظمت آدم کی امیں ہے کہ نہیں

جنون

ہزار فصل گل آئے جنوں وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

حامد علیخان بیرسٹر

ملا کے خاک میں ذکر کمال ہوتا ہے
یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہل دنیا کی

تسلی غمگساروں کو دل درد آشنا دینا
ہجوم غم میں بھی جب بات کرنا مسکرا دینا

خزاں میں تھی یہ تمنا کہ جلد آئے بہار
بہار آئی تو وحشت یہ ہے کہ جائے بہار

قربان علی سالک

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

میر سجاد (شاگرد مبارک آبرو)

بتوں کی بھی یہ یاد و ورد ہے — ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

•

شیخ امیر اللہ تسلیم

اللہ رے اضطراب تمنائے دیدِ یار — اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا

کیا خاک سنوں ناصح مشفق تری باتیں — کہنے میں نہیں میری طبیعت کئی دن سے

•

شبلی نعمانی

دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی — خوب گزرے فلکِ دوں سے جو یاری کرلوں

قائم

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا • صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

واجد علی شاہ

نردئی سے پریت دی نہ کرے — اب جاوے للہ جو بھی سو بھیٹی

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

قید کرتا ہے عبث دیکھ تو صیاد مجھے — روئیں گے مرغِ چمن کر کے بہت یاد مجھے

★

مجنوں

بن کے سائل بھی نہ نکلا کوئی کام　　در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

•

فدوی

کیا تسلی کر گیا تھا یار اس دل کی مرے　　یہ تو کچھ جاتے ہی اس کے اور گھبرانے لگا

•

باجی

صبحدم جب جا چمن میں تم نے زلفیں کھولیاں　　لے چلی بادِ صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں

•

سکندر علی وجد

شمیم زلفِ یار آئے نہ آئے　　مرے دل کو قرار آئے نہ آئے
چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے　　وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

•

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

ہم نہ مانیں کہ کھلی سرخیٔ خواب آنکھوں سے　　پھوٹ نکلا ہے ترا رنگِ شباب آنکھوں سے
شوخیٔ حسن کو اللہ سلامت رکھے　　کہ الٹ دیتی ہے پلکوں کی نقاب آنکھوں سے

•

احسان بن دانش

(از: طوفانِ نغمہ: اندھے پجاری کے چہرہ کی تصویر)

نہ بے صبری نہ بے چینی نہ بیہوشی نہ بیتابی　　وہی مضراب کی ضربت وہی چہرہ کی شادابی

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے
خودسری سر جھکا کے چلتی ہے

اُف وہ معذوریٔ نگاہ کہ جب
زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے

تھک گیا چاند سو چلے تارے
اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے

عشرتِ بے ثبات کی لَو میں
جسم ہنستا ہے روح جلتی ہے

دورِ حاضر کی دوستی احسانؔ
کس قدر جلد رُخ بدلتی ہے

•

شہرت

شکوۂ غیر کا دماغ کسے؟
یار سے بھی مجھے گلا نہ رہا!

•

شاہ عالم

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

•

وحید لکھنوی

آہِ سوزاں لب تک آئی اشکِ ناب آنے کو ہے
جوش میں گُل ہیں دھواں اٹھا گلاب آنے کو ہے

مجھ تک اس کی بزم میں دورِ شراب آنے کو ہے
عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے شباب آنے کو ہے

بھر کے ساقی جامِ مے اک اور لا اور جلد لا
اُن نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنے کو ہے

•

ظہیر دہلوی

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے

مسرور دیرہ دونی

پھر ڈھونڈنے چلا ہے کسی کو مرا خیال
اللہ خوش رہے یہ مسافر جہاں رہے

یوں سختیاں اٹھا شبِ غم کی کہ تیرے بعد
راتوں کے دامنوں پہ تری داستاں رہے

دولہا صاحب عروج

نغمۂ نو مدحتِ شہ میں سناتے ہی رہے
ہم صفیر باغ ہم سے خار کھاتے ہی رہے

لے چلی رحمت گنہ گاروں کو جنت کی طرف
فردِ عصیاں کاتبِ اعمال دکھلاتے ہی رہے

نواب رامپور

اثر آیا دعا میں اس دم ہائے
دل میں جب کوئی مدعا نہ رہا

اقبال صفی پوری

اُف نگاہِ مست کی رعنائیاں
زندگی لینے لگی انگڑائیاں

ہوں تصور میں کسی سے ہم کلام
رشکِ محفل ہیں مری تنہائیاں

وہ بھی سنتے ہیں کلیجہ تھام کر
مجھ سے اچھی ہیں مری رسوائیاں

کس نے چپکے سے مجھے آواز دی
روح میں بجنے لگیں شہنائیاں

سید علی ردولوی

دلِ فرزانۂ فارغ کا کیا کہنا کہ اس گھر میں
نہ صبحِ عید آئی اور نہ شامِ انتظار آئی

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

★

سہیل ردولوی

وہ ہے غفلت شعار آئے نہ آئے
نفس کا کیا شمار آئے نہ آئے

خدا جانے وہ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

تبسّم سے غرض ہے زخمِ دل کو
نسیمِ مشکبار آئے نہ آئے

وفا پر خود ترا خنجر ہے شاہد
کسی کو اعتبار آئے نہ آئے

وہاں روشن ہے شمعِ بے نیازی
کوئی پروانہ وار آئے نہ آئے

ہمارے بعد پھر کوچے میں تیرے
کوئی باحالِ زار آئے نہ آئے

الٰہی برقرار اُن کی تمنّا
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

چھلکا دے آج ساقی کیا خبر ہے
سہیلِ بادہ خوار آئے نہ آئے

•

نہال سیوہاروی

اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ہوگا
وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا

وہ دل کو ترے حسنِ خود آرا سے تعلق
وہ خاک سے پیمانِ نظر یاد تو ہوگا

وہ دھوم زمانہ میں مرے جوشِ جنوں کی
وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا

ہر گام پہ وہ حسن کی پرجوش لگاوٹیں
وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا

وہ عشق کے جذبات کا بھرپور تلاطم
طوفان کی موجوں میں گزر یاد تو ہوگا

عزیز لکھنوی

کہکے بیمار سے یوں بجھ گئی شمع — رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

بہم یہ مشورہ اٹھے ہیں چارہ جو کرتے — اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر — سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے
اگر کہیں وہ دمِ واپسیں چلے آتے — ہم ایک سانس میں تفصیلِ آرزو کرتے
تمام روح کی لذت اسی پہ تھی موقوف — کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

آسماں کو رات بھر بیمارِ غم دیکھا کیا — اس طرف روشن ستارے دل ادھر ڈوبا کیا

•

آصف

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچے میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

•

میر مستحسن خلیق

میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو — پھول جو دستِ باغباں سے گرا

•

آزردہ

یہ کہہ کے رخنہ ڈالئے ان کے حجاب میں — اچھے برے کا حال کھلے گا نقاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

آنند نرائن مُلا

مے رنگیں! پسِ مینا سے اشارے کب تک؟ — ایک دن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ!
تو بدل دے نہ کہیں جوہرِ انساں کا بھی رنگ — اے زمانہ کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ!

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا — ہمیں اب اس سے کیا آئی سحر یا وقتِ شام آیا
توانا کو بہانا چاہیے شاید تشدد کا — پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے — تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

ثناء اللہ فراق

غیر کے دل میں نہ جا کیجیے گا — میری آنکھوں میں رہا کیجیے گا
کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے — بے نوا یا نہ صدا کیجیے گا
وائے اس اپنی سیہ بختی پر — خواہشِ زلفِ رسا کیجیے گا

مولانا محمد علی جوہر

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دورِ حیات آئے گا ظالم قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

نریش کمار شاد

شامِ وعدہ کا ڈھل گیا سایا   آنے والا ابھی نہیں آیا

•

جلالی

آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی   نکلیں ہمارے دل کے بھی ارماں کبھی کبھی
چڑھتا ہے جب وہ بام پہ جاناں کبھی کبھی   ہم دیکھتے ہیں عارضِ تاباں کبھی کبھی
پوچھا شبِ وصال میں آؤ گے میری جاں   کچھ سوچ سوچ کہنے لگے ہاں کبھی کبھی

کیف

کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اترائی ہوئی   ٹھوکریں کھلوائیگی یہ چال اٹھلائی ہوئی
اپنی صورت آئینے میں دیکھ کر کہتا ہے وہ   دیکھئے ہے آج کس کس کی قضا آئی ہوئی
وصل میں خالی ہوئی اغیار سے محفل تو کیا   شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی
میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے تو دے   جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

★

قائم چاندپوری

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند   دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم   یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

★

جمیل مظہری

(ایک جوان عورت جس کی نوجوانی بربادی کی گود میں بسر ہوئی بیوہ ہونے کے بعد محبت میں مبتلا ہو کر

اپنے محبوب سے یوں فریاد کرتی ہے :)

مرے فراق میں جب آہ سرد بھرتے ہو
کبھی جو مجھ کو تصوّر میں پیار کرتے ہو
تمھیں خبر ہے کہ کیا مجھ پہ کر گزرتے ہو؟
نہ جذب دل کو بڑھاؤ! ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

نظر سے دور ہو لیکن ستائے جاتے ہو
نگاہِ شوق کے جادو جگائے جاتے ہو
جگائے جاتے ہو فتنے جگائے جاتے ہو
خیال بن کے نہ آؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

جھکا کے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اُٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

کسی دن آئینہ خانے میں جب سنورتی ہوں
تمھارے شوقِ تماشا کو یاد کرتی ہوں
تمھاری آنکھوں سے کیا اپنے دل سے ڈرتی ہوں
نہ بے حجاب بناؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
میں خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

نہ اس طرح مجھے رسوا کرو خدا کے لئے
لگائی آگ کو ٹھنڈا کرو خدا کے لئے
رعایتِ دلِ عذرا کرو خدا کے لئے
وفا کو آگ لگاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

جھنجوڑ کر نہ جگاؤ کہ سو گیا ہے دل
کئی برس سے عزا خانۂ وفا ہے دل
خدا گواہ کسی کی محل سرا ہے دل
پرائے گھر میں نہ آؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو

جو بجھ گیا ہو سرِ شام وہ دیا ہوں میں
تبسمِ لبِ مایوسی مدعا ہوں میں

شباب و حسن کی میّت ہوں اور کیا ہوں میں
کہیں دل اور لگاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

تمھارے عشق میں جوگن میں بن نہیں سکتی
اجڑ چکی ہوں سہاگن میں بن نہیں سکتی
ہوس کی آگ میں ایندھن میں بن نہیں سکتی
ہوس کی آگ بجھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

نیاز بے ادبِ آرزو معاذ اللہ
کنارِ شوق و لب آرزو معاذ اللہ
میں اور عروسیِ شبِ آرزو معاذ اللہ
نہ ایسے خواب دکھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

ہے فرض کا یہ تقاضا جلا کروں تا عمر
حیاتِ رفتہ کا ماتم کیا کروں تا عمر
کسی کے نام کا کلمہ پڑھا کروں تا عمر
نیا سبق نہ پڑھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

جو گھٹ کے ساز میں رہ جائے وہ صدا ہوں میں
نہ درد سے نہ محبت سے آشنا ہوں میں
یہی سمجھ لو کہ کمبخت بے وفا ہوں میں

مجھے وفا نہ سکھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

کہاں رکھوں دلِ خانہ خراب کی میّت
کنوارے پن کی پُر ارمان خواب کی میّت
حیا کے رکشش پیسے شباب کی میّت
سماج کو نہ دکھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

میں دل میں بیج محبت کا بو نہیں سکتی
حیا کا نام ڈبو دوں ڈبو نہیں سکتی
کسی طرح بھی تمھاری میں ہو نہیں سکتی
میں صدقے جی نہ کڑھاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمھیں خدا کی قسم
شکستہ حالیٔ عذرائے بےوفا کی قسم
جو جل رہی ہو بتدریج اس حیا کی قسم
نہ اور مجھ کو جلاؤ، ڈرو، خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

کدرپیا

موری انکھیاں ڈھونڈ رہیں کدر پیا جن کا تم جانت ہتے
تا جانے کو نے اور گئیں موری انکھیاں ڈھونڈ رہیں

اپنی بپتا میں کا سے کہوں | تمرے کارن جو دکھ پایا
تج دینو تن من دھن | اور چھوڑ تمارے اپنا پرایا
کون کری تھی ایسی برائی | یہی نا تم سنگ پیت لگائی
کدر پیا کچھو نیری کھٹا نا ہیں | مورا کیا مورے آگے آیا

★

ماجد الہ آبادی

ٹھیرا گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی | کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا، کون تھا؟

وقار انبالوی

اسلام کے دامن میں اور اس کے سوا کیا ہے | اک ضربِ یداللّٰہی ۔ اک سجدۂ شبّیری

دشتِ غربت میں بھی دو گھڑیاں خوشی کی مل گئیں | خوش نصیبوں کو بھی یادِ بے وطن آ ہی گئی

اپنی جانب بھی نسیمِ عطر بار آ ہی گئی | قلب کی تسکیں کو بوئے خوشگوار آ ہی گئی

کب آئی کب گئی بادِ بہاری کیا خبر مجھ کو | مبارک صحبتِ گل خوش نصیبانِ گلستاں کو

آرزوئیں مچل کے سینے میں | جانے کیوں تیرا نام لیتی ہیں

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار | لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھئے

مجھ کو بھی تبسم کی ادا یاد ہے اب تک | تجھ کو بھی تقاضائے نظر یاد تو ہوگا؟

حفیظ جالندھری

(نعت)

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی — سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ جس کے گھر نہ چاندی تھی نہ سونا تھا — سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں — سلام اس پر بروں کو جس نے فرمایا یہ میرے ہیں
سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیاسوں کو قبائیں دیں — سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

★

فرحت کانپوری

خلوصِ غم کی وفائیں سلام کہتی ہیں — وفورِ شوق کی آہیں سلام کہتی ہیں
تمہیں چمن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں — کسی غریب کی آہیں سلام کہتی ہیں
حجابِ حسن کا جس پر کہ رعب طاری تھا — وہ نیچی نیچی نگاہیں سلام کہتی ہیں
نگاہِ غیر سے جو راز بن کے رہ نہ سکیں — وہ بے پناہ نگاہیں سلام کہتی ہیں
جنھوں نے تم پہ نچھاور رکئے ہیں دونوں جہاں — وہ پُرخلوص وفائیں سلام کہتی ہیں
تمھارے چشمِ کرم آشنا کو جھک جھک کر — مری حسین خطائیں سلام کہتی ہیں
جو ضبطِ عشق کو دیتی ہیں درس بیتابی — وہ نرم نرم ہوائیں سلام کہتی ہیں
وہ جن سے ملتا ہے زاہد کو اذنِ میخواری — وہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
جو رازدارِ کرم ہیں امینِ درد بھی ہیں — وہ بہکی بہکی نگاہیں سلام کہتی ہیں
جو گھیرے رہتی ہیں فرحت کو ہجر میں اکثر — وہ کالی کالی بلائیں سلام کہتی ہیں

★

علی میاں کامل

باغباں کچھ تجھے معلوم ہے کیوں رویا کی — رات بھر بیٹھ کے شبنم سرِ دردانۂ گل

نکہتِ گل کو صبا تو نے اجازت دی تھی کہ چلی جائے کھُلا چھوڑ کے دروازۂ گل

★

چودھری احسان رسول ردولوی

چلے وہ تو آفت بپا ہو گئی قیامت چھڑوں کی صدا ہو گئی

کہاں چلے مرے اے دلربا سنو تو سہی دلِ ستم زدہ کا ماجرا سنو تو سہی

(ایک مرتبہ سائل آیا اس وقت کچھ پاس نہ تھا، چاندی کا خاصدان اٹھا لائے اور گھر کے پیچھے لے جا کر چپکے سے اس کو دیا)

دے کے سائل کو جو کچھ احسان آتا ہے حجاب ہمت عالی یہ کہتی ہے خزانے دیجئے

★

ہندوستان میں کانگریسیوں سے شکوہ

(از "قومی آواز")

ارباب

اپنی خدمات کی اک دھوم مچانے والو

پچھلے اعمال کی دوکان سجانے والو

حق جتاتے ہو مگر فرض سے کتراتے ہو مرتے ہو نام پہ اور کام سے گھبراتے ہو

کہیں تشکیل پہ صوبوں کی لڑے مرتے ہو کہیں تقسیم پہ عہدوں کی لڑے مرتے ہو

جائزہ قلب کا لیتے ہوئے گھبراتے ہو بزدل ایسے کہ پٹاخوں سے ڈرے جاتے ہو

نہ وہ سن تیس کے تیور نہ بیالیس کا عزم

اب نہ وہ جوشِ صداقت نہ وہ ایمان نہ نظم

چپ ہو تم دیکھ کے آثار ریتہ کاری کے　　یہی انداز ہیں کیا حق کی پرستاری کے؟
تم میں بد عہد بھی راشی بھی ریاکار بھی ہیں　　کتنے ایسے ہیں کہ جو صاحب کردار بھی ہیں؟
عام انساں سے کوئی تم کو سروکار بھی ہے　　اب قیادت کا کوئی تم میں سزاوار بھی ہے؟

قوم بھوکوں مرے اور آپ گوارا کر لیں
گھر جلے دور سے بس آپ نظارا کر لیں

تم میں ہمت بھی، شجاعت بھی تھی خودداری بھی　　حق پسندی بھی تھی مروت بھی تھی رواداری بھی
تازہ دم ہو کے نکلتے رہے زندانوں سے　　ٹکریں لینے کو پھر ظلم کے ایوانوں سے

جب دلوں میں تھے کبھی جرأت عمل اور ایثار
آج افسوس وہی قلب ہیں لالچ کے شکار

تن جفاکش نہیں اب قلب وفا کوش نہیں　　بزم سونی ہے کہ پہلے سے وہ بینوش نہیں
دعوتیں ہیں تو وزارت کی کہیں گھاتیں ہیں　　"کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں"

اتحاد اور محبت کی ادا بھول گئے
پا کے عہدوں کا مزا عہد وفا بھول گئے

روشنی تم کو دکھائی تھی جو گاندھی جی نے　　کیا منور ہیں اسی نور سے اب تک سینے!
رکھ دیا پھونک کے جس آگ نے ایوانِ فرنگ　　جس نے بیکار کئے ظلم کے سب تیر و تفنگ

سچ کہو اب بھی ہے دل میں وہ حرارت باقی
نام کو ہے کہیں تم میں وہ حمیت باقی

اب تو غیرت کو نہیں جوش میں لاتی کوئی چیز　　چھین لی بے عملی نے حق و باطل کی تمیز
اب وہ چرخے کی نہ عزت ہے تمہارے دل میں　　نہ ترنگے کی وہ عظمت ہے تمہارے دل میں

دل میں وہ جذب نہیں روح میں ایثار نہیں
نام باپو کا زباں پر تو ہے کردار نہیں

نامعلوم

روایت ہے کہ شبلی شیخِ کامل — بزرگِ پاک باطن صاحبِ دل
سوئے دار الشفاء گزرے تو دیکھا — کہ بیٹھے سب ہیں صالح اور اطبا
مریضوں سے مکاں سارا ہے معمور — کوئی نزدیک ہے اُن کے کوئی دُور
کہا شبلی نے بھی اس چارہ گر سے — بہا کر اشک اپنی چشمِ تر سے
کہ مجھ کو بھی گناہوں کا مرض ہے — شفا حاصل ہو اس سے یہ غرض ہے
کہا اس نے نہیں اس کی دوا کچھ — نہیں تدبیر جز فضلِ خدا کچھ
کوئی دیوانہ تنکے چن رہا تھا — یہ باتیں جو ہوئیں سب سُن رہا تھا
اٹھا کر سر کہا شبلی ادھر آ — بتا دوں میں دوا اس کی ادھر آ
حیا کے پھول صبر و شکر کے پھل — نیاز و عجز کی جڑ غم کی کوپل
نہالِ صدق کی ڈالی کے اوراق — ادب کی چھال تخمِ حسنِ اخلاق
ریاضت کا اگر ہاون ہو ممکن — تو اس میں کوٹ ان کو رات دن
عرق اشکِ پشیمانی کا لے کر — کیا کر روز اس میں خوب انھیں تر
کئی چلے یہی معمول کر لے — پھر ان کو دیگچی میں دل کی بھر لے
اُجاغِ شوق پر رکھ کر پکانا — رہے خامی تو جان اپنی جلانا
مناسب چھاننے کا پھر ہے ساماں — شفائے قلب کی صافی میں تو چھان
جو چھن کر صاف ہو جائے وہ پانی — ملا کر شکّرِ شیریں زبانی
کہ یہ معجون کھاتی ہے بڑی آنچ — محبّت کی اسے دینا کڑی آنچ

غرض جب ہو چکے معجون تیار
رہے نقصاں نہ باقی کوئی زنہار
تو رکھنا حفظ کی ڈبیا میں بھر کے
ہوائے اتقا سے سر ڈھک کے
جہاں تک تجھ سے کھائی جائے کھانا
کچھ اس کی قدر شربت پر نہ جانا
ہوا ہو جائے گا درد معاصی
جو چاہے امتحاں کر دیکھے حالی

★

غافل

نگاہِ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے
کبھی تو کھینچ لائے گی اُسے گورِ غریباں تک
کہ مدت سے ہماری خاک دامنگیر پھرتی ہے
فراقِ گل میں تو تا باعث نالان و مضطر ہے
بہار رفتہ، پھر، اے بلبلِ دلگیر پھرتی ہے

چودھری محمد علی ردولوی

(وجہ شاعری از قلم موصوف)

ایک مرتبہ صدیق حسن صاحب نے سرخے آم کی قلمیں مانگی تھیں اور مزاحاً لکھا تھا کہ اگر کمشنروں کے علاوہ کسی اور کو بھی سُرخے دیئے جاتے ہوں تو ہم کو بھی بھیجو۔ پارسال وہ فیض آباد میں کمشنر تھے اور ان کو دو تین بار آم بھیجے تھے۔ ابکی سال تھے ہی نہیں بھیجتا کیسے۔ میں نے جواب میں شروع سے چند اشعار سودا کے ع

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک

میں سے لکھے اور اس کے بعد جوڑ لگایا وہ حسب ذیل ہے:

کھولے آغوشِ محبت کو بڑھا میں جوں ہی
پیچھے ہٹ کر کہا اس نے کہ ذری دور سرک
ہوں میں "سرخے" کی پری تو نے نہیں پہچانا
اور بھی ایسی کہیں دیکھی تھی چہرے کی دمک
میں خفا تجھ سے ہوں اور کہنے یہی آئی ہوں
کہ نہ دیکھے گا تو اس بار مرے پھل کی ڈلک

میں ہمیشہ رہی حکام سے بھٹکی بھٹکی — یہی انداز رہا یہ ہی رہی میری مڑک
جب میں آئی ہوں ترے گھر تو ہی کہہ دے سچ سچ — کس کمشنر نے کبھی دیکھی اس آنچل کی جھلک
اور غضب تو نے کیا بھیجا مجھے فیض آباد — ایسی رسوائی ہوئی تھی نہ مری آج تلک
ہے سزا تیری کہ اک سال نہ آؤں ترے پاس — رہے دل بیچ ترے بس مری فرقت کی کسک
گر ملاقات ہو صدیق حسن صاحب سے — میری تسلیم کو پہنچانا مقدر اُن تک
اور کہنا کہ قلم میرے رہیں جو حاضر ہیں — باقی بھجواؤں گی تیار کرا کر ان تک
ان کی بیگم کو بھی پیغام مرا دے دینا — کوئی اصلاح ہے یہ نظم کہاں اس میں نمک

★

خمار بارہ بنکوی

کبھی ہوا جو انھیں میرے درد کا احساس — مرا نصیب پکارا کہ دیکھتا ہوں میں

الفاظ میں نہ ڈھونڈ مری بیقراریاں — اے بےخبر! زباں نہیں یہ دلِ بیقرار ہے

کہانی میری ہی گزرے ہوئے ایام زندگی کی — مجھی کو اب حدیثِ دیگراں معلوم ہوتی ہے

وہ بدنصیب ہیں جنھیں غم ناگوار ہے — یہ تو دلیلِ رحمتِ پروردگار ہے

ننگِ چمن تھا میرا نشیمن سو مٹ گیا — اب واقعی بہار مکمل بہار ہے

سکندر علی وجد

شمیم زلفِ یار آئے نہ آئے۔ مرے دل کو قرار آئے نہ آئے + چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے۔ وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

نواب اختر محل اختر

اک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا — لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمین پر مٹا دیا　　ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

★

نواب بادشاہ محل عالم

مجھ سے آزردہ مرا یار ہے آج　　صبر کیا کسے قرار ہے آج!
ساقیا کس کا جام عشق پیا　　چشمِ بد دور! کیا خمار ہے آج

●

مشتری (قمر جان لکھنؤ سے)

مے ہے گلزار ہے ساقی ہے گھٹا چھائی ہے　　کہہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے
لی خبر اپنے مریضِ شبِ غم کی نہ کبھی　　بس انہی باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے
شبِ فرقت کے جو اے مشتری جاگے تھے ہم　　کیا تہِ خنجرِ قاتل ہمیں نیند آئی ہے

پھری چشمِ بتِ بے پیر دیکھو　　ہماری گردشِ تقدیر دیکھو
جگر میں چبھ رہی ہیں مثلِ نشتر　　نگاہِ شوق کی تاثیر دیکھو
اشارہ کر رہے ہیں مجھ سے گیسو　　پڑے گی پاؤں میں زنجیر دیکھو
اگر ہے خوشنویسو شوقِ تحریر　　بتوں کی سرمہ تحریر دیکھو
چلو اے مشتری واں سر کے بل　　بہار روضۂ شبیر دیکھو
مانئے کہنا در دولت پہ رہنے دیجئے　　ہم فقیروں سے ہے سلامی بادشاہی آپکی

امراؤ جان زہرہ لکھنؤ سے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے　　سامنا آج کس بلا کا ہے
اپنے مطلب کے آشنا ہیں سب　　آشنا کون آشنا کا ہے
شیخ نے کعبہ برہمن نے دیر　　درِ میخانہ ھتّم تا کا ہے

کیا کرے رہ کے ہند میں زہرہ — عزم بالجزم کربلا کا ہے

•

موتی جان موتی

شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی — خیالِ ماہ رو ہے اور میں ہوں

★

امراؤ جان دلبر

سوجھی ہے کتنی دور کی مجھ کو خمار میں — بنت العنب کو پھر میں بٹھاؤں کنار میں

ہم لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں — پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

اللہ رے شوق کوچۂ قاتل کہ بعد مرگ — اٹھ کر مزارِ اغیار گیا کوئے یار میں

•

صاحب جی امۃ الفاطمہ

(محبوبۂ مومن)

نظر ہے جانبِ اغیار دیکھئے کیا ہو — پھری ہے کچھ نگہ یار دیکھئے کیا ہو

★

محترمہ شہر بانو

(کراچی کے طلباء پر سنہ ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ نے جو گولیاں چلائی تھیں

اس پر ایک مہاجر لڑکی کے درد آمیز خیالات)

خود دیپ جلا کر خون سے اپنے کتنے مجاہد سوئے ہیں

یہ کس کی مالا ٹوٹی ہے یہ کس کے موتی کھوئے ہیں

نوخیز شہیدوں پر ساقی کچھ میں ہی نہیں ہوں نوحہ کناں

خود صبح کی پلکیں بوجھل ہیں خود چاند ستارے روئے ہیں

ہم ان سے عزم کی مشعل لے کر اپنی منزل پالیں گے
وہ مشعل جس نے نگر نگر ظلمات کے دھبّے دھوئے ہیں

★

کمال

ایک کافر پر طبیعت آگئی — پارسائی پر بھی آفت آگئی
ہمدم اس کو دل لگی سمجھا ہے تو — دل نہیں آیا مصیبت آگئی
چپکے چپکے رو رہے ہو کیوں کمالؔ — سچ کہو کس پر طبیعت آگئی

•

سنتوکھ لال بیتاب

جی میں ہے اس کی بات میں اب پھر نہ بولئے — لیکن کسی طرح جو یہ کافر زباں رہے

★

عندلیب شادانی

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے — تیز سی کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

زھرہ نقوی

میری تمنّا دید کی اور اُن کا جلوہ دید کا — ایمن پہ تھا گویا تماشا پھر کلیم دل ہی کا
ہنسیں کیا اِن کھلے غنچے جو نہی بادِ صبا گذری
لگے لُٹنے بجیسے شبنمی کے بے بہا موتی

فیض احمد فیض

نام فیض احمد۔ تخلص فیض۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اور عربی میں ایم اے کیا۔ "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر ہیں۔ راولپنڈی کے مقدمہ سازش کے سلسلہ میں جیل میں رہے۔

ان کی تصانیف نقش فریادی اور دستِ صبا ہیں۔ "میزان" زیر طبع ہے۔

ردیف ن

شمع نے کھینچی وہ تصویرِ مآلِ زندگی
ہر نسیمِ صبح کے جھونکے پہ تھراتا ہوں میں

ردیف ے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بیقرار گزری ہے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ نگاہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا کو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

احمد ندیم قاسمی

احمد شاہ نام تخلص ندیم۔ ۱۹۱۵ء میں بمقام انگہ (سرگودھا) پیدا ہوئے۔
تعلیم بی اے تک ہوئی۔ "امروز" لاہور کے مدیر ہیں۔
تصانیف: جلال و جمال، شعلۂ گل، رم جھم، چوپال، بگولے وغیرہ۔

افق نہاں ہے تو حدِّ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور! فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہ گزر کا ذکر کریں

مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں؟
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جُو تو نہیں!

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بُو تو نہیں؟

یہ سب درست شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں؟

عدمؔ

نام سید عبدالحمید۔ تخلص عدمؔ۔ تلونڈی موسیٰ خاں میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش جون ۱۹۰۹ء۔ بی اے تک تعلیم ہوئی، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں ملازم ہیں
تصانیف: نقشِ دوام اور کچھ مجموعے۔

ردیف الف

رات کٹنے کے منتظر ہو عدمؔ ۔۔۔ رات کٹ بھی گئی تو کیا ہوگا؟

نغمے کی گونج، پھول کا رس، مہ کی چاندنی ۔۔۔ جس کے یہ نام ہیں وہ جوانی کا جوش تھا

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر نکل گیا ۔۔۔ ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

ردیف ن

خمارِ زلفِ پریشاں تلاش کرتا ہوں ۔۔۔ بڑے حسین شبستاں تلاش کرتا ہوں
ابھی خدا کی ضرورت نہیں عدمؔ مجھ کو ۔۔۔ ابھی تو میں کوئی انساں تلاش کرتا ہوں

خواہشیں بے ریا بھی ہوتی ہیں ۔۔۔ ہر غرض مطلبی تو نہیں!

ساقی تری نگاہ کو کہتے نے غرور سے ۔۔۔ ہر حادثے کا ردِّ عمل کہہ گیا ہوں میں

جوانی ایک نادانی ہے نادانی مسرّت ہے مسرّت کے لبوں پر ہوش کی باتیں نہیں ہوتیں

نمازوں سے بہتر ہیں دل کی خطائیں دُعا کیجئے یہ دُعا کیجئے جذبے نہ جائیں

راستے کوچۂ جاناں کے حسین ہوتے ہیں صاحبِ ہوش خراباتِ نشیں ہوتے ہیں
تیرے وعدوں کی حقیقت تو عیاں ہے لیکن آہ وہ لوگ جو مجبورِ یقیں ہوتے ہیں

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں
تیری محفل میں بیٹھنے والے کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں
اے عدمؔ احتیاط لوگوں سے کیسے منکر نکیر ہوتے ہیں

دل سے رنگین صورتیں نہ گئیں زندگی کی ضرورتیں نہ گئیں

اُلٹے اُلٹے مطالبات نہ کر زندگی اس قدر رئیس نہیں
نوجوانی میں زہد کی کوشش بات اچھی تو ہے نفیس نہیں

ردیف ف

رہِ حیات میں گرمی بلا کی پڑتی ہے کہیں سے سایۂ زلفِ سیاہ لے جاؤ
مبادا داورِ محشر تمہیں نہ پہچانے ہمیں بطورِ ثبوت و گواہ لے جاؤ
عدمؔ اِبہشت میں دل تو بھی چاہتے ہو اگر تو پھر وہاں بھی کوئی جلوہ گاہ لے جاؤ

وقت کی کوئی بات کرو — زلف بکھیرو۔ رات کرو
آج بڑا مغموم ہے دل — یارو! کوئی بات کرو

چھپانا بڑے عیب کی بات ہے — علامؔ جو کرو آشکارا کرو

ردیف ھ

شیخ اور بہشت کتنے تعجب کی بات ہے — یارب! یہ ظلم خلد کی آب و ہوا کے ساتھ!

ردیف ی

مہ جبینوں سے آشنائی کی — بندگی کی۔ کہ کبریائی کی

محشر میں اک سوال کیا تھا کریم نے — مجھ سے وہاں بھی آپکی تعریف ہو گئی
احباب بدمزاجیٔ زاہد نہ پوچھئے — میں پی رہا تھا آپ کو تکلیف ہو گئی

ردیف ے

جب گردشوں میں جام تھے — کتنے حسیں ایام تھے

سنو سنو کہ کہانی بڑی شگفتہ ہے — حدیثِ خوابِ جوانی بڑی شگفتہ ہے
حسیں بھی ہم کو بتاتے ہیں انکھڑیوں پہ علامؔ — ہماری سادہ بیانی بڑی شگفتہ ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے — چمن میں یہ کون آگیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

جام جب گلفروش ہوتا ہے　　کس کو توبہ کا ہوش ہوتا ہے
سطح کے شور سے نہ گھبراؤ　　قعرِ دریا خموش ہوتا ہے
جتنی ہشیار ہیں تری آنکھیں　　اس قدر کس کو ہوش ہوتا ہے
جو نیا دن طلوع ہوتا ہے　　قصۂ خوابِ دلکش ہوتا ہے
پہلی پہلی محبتوں میں عدمؔ　　کتنا جوش و خروش ہوتا ہے

عزمِ توبہ تو کر رہا ہوں میں　　تیری رحمت خفا نہ ہو جائے
او مری سمت دیکھنے والے　　تو مرا مدعا نہ ہو جائے
آدمیت عدمؔ گناہ نہیں　　اتنے کہ وہ خدا نہ ہو جائے

مسئلہ زندگی کا اے ساقی　　کتنا پُرپیچ اور سادہ ہے

کلی کو یہ نہیں شاید کسی نے سمجھایا　　کہ پھول کھل کے بہت شرمسار ہوتا ہے

گزر تو خیر گئی ہے عدمؔ حیات مگر　　ستم ظریف بڑی بے رخی سے گزری ہے

زندگی بن سنور کے نکلی ہے　　مانگ میں رنگ بھر کے نکلی ہے

شفیق جونپوری

ردیف الف

نہ صراحی نہ سبو اور نہ ساغر دینا
رند خطرہ میں ہیں ساقی مجھے خنجر دینا

میرے مالک اگر احساس دیا ہے تو مجھے
عَلَم و بارگہ و خیمہ و لشکر دینا

تاجپوشی اسے زیبا ہے جسے آتا ہو
عدل و انصاف سے دامانِ زمیں بھر دینا

اے مسیحائے شفیق اپنے گرفتاروں کو
چشمِ تر سینۂ سوزاں دلِ مضطر دینا

آنکھوں میں دلوں میں گھر کرکے تکمیل ہو گر بربادی کی
وہ جانِ گلستاں کیا ہوگا جو خاکِ گلستاں ہو نہ سکا

برباد بھی ہو تو اے نکہت اپنے ہی چمن کی خاک بنے
گل شاخ سے بھی ٹوٹا لیکن آوارۂ ویراں ہو نہ سکا

معلوم نہیں کیوں رنگ و طرب کی عمر بہت کم ہوتی ہے
گلشن میں خزاں سو بار آئی صحرا کبھی ویراں ہو نہ سکا

میں خوب سمجھتا ہوں پیارے سرمایہ پرستوں کی چالیں
تنظیمِ غریباں کرنے لگے جب خونِ غریباں ہو نہ سکا

ردیف د

ساغر و مینا پہ رونق پھر نہ آئی میرے بعد
میرے ساقی نے بہت محفل سجائی میرے بعد

میں قفس میں تھا نشیمن کا نگہباں کون تھا
آسماں نے دھوم سے بجلی گرائی میرے بعد

بے رُخی کی شان میری ناز برداری سے ہے
بھول جائے گا کوئی بے اعتنائی میرے بعد

کون لے گا میرے نشیمن کی خبر میرے بعد
ہم صفیروں نے بھی بدلی ہے نظر میرے بعد

حضور کچھ تو بہاروں کا احترام کریں
ہوائے گل میں مذاقِ جنوں بھی عام کریں

چراغِ دشت بھی قندیلِ بزم ہو جائے
ہر ایک آہوئے وحشی کو کیوں نہ رام کریں

فضا میں کتنے ہی برق و شرر ہیں آوارہ
ہر اک کرن کو سنواریں یہ اہتمام کریں

محیطِ بحر کے موتی فرازِ کوہ کے تاج
نثارِ سلسلۂ گیسوئے عوام کریں

ردیف ی

نہیں معلوم یہ شہرِ خموشاں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

زمانے کے تغیر کی کہانی پوچھتے کیا ہو
کہ ہم سے اپنی ہی تصویر پہچانی نہیں جاتی

وہ جھولا جھولنے والا تو رخصت ہو گیا ہمدم
ہماری حسرتِ گہوارہ جنبانی نہیں جاتی

اسیرانِ قفس کو بھول بیٹھے سب چمن والے
صبا! تو بھی تو کرنے کو گل افشانی نہیں جاتی

فغاں میں لطف ہے آنسو میں لذت درد میں درماں
بڑی راحت کا ساماں لے کے شامِ انتظار آئی

واعظ کی مذمت کا بُرا مان نہ ساقی
اس سے ترے میخانہ کی عظمت نہیں جاتی

پانی سے بنی باغ میں شبنم عرقِ گل
فطرت میں جو ہوتی ہے لطافت نہیں جاتی

ردیف ے

یہ کیا؟ انسان ہو کر بھی کوئی بیزار ہو مجھ سے
مجھے تو اے شفیق اپنی کمی معلوم ہوتی ہے

ہمیں بھی ایک گوشے میں جو تھوڑی سی جگہ ملتی
ہمیشہ ساکنانِ کوئے جاناں کو دعا دیتے

بڑھی جاتی ہے روشنی سے بے ذوقی پرستش کی
جو وہ پردہ اٹھا دیتے تو پھر سجدے مزا دیتے

شفیق اے زندگی کی قدر و قیمت کیا محبت میں
جو ہوتی دولتِ کونین تو ان پر لٹا دیتے

بیوہ کے آنسو

تمنا کے گل و گلزار تم کو یاد کرتے ہیں
مرے داغِ دلِ بیمار تم کو یاد کرتے ہیں

بہت دن ہو گئے دیکھے بہارِ خوش خرامی کو
تمہارے کوچہ و بازار تم کو یاد کرتے ہیں

خوشی سے چہچہائیں گے پرندے پھر منڈیروں پر
چلے آؤ در و دیوار تم کو یاد کرتے ہیں

موت کے نام سے کانپ اٹھتے ہیں دنیا والے
کون سمجھا ہے کہ جینا بھی الم ہوتا ہے

نہ وہ دل ہے نہ وہ دل کی امنگیں
جوانی! اب تجھے لاؤں کہاں سے؟

یہ دھن کسی کو نہیں گل کھلیں بہار آئے
یہ فکر ہے کہ چمن زیرِ اختیار آئے

چمن میں پھر وہی گلچیں ہے پھر وہی صیاد
خیال تھا کہ اسیری کے دن گذار آئے

شفیق اس وقت ہوتا اور ہی نقشہ گلستاں کا
ذرا پہلے نہ پہچانی نگاہِ باغباں ہم نے

تجلّیٔ مہ و انجم سے کھیلنے والے — کبھی زمین کے ذرّوں پہ بھی تو پیار آئے

لذّتِ غم

لوگ کہتے ہیں مسرّت ہے شبابِ زندگی — میں سمجھتا ہوں مسرّت کو حجابِ زندگی
زندگی کے واسطے درد کا ہے سوز و گداز — تلخیٔ غم ہی سے ہے کیف شرابِ زندگی

زندگی محدود کیوں کر دوں خوشی کے واسطے — غم میں بھی ہوتی ہے لذّت آدمی کے واسطے
جس کے احساسِ الم سے چاک تھا دامانِ صبر — آج روتا ہوں اسی آشفتگی کے واسطے

صبح دم شادابیٔ گل کی فراوانی بھی دیکھ — پھر چمن سے دورِ نکہت کی پریشانی بھی دیکھ
اے گرفتارِ فریبِ رنگ و بو ہشیار باش — اپنے پھولوں کا مآلِ چاک دامانی بھی دیکھ

حکیم صاحب عالم صاحب لکھنوی

لکھنؤ کے بڑے مشہور حکیم اور بڑے معزز خاندان سے ہیں۔ پیشہ شاعری نہیں ہے۔ قصیدے وغیرہ خوب کہتے ہیں۔ اور کبھی مزاحاً تفریحِ طبع کے لئے حسب ذیل طبع آزمائی بھی کی ہے۔

چنے کابلی اور مٹر بیچتا ہوں — کہ محنت کے اپنے ثمر بیچتا ہوں
جنہیں دیکھ کر منہ میں بھر آئے پانی — کچالو وہ لذّت اثر بیچتا ہوں

جنھیں کھا کے بھر آئیں آنکھوں میں آنسو
وہ سوزِ زبان و نظر بیچتا ہوں

یہ ڈوبی ہوئی ہچکیاں دردِ غم میں
زمین پر میں نجمِ سحر بیچتا ہوں

غریبوں کی دنیا بھی اب چٹ پٹی ہے
امیروں کی حرص، نظر بیچتا ہوں

یہ منعم نہ سمجھیں غریبوں کو چھوٹا
دہی کے بڑے بیشتر بیچتا ہوں

لگا کر سرِ راہ اک خوانِ الواں
تقاضائے ذوقِ نظر بیچتا ہوں

بہ ذوقِ خریدار و ظرفِ تحمّل
نمک مرچ میں ڈال کر بیچتا ہوں

بہ صوتِ ہزاراں بہ کیفِ بہاراں
جنوں خیز سودائے سر بیچتا ہوں

جلاتی ہیں آنکھیں بہائے ہیں آنسو
میں شورابہ چشمِ تر بیچتا ہوں

کدھر ہیں خریدارِ جنسِ تکلّم
کہ میں نطق کے بال و پر بیچتا ہوں

کوئی کہہ دے ان بے دلوں سے وطن کے
میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں

لگا کر صدا میں علی الرغم شاعر
متاعِ دلِ باخبر بیچتا ہوں

میں جبرِ مشیت کا مارا ہوا ہوں
نہیں کوئی گاہک مگر بیچتا ہوں

محترمہ زہرہ نگاہ صاحبہ

پہلی بار لاہور میں زہرہ نگاہ صاحبہ کو ۱۹۵۱ء کے مشاعرہ میں دیکھا اور ان کا کلام سُنا یونیورسٹی ہال کا (جہاں مشاعرہ ہو رہا تھا) گوشہ گوشہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں عورت مرد، بڈھے، جوان، مقطع، غیر مقطع، صاحبِ مذاق اور بدمذاق سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ وہاں دیکھا یہ گیا کہ ہر شخص پر قیامت کا اثر ان کے کلام کا ہوا۔ نیا انداز، نیا درد، نئے احساسات فضا میں منتشر ہونے لگے۔ وہ چونکہ انسانیت کا درد تھا، ہمارا اپنا درد

تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مقصد پیشہ نہیں تھا ۔ بلکہ شاعری سے بہت دور سچے جذبات تھے جو بلا ارادہ دلوں میں در آئے ۔ اور پھر اس کے بعد ظاہر ہے جو شور عقیدت اس مشاعرے میں ہوا ہوگا ۔

عمران کی بیس بائیس سال ہوگی ۔ پہلے حیدر آباد دکن ان کا جائے قیام تھا، اب کراچی میں رہتی ہیں ۔

کیوں اے غمِ فراق یہ کیا بات ہوگئی
ہم انتظارِ صبح میں تھے، رات ہوگئی

سینوں میں سوز و سازِ محبت نہیں رہا
دُنیا رہینِ گردشِ حالات ہوگئی

بھٹکے ہوئے بھٹکتے ہوئے کارواں کی خیر!
رہبر سے راہزن کی ملاقات ہوگئی

دیوانگی کی خیر نہ مانگیں تو کیا کریں
دیوانگی ہی رازِ عنایات ہوگئی

لو! ڈوبتوں نے دیکھ لیا ناخدا کو آج
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات ہوگئی

راہ کو ہم نے استوار کیا
تم نے منزل کو اختیار کیا

اس نے آنکھوں کی زندگی چھینی
عمر بھر جس کا انتظار کیا

جانے کیسی نسیم تھی جس نے
سارے غنچوں کو شرمسار کیا

اپنے ہونٹوں کی اک ہنسی کے لئے
کتنی آنکھوں کو اشکبار کیا

ہم نے دنیا پہ سُن تو اے ناصح
کچھ سمجھ کر ہی اعتبار کیا

اُپدیش

آؤ چلو اب مل کے گرا دیں یہ دیواریں ساری
نئے زمانوں میں رہ کر ہم نئے ترانے گائیں گے
ان کھیتوں کو جلا کے چھوڑو جنمیں بھوکیں اُگتی ہیں
یہاں پہ بھوک کی ننگی جنتا پھرتی ہے ماری ماری
دن کو چھپ چھپ کے روٹی مانگے رات کو چھپنے لاج
کھاتی پیتی دنیا بن گئی ساتھی اک شمشان
سمے نہیں یہ پیار کا ساتھی پیار کا ناتا توڑ دو
آؤ چلو اب مل کر ساتھی امن کے گانے گائیں گے

آؤ بڑھو اب کانپ رہی ہے یہ سرمایہ داری
اپنے جیون کے رستوں پہ اپنے دیئے جلائیں گے
ان محلوں کو مٹا کے چھوڑو جنمیں لاشیں پلتی ہیں
یہاں کے نیتا آج بنے ہیں انساں کے بیوپاری
بیٹی دے دیتے ہیں ان کو روٹی کے محتاج
ستا رہے ہیں انساں کو نت نئے بھگوان
پیار کا ناتا مجھ سے نہیں تو دُنیا ہی سے جوڑ دو
دُنیا کو ہم ظلم و ستم کے قیدوں سے بچائیں گے

نوید

کفِ دست میداں ہمالہ کی چوٹی
زمینِ دکن اور گنگا کی وادی
فضا سندھ کی اور دامانِ راوی
شرارِ بغاوت کی ہر اک پہ لالی
عزائم کے دھارے کہاں روک دوں میں
مشیّت کے فرمان کو کیا کروں میں
تماشے دکھلائے جنوں نے خرد کو
کیا اپنے ہاتھوں سے مجروح خود کو
رہا کب بھروسہ کسی پر کسی کو
نظر ڈھونڈتی ہے کسی اجنبی کو
زمانے کے رجحان کو کیا کروں میں
مشیّت کے فرمان کو کیا کروں میں

بدل جائیں راہیں رکیں گے نہ دھارے — بڑھے ہیں امنگوں کے لے کر سہارے
چڑھا سر پہ ہے خوں نظر میں شرارے — کھنڈر بن کے رہ جائینگے قصر سارے
عنانِ تخیل کدھر موڑ دوں میں
مشیت کے فرمان کو کیا کروں میں

سہمتے نہیں پھول گلچیں کے ڈر سے — متحیر عیاں نرگسی چشمِ تر سے
شرارے ہیں پیدا گلوں کے جگر سے — بھڑکتے ہیں جوہر نسیمِ سحر سے
نسیمِ سحر کس طرح روک دوں میں
مشیت کے فرمان کو کیا کروں میں

چھلک رہی ہے مئے نابِ تشنگی کے لئے — سنور رہی ہے تری بزم برہمی کے لئے
نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں — تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لئے
جہانِ نو کا تصور۔ حیاتِ نو کا خیال — بڑے فریب دیئے تم نے بندگی کے لئے
جو تیرگی میں ہویدا ہو قلبِ انساں سے — ضیا نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لئے
جو کر رہے ہیں پسِ پردہ دشمنی اب تک — بڑے خلوص سے آئے تھے دوستی کے لئے
نہ منزلوں کی تمنا نہ رہگذر کی تلاش — نہ جانے کس پہ بھروسہ ہے رہبری کے لئے
مئے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں — جبھی تو پی کے ترستے ہیں بیخودی کے لئے
ترے جہاں کی ہر دلکشی سلامت ہے — مری نگاہ بھٹکتی ہے آدمی کے لئے

سنا ہے ضبط مرا تجھ کو ناگوار سا ہے — دلِ خموش جبھی آج بیقرار سا ہے
تمام اہلِ چمن کر رہے ہیں یہ محسوس — بہارِ نو کا تبسم تو سوگوار سا ہے
خدا کی شان کہ جب منزلیں قریب آئیں — مرا وجود تری رہگذر پہ بار سا ہے

بہارِ نو کا بہانہ نہ ڈھونڈنا پھر تم
کہ یہ فریب نگاہوں پہ آشکار سا ہے

یہی جواب ہے واعظ تری نصیحت کا
میں کیا کروں مجھے دنیا پہ اعتبار سا ہے

نئی سحر کے اُجالوں کی روشنی مت پوچھ
یہ حال ہے کہ اندھیرا ابھی شرمسار سا ہے

سنا ہے جب سے کہ اظہار ہے بیاں محبوس
تخیلات کی محفل میں انتشار سا ہے

وہ سامنے ہی تو ہے منزلِ امید مگر
بھٹک گئے ہیں اندھیروں میں آج اہلِ نظر

بڑی عجیب ہے اس زندگی کی راہگذر
نہ ابتدائے سفر ہے نہ انتہائے سفر

نقابِ چہرۂ شب اٹھ چکا مگر پھر بھی
اداس اداس اُجالے بجھی بجھی ہے سحر

نشانِ جادۂ منزل مجھے ملا بھی تو کیا
بھٹک رہے ہیں ابھی تک مرے شریکِ سفر

بدلتے وقت کے طوفان رہزنوں کو نہ چھیڑ
ستا رہے ہیں خدائی کو نت نئے رہبر

ترے خیال تری جستجو تری خواہش
تفکراتِ زمانہ میں چھپ گئے اکثر

یہ کائناتِ حسن اور پھر جمیل اتنی
ہے تیری شانِ خدائی کہ میرا حسنِ نظر

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے میخانے

فنا کے زمزمے رنج و محن کے افسانے
یہی ملے ہیں نئی زندگی کو نذرانے

جو سن سکو تو یہ سب داستاں تمہاری ہے
ہزار بار جتایا مگر نہیں مانے

جو کر گئے ہیں جدا ایک ایک سے ہم کو
دیارِ غرب سے آئے تھے چند بیگانے

خزاں کا ذکر ہی کیا چھوڑ دے اسے ساقی
بہار میں بھی ترستے ہیں تیرے دیوانے

یہ کیا ستم ہے کہ پیرِ مغاں وہی ہے ابھی
نئی ہے بزم نئی مے نئے ہیں پیمانے

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

غزل

فنا ہو چکی ہیں زمانہ کے ہاتھوں / تری جلوہ گاہیں مری سجدہ گاہیں
اندھیروں میں ہے امتحاں جستجو کا / چلو عزم و ہمت کی شمعیں جلائیں
یہ ماحول اور زندگی کا تصور / کسے یاد رکھیں کسے بھول جائیں
کہاں تک ستائیگا انساں کو یزداں / چلو اس کو آدابِ انساں سکھائیں
ستانے کی خاطر، بھلانے کی خاطر / کہیں ہم زمانے کو یاد آ نہ جائیں
ہے اک آسماں پر ہزاروں زمیں پر / بتاؤ کہاں تک جبینیں جھکائیں

ہم اٹھ گئے تو تری انجمن میں جام آئے / جو بیقرار گئے تھے وہ تشنہ کام آئے
یہ کہہ رہی ہے خرد سے جنوں نواز نظر / جو اہلِ ہوش تھے وہ بھی تو زیرِ دام آئے
ترے تدبرِ عالی کی خیر ہو یارب / کہ میرے ساتھ مری زندگی پہ نام آئے
وہ چل بسے موت کے ساماں ہیں یا تلاشِ بقا / خوشا نصیب کہ ہم تک ترے پیام آئے
بڑا غرور تھا ہوش و خرد پہ انساں کو / جنوں کی راہ میں ہوش و خرد نہ کام آئے
ابھی تلک ہے اثر ان کی حکمرانی کا / کہ ان کے نام جب آئے بہ احترام آئے
تفکرات و حوادث کا نام لوں کیونکر / مرے لبوں پہ جب آئے تمہارے نام آئے

قدم قدم پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ / انھیں بجھاؤ تو صبحِ وطن کی بات کرو

ہوائے یاس کا جھونکا یہاں نہ آ جائے / کہیں چراغِ رہِ زندگی نہ بجھ جائے
وہ بدگماں کہ مجھے منزلیں قبول نہیں / مجھے یہ ڈر کہ مری جستجو نہ مٹ جائے
خیالِ منزلِ مقصود خوب ہے لیکن / وہ کیا کرے جو تری رہگذر میں کھو جائے
چھلکتے جام ہیں ساقی ہے اور میخانہ / ڈرو کہ گردشِ دوراں کہیں نہ رک جائے

فنا کے گیت نہ گا زندگی کے سازِ دل پر — کہیں حیات کا پیغامِ سحر نہ سو جائے
تفکراتِ زمانہ حوادثِ پیہم — مجھے قبول مگر زندگی نہ تھک جائے

انتظار

گھٹی گھٹی سی فضاؤں میں جستجو ہے اُداس — تھکے تھکے سے خیالوں میں کھو چکے ہیں دماغ
نہ پوچھ حالتِ دُنیا نہ پوچھ حالتِ دل — کہ بجھتے جاتے ہیں احساسِ زندگی کے چراغ

(۲)

ترا جنون ترا شوق اور یہ ماحول — ترا خیال، تری یاد اور اندھیری رات
چڑھا دیئے ہیں اندھیروں پہ روشنی کے خول — کسی طرح تو چھپے تلخیٔ غمِ حالات

(۳)

یہ ظلمتوں کا تجمل شرارہ ریز سہی — سرورِ نورِ محبت مٹا نہیں سکتا
ہوائے یاس کا جھونکا بہت ہی تیز سہی — چراغِ جوششِ تمنا بجھا نہیں سکتا

(۴)

اسی جگہ پہ جہاں موت امن ساماں ہے — اسی جگہ پہ جہاں تیرگی فروزاں ہے
اسی جگہ پہ جہاں راحتوں کے دوش بدوش — بہ یادِ لطفِ ستم زلفِ غم پریشاں ہے

(۵)

عظیم عزمِ بغاوت عظیم جوش و خروش — اٹھو اٹھو کہ شکستہ ہر اک کمند کریں
جہاں ہیں نعرۂ انسانیت پہ تعزیریں — وہیں پہ سوزِ محبت کو سربلند کریں

(۶)

کہاں ہے روشنیٔ حسنِ روحِ انسانی — مہیب رات کہیں خود سحر نہ بن جائے
چراغِ ظلم و ستم جب نہ راہ دکھلائے — یہ انتظار اب عزمِ سفر نہ بن جائے

صادق الشبر جامی ردولوی

دل ملا ان کو ۔ درد دل ہم کو — اپنے اپنے نصیب کی ہے بات
کون کہتا ہے آپ اثر لیجئے — بات تو سنئے قبلۂ حاجات!
بارہا سامنا ہوا اُن کا — لب تک آئی مگر نہ دل کی بات
ہائے مجبوریاں محبت کی — انکی اک ہاں نہیں پہ موت ۔ حیات
آہیں بھرنا کبھی ۔ کبھی رونا — کتنے پُر کیف ہیں مرے دن رات

جو الفت کی تذلیل کریں جو مہر و وفا کو ٹھکرائیں — اے جذبۂ خودی کیوں ان کیلئے ہم دل کو بچھائے جاتے ہیں
آگاہ مآلِ الفت سے ۔ انداز ان کے دیکھے بھالے — اُف دیدہ و دانستہ جامی ہم دھوکا کھائے جاتے ہیں

واں ملنے سے انکار ہے معلوم نہیں کیوں — اور مجھ کو بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں
سو بار مروں اور جیوں تب انھیں پاؤں — دل اس پہ بھی تیار ہے معلوم نہیں کیوں
ہے جرم کا احساس ہر اک پیر و جواں کو — دانستہ گنہ گار ہے معلوم نہیں کیوں

جگن ناتھ آزاد

محبت میں انھیں اہلِ نظر کامل سمجھتے ہیں
جو اس طوفان میں ہر موج کو ساحل سمجھتے ہیں

کبھی وہ دن تھے اپنے دل کو ہم اپنا نہ کہتے تھے
مگر اب ہر بشر کے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں

سنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ منزل کو بھی ہم تو جادۂ منزل سمجھتے ہیں

وہی انسان بساحل پر جنھیں طوفاں کا دھوکا ہو
اگر اڑ جائیں طوفانوں کو بھی ساحل سمجھتے ہیں

وہ فن جو تاب لا سکتا نہ ہو دردِ زمانہ کی
ہم ایسے فن کو اک افسانۂ باطل سمجھتے ہیں

ہمیں نے اے محبت قدر پہچانی ہے کچھ تیری
تجھے طوفاں تجھے کشتی تجھے ساحل سمجھتے ہیں

جو دل کا راز بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

زبانوں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

تیری حسیں فضائیں مرے اے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

(جسٹس) سید اخلاق حسین آزاد سیتاپوری

مرا دل اب تری نظروں کے قابل ہوتا جاتا ہے   جفائیں سہتا جاتا ہے مقابل ہوتا جاتا ہے
مدد اے زلفِ جاناں سے تو اب اے گردشِ دوراں   کہ روز افزوں مرا ذوقِ سلاسل ہوتا جاتا ہے
اطمینانِ خاطر مری منظور ہے کیوں ان دنوں اتنی   ہراساں لطفِ بیجا سے مرا دل ہوتا جاتا ہے
لگاوٹ کے یہ چھینٹے ضبطِ غم دشوار کر دیں گے   مرا یہ کارِ مشکل اور مشکل ہوتا جاتا ہے
فلک کی گردشیں زینے ہیں شاید راہِ طالب میں   مہِ نو سے یہ سالک ماہِ کامل ہوتا جاتا ہے
رواں ہے مثلِ رندِ مست اپنی کشتیٔ ہستی   مگر دل ہے پریشاں دُور ساحل ہوتا جاتا ہے

زندگی موردِ آلام ہوئی جاتی ہے   دیکھ اُلفت تری بدنام ہوئی جاتی ہے
ختم مشکلِ دلِ ناکام ہوئی جاتی ہے   دو گھڑی اور ہے بس شام ہوئی جاتی ہے

آنکھ اٹھتی ہے اس پہ ڈر ڈر کے   دیکھ سکتے نہیں نظر بھر کے
یاد میں تیری ساقیٔ گلفام   توڑ ڈالے پیالے بھر بھر کے
اے دلآرام جستجو میں تری   سجدے کرتا پھرا ہوں در در کے
عشق اور ہجر کے سلاسل میں   زندگی کیا؟ کٹے جو مر مر کے
زندگی بھر رہے جو ہم گمراہ   بُت بنائے تھے سنگِ مرمر کے

بلا ہے نشۂ دنیا کہ بعدِ مرگ دن بھی   کسی کا کیف کسی کا خمار باقی ہے
کریم فردِ عمل ہو چکی مری آخر   ابھی حسابِ دلِ داغدار باقی ہے

نامعلوم اشعار

(وہ اشعار جن کی بابت پورا یقین نہیں ہے کہ کس کے ہیں ۔ ناظرین معاف کر دیں اگر غلطی سے پیچھے لکھے ہوئے اشعار پھر لکھ گئے ہیں ۔)

ردیف الف

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غریبوں کا مولا
خطاکار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(حالی)

ہم سے ان سے رسم الفت اٹھ گئی
مدتیں گزریں زمانہ ہو گیا

پردہ داری کے عوض رسوا کیا
اے خیال یار تو نے کیا کیا

یا الٰہی اس کو ہو جمعیت خاطر نصیب
جس نے امیدوں کا شیرازہ پریشاں کر دیا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
اور چپ بھی رہا نہیں جاتا
کمسنی کی وہ ادا شکل وہ بھولی بھولی
حشر میں کون کہے گا اسے قاتل میرا

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے
کسی کا پردہ رکھنا تھا کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا

فرقت میں تری تارِ نفس سینے میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

شبِ فراق تو کچھ ایسی سخت رات نہ تھی
تجھے پکاریں گے وقت آئیگا جو مشکل کا

دل میں اٹھی تھی گدگدی جب ہی سمجھ گیا تھا میں
جوڑتے ہیں کماں میں تیر قصد ہے پھر شکار کا

دامن جو چھو گیا ہے کسی گلعذار کا
ملتا نہیں مزاج نسیم بہار کا
تم آؤ یا نہ آؤ ہمیں اس سے کیا غرض
آنکھوں کو روگ لگ گیا ہے انتظار کا

دیارِ عشق سے اے شہسوار آ جانا
بنونگی راہ میں تیرے غبار آ جانا
رُکے ہوئے ہیں سرِ شکِ وفا ان آنکھوں میں
کروں گی تجھ پہ یہ گوہر نثار آ جانا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا
(ناسخ)

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

مری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

ذرا او جانے والے رُخ سے آنچل تو ہٹا دینا
تجھے اپنی جوانی کی قسم صورت دکھا دینا

عجب تھا وقت نازک مرنے والا تھا کشاکش میں ہمارا سچ سمجھنا ان کا جھوٹا آسرا دینا

لطف آئے جو پچھلے کو سنو کان لگا کر رٹتا ہے عجب لے سے کوئی نام تمہارا

یہ ہزار مشکلوں سے دمِ نزع یاں تک آیا جو کسی کے در پہ مرتا تجھے ناگوار ہوتا

بل ابرووں پر اور نگہ پر جفا جفا اٹھا ہے کبھی نیند سے کوئی خفا خفا

کلی کلی متبسم ہے پھول قہقہہ ریز یہ کس نے سارا چمن گدگدا کے چھوڑ دیا؟

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بےخبر میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
(مومن)

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا یار کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

ردیف د

مسکراتے جاتے ہو کچھ منہ سے فرمانے کے بعد لب کشائی بھی ہوئی ہے راز کھل جانے کے بعد

کر کے گلپاشی وہ میری قبر پر رونے لگے موتی برساتے ہیں گویا پھول برسانے کے بعد

ردیف ر

وہ رنگ و بو بدنِ یار میں جو ہے سو کہاں شگوفے ایسے کھلایا کرے ہزار بہار

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبار انتظار

جہاں تھا تنگ جس طولِ امل کے پھیل جانے سے لحد میں آ گیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

نہ دل میں بدی ہو، نہ کینہ نہ بیر یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

تال ماں چمکے چاندی مچھریا رن ماں چمکے تروار
سبھا میں چمکے سیّاں کی پگیا سجیا پہ بندیا ہمار

سوکھ سوکھ تن کنگری بھیو رنسیں بھیں سب تار روئیں روئیں دھن اٹھت ہے باجت ناؤں تو ہار

ردیف م

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

بانسری بج رہی تھی دور کہیں رات کس درجہ یاد آئے تم

پرستش ہوئی حسن والوں کی یاں تک — کہ بندوں نے سمجھا خدا ہو گئے ہم

ردیف ن

یوں حالِ دل ہم اپنا سنانے میں لگے ہیں — کہتے نہیں کچھ پاؤں دبانے میں لگے ہیں

دیکھا مآلِ عرضِ تمنا دلِ خراب — کتنا ہے فرق جب کی اور اب کی نگاہ میں
وارفتگیٔ شوق کے قربان جائیے — اپنی بلائیں لی ہیں ترے اشتباہ میں

نگہہ لطف ادھر کیوں آئی؟ — میں یہ اندازِ نظر کیا جانوں

آتے ہیں خیالوں میں نگاہوں میں ہماری — اور اس پہ یہ دعوےٰ ہے کہ ہم پردہ نشیں ہیں

سب لوگ جدھر ہیں وہ اُدھر دیکھ رہے ہیں — ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

بجھ گیا دل جو قفس میں وہ نظر ہی نہ رہی — انھیں پھولوں میں نشیمن تھا مگر یاد نہیں

چھوڑتا ہی نہیں ہمیں صیاد — ورنہ پروائے بال و پر نہ کریں

درم و دام اپنے پاس کہاں — چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

ڈرا سموم گلستاں کے نونہالوں کو — خزاں پسند ہوں پروردۂ بہار نہیں

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں
کیسی کیسی صورتیں خواب پریشاں ہو گئیں

کہا کرتے تھے والد قیس کے فرطِ محبت سے
نہ جانے کون سے صحرا میں برخوردار بیٹھے ہیں
ادھر منہار بیٹھے ہیں ادھر منہار بیٹھے ہیں
گھٹنا بیچ میں پہنے وہ چوڑی دار بیٹھے ہیں
(ظریف)

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

جاگ پڑی میں تو پیا کے جگائے
ہوت بھور جب پیا مورے آئے
ان نینن ماں نیند کہاں ہے
جن نینن ماں آپ سماتے

ردیف و

ان دنوں جوشِ جنوں ہے مرے دیوانے کو
لوگ ہر سو سے چلے آتے ہیں سمجھانے کو
شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

حریفِ تلخیٔ لیل و بہار بن کے رہو
نشاطِ جامِ مئے خوش گوار بن کے رہو

رحم آتا ہے نہ اپنے کو نہ بیگانے کو
آج سمجھے تری نظروں سے اتر جانے کو

ردیف ہ

مستی میں بھی سر اپنا ساقی کے قدم پر ہو — اتنا تو کرم کرنا اے لغزشِ مستانہ

ردیف ی

گستاخ بلبلوں سے بھی بڑھ کر صبا ہوئی — کچھ جھک کے گوشِ گل میں کہا اور ہوا ہوئی

کون سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

جبر کی انتہا تو ہوتی ہے — صبر کی انتہا نہیں ہوتی

(اقبال)

نگاہوں میں ہم ذرے ذرے کو رکھتے — درِ یار کی پاسبانی جو ملتی!

وفا سرشت ہوں شیوہ ہے دوستی میرا — نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

رہ گئی بات ۔ کٹ گئی شبِ ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم — بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے — ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

زندگی تنگ ہجر کی حد ہو گئی — دے دیا صدقہ بلا رد ہو گئی

کوئے جاناں سے رُوحِ اہلِ غرور | بن کے طاعت گزار آتی ہے

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں | کوئی آن ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے | گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ | بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لیے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے | مرد کا اعتبار کھوتی ہے (ولی دکنی)

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا | اب تو ہم بھی دردِ دل میں مبتلا ہونے لگے

اگر وہ باغباں ملتا تو اس سے پوچھتے اتنا | نہالِ آرزو کتنے دنوں میں بار لاتا ہے؟

نہ پیام آتا ہے مدت سے نہ یار آتا ہے | دیکھئے کب دل مضطر کو قرار آتا ہے
نہ تو ساغر نہ صراحی نہ صنم پہلو میں | تو کہاں ہجر میں اے ابرِ بہار آتا ہے

دل زلف کے پھندے میں گرفتار نہ ہو جائے | یوسف مرا زنداں کا سزاوار نہ ہو جائے
امید تو ہے حشر میں انصاف کی لیکن | اللہ حسینوں کا طرفدار نہ ہو جائے

زباں کھلی بھی نہ تھی عرض مدعا کے لئے | نظر کی قینچیاں چلنے لگیں سزا کے لئے
کسی نے دل جو لئے تو لبھا لبھا کے لئے | مگر حضور نے خنجر لگا لگا کے لئے

مجھے کب تھا انکار سجدے سے لیکن، جبیں اپنی سجدے کے قابل نہیں ہے

جلیل مانک پوری

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

یاد ہیں وہ دن کہ تم کو دلبری آئی نہ تھی
آنکھ میں جادو نہ تھا لب میں مسیحائی نہ تھی

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہرِ قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

ایک دن دیکھی تھی اس نے وحشتِ مجنوں کی سیر
پھر تو لیلیٰ خود تماشا تھی تماشائی نہ تھی

لطف سے گذری ہماری خانۂ صیاد میں
ہم قفس تھے اور بھی کچھ قید تنہائی نہ تھی

بیقراری کیوں نہ ہو، تازہ شکارِ عشق ہوں
چوٹ وہ کھائی ہے دل پر جو کبھی کھائی نہ تھی

مجھ کو وہ بے نیاز کیا جانے
نازنیں سوز و ساز کیا جانے

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

قیدِ عفت میں ہے وہ محبوس عاشق جاں بلب
نزع میں بیمار عیسیٰ، دامنِ مریم میں ہے

جب اور کسی پر کبھی بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

جو طبیب اپنا تھا دل اسکا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

جو دن ان پر بیت گیو
وہ دن ہم پر آوت ہے

آثارِ سحر مرغِ سحر کو نہیں معلوم
لپٹے رہو سینے سے ابھی رات بڑی ہے

ردیف ے

مجنوں تو سوکھ ساکھ کے اچور ہو گیا   لیلیٰ کا چہرہ مثلِ گلِ ورد تھا سو ہے

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے   اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اگر بجلی کا ڈر ہوگا تو ان کو   بلندی پر ہیں جن کے آشیانے

حسرتِ ہجر نہ ارمانِ وصال اچھا ہے   جس سے بہلا رہے دِل کچھ وہ خیال اچھا ہے

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے   اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

(غالبؔ)

اتنی تخصیص پہ مسرور ہے دل واہ رے دل   چشم پوشی ہے رقیبوں سے اشارے ہم سے

ستم کش آپ کے اس ڈر سے زہر کھا نہ سکے   یہی کہے گا زمانہ کہ ناز اٹھا نہ سکے

(صفیؔ لکھنوی)

کیا جانے کون منزلِ راحت نظر میں ہے   غربت میں ہے سکون نہ آرام گھر میں ہے
تم جگمگا کے جس کی شبوں کو چلے گئے   مدّت سے وہ غریب تلاشِ سحر میں ہے

اللہ ری اک نگاہِ عنایت کی وسعتیں!   جیسے کہ کائنات مری غمگسار ہے

ہمارے غم کی وسعت کچھ نہ پوچھو   کسی کی ہو ہماری داستاں ہے

کل آپ عیادت کو جدھر بیٹھے تھے آکر!
اب تک اسی کروٹ سے یہ بیمار پڑا ہے

یہ کس نے آتے ہی رُخ سے نقاب ہے اٹھا
کہ جھلملانے لگے سب چراغ محفل کے

حشر کے دن اس کا دامن چھوڑ دینا ہی پڑا،
دیکھ کر اتنا کہ منہہ اترا ہوا قاتل کا ہے!

بغیر ردیف قافیہ

بستانِ کربلا کی وہ بوباس، وہ بہار
مرغانِ خوشنوا کا چہکنا وہ بار بار

کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
نالے وہ بلبلوں کے وہ سبزہ وہ لالہ زار

کرتے تھے وجد کبک دری کوہسار میں
بن میں غزال محو تھے ضیغم کچھار میں

(میر مونس)

غنچے کھلے نسیمِ ریاضِ جناں چلی!
باغِ جہاں میں صرصرِ عنبر فشاں چلی

گلشن سے مارے شرم کے بادِ خزاں چلی
ہنس کر کہا بہار نے کیوں؟ اب کہاں چلی؟

سیرِ چمن تو کر کہ یہ دَور اور دَور ہے
غنچے کھلے ہیں رنگِ گلستاں اب اور ہے

(پیارے صاحب رشید)

اے عرشِ بریں تیرے ستاروں کے تصدق
اے دوشِ نبی تیرے سواروں کے تصدق

کوثر ترے مختار کے پیاروں کے تصدق
رضواں ترے گلشن کی بہاروں کے تصدق

سمجھیں گے یہ وہ عارفِ حق مدّ میں جو ہیں
نیکوں میں حسینؑ و حسنؑ اللہ کے دو ہیں

نکہت جو فرشتوں کی فراہم ہو تو کیا ہو
شانِ احمدؐ و حیدرؑ کی جو باہم ہو تو کیا ہو

گر جمع تجلیٔ دو عالم ہو تو کیا ہو　　اللہ کی قدرت جو مجسم ہو تو کیا ہو
ترکیب ہو سبطین پیمبر کے بدن کی
تصویر نظر آئے حسینؑ اور حسنؑ کی

سیّد شہنشاہ حسین ارمؔ لکھنوی

سید شہنشاہ حسین نام - ارمؔ تخلص - لکھنؤ میں پیدا ہوئے - وہیں ابتدائی تعلیم ہوئی، علی گڑھ سے ایف اے کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا - اب سنہ ۱۹۴۷ء سے قیام کراچی میں ہے - محکمہ ریڈیو سے وابستہ ہیں ؛

یہ کیا عالم چشم نم ہو گیا ہے　　زمانہ ہی تصویر غم ہو گیا ہے
نہیں اب تو اتنا بھی احساس باقی　　زیادہ ہے یا درد کم ہو گیا ہے
یہ ہیں کون سی منزلیں زندگی کی　　کہ یکساں وجود و عدم ہو گیا ہے
ہوائیں ہیں آثار دیوانگی کے　　ابھی اس طرف سے ارمؔ ہو گیا ہے

ہر جگہ ہر وقت گویا اک کمی تیرے بغیر　　کیا ہوئی جاتی ہے میری زندگی تیرے بغیر
آہ نکلی، ہونٹ کانپے اشک آنکھوں میں بھر آئے　　مسکرانے کی اگر کوشش بھی کی تیرے بغیر
اے ہمہ حسن و نزاکت، اے مجسّم رنگ و بُو!　　دل گرفتہ ہے چمن میں ہر کلی تیرے بغیر
عشق سے تکمیلِ حسن اور حسن سے تکمیل عشق　　اک کمی میرے بغیر اور اک کمی تیرے بغیر

ہوئے بدنام لے کے نام اپنا　　ورنہ کچھ اور تھا مقام اپنا
کیا بتائیں فریب ہستی کے　　اپنے ہاتھوں بُنا ہے دام اپنا
یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے　　ہم لئے رہ گئے سلام اپنا

صدمے اٹھا رہے ہیں عبث انتظار کے
آئی اگر بہار تو کے دن بہار کے؟

اور کے نقشِ پا کو کیا دیکھیں
راہ اپنی ہی راہ ہوتی ہے
حسن کی ایک بے گناہ نظر
بانیٔ صد گناہ ہوتی ہے

سعیٔ الفت بھی رہے اظہارِ الفت بھی نہ ہو
لیجیے اک اور حلقہ بڑھ گیا زنجیر کا

رات گزری، شمع پگھلی، خاک پروانے ہوئے
ہم یہی سوچا کیے جم لے ذرا محفل ابھی

غرض پر سر جھکانا بارگاہِ بے نیازی میں
وہ جو کچھ اور ہوتا ہو مگر سجدہ نہیں ہوتا

روبروئے یار تاب گفتگو جاتی رہی
یوں ہوئے خاموش جیسے آرزو جاتی رہی
دل کا اک کانٹا سا لیکر اشک نکلے تھے مگر
اے وقارِ ضبط گر یہ آبرو جاتی رہی

ترے بھید سے تجھ کو حیرت میں لاتے
ہم ہی کھو گئے ہیں خبردار ہو کر
بگڑنے کا حق غیر کو تو نہیں ہے
وہ ہو گئے ہیں مجھ سے بیزار ہو کر
اکیلے وہاں دل نے کی ہے خدائی،
جہاں عقل رہ جائے بیکار ہو کر
پہونچکر ہر منزلِ شوق تھم جا
یہیں وہ بھی آئیں گے ناچار ہو کر

آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا؟
دل جس کا ہے آئینہ، سکندر وہ ہے

مُکرنی

کالا رنگ بدن کا بھاری۔ چھوٹی آنکھ بھرے متوالی
دل کا سبھاؤ، دلوں کا ساتھی اے سکھی ساجن! نا سکھی ہاتھی

پہیلی حجّام

آدھا کعبے میں۔ آدھا میخانے میں۔ پورا شہر کی بستی میں
جو آوے آدھ آنے میں

امیر خسروؒ

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درآئے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمرِ کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زِ مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

مُکرنی (جس کے امیر خسرو موجد تھے)

سگری رین موہے سنگ جاگا | بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا | اے سکھی ساجن ! نا سکھی دیا

سرب سلونا سب گن نیکا | وا بن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون | اے سکھی ساجن نا سکھی لون

وہ آوے تب شادی ہوئے | اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول | اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی ڈھول

اونچی اٹاری پلنگ بچھایا | آدھی رات اوی اوپر آئے
کھل گئیں انکھیاں بھیوں انندا | اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی چندا

پھیلیاں

بلیسوں کا سر کاٹ لیا | نا مارا - نا خون کیا

گوشت کیوں نہ کھایا ؟ ڈوم کیوں نہ گایا ؟ ـــــ گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا ؟ سنبوسہ کیوں نہ کھایا ؟ ـــــ تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا ؟ وزیر کیوں نہ رکھا ؟ ـــــ دانا نہ تھا

حضرت حسّامی مانک پوری

حکیم شاہ سردار عالم کے نام سے مشہور ہیں۔ حسّامی تخلص بھی ہے اور نسبت نسبی بھی۔ مانکپور شریف کے رہنے والے ہیں مقدس آغوش میں پرورش پائی۔ علمی و مذہبی ماحول میں نشو ونما ہوئی۔ یا یوں سمجھئے کہ خانقاہ میں پیدا ہوئے۔ درسگاہ میں پڑھا اور اہلِ علم وارباب تقویٰ و تہذیب میں پروان چڑھے۔ تعلیم عربی و فارسی کی کافی اونچی ہے۔ اساتذہ میں ہر فرقہ و عقیدہ کے لوگ رہے۔ یعنی شیعہ، سنّی، مقلّد، غیر مقلّد، دیوبندی اور بریلوی وغیرہ جس کے لئے وہ خود فرماتے ہیں :-

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

ردیف الف

پریشاں خاطروں کو راہ پر لانا نہیں آتا — تمھیں تو اپنی زلفوں کو بھی سلجھانا نہیں آتا
جہاں سے بے طلب ملتا ہے اس در کا بھکاری ہوں
نہیں آتا ہے مجھ کو ہاتھ پھیلانا نہیں آتا
یہ ڈر ہے حسن کی دنیا تہ و بالا نہ ہوجائے — دل مضطر کو ورنہ کیا تڑپ جانا نہیں آتا
بس اتنی بات پر محرومِ جلوہ مجھ کو رکھا ہے
کہ موسیٰ کی طرح بے ہوش ہوجانا نہیں آتا

بسترِ خواب پہ او مستِ مئے عشرتِ خواب — منظرِ بارشِ انوارِ سحر بھول گیا
پائے نازک میں نہ لگ جائے کسی کے ٹھوکر — آج سجدہ میں کہیں رکھ کے میں سر بھول گیا
اے حسامی شبِ فرقت کی سحر ہو کیونکر — زلف بکھرا کے کوئی تا بہ کمر بھول گیا

جھیل کرنا کا میاں دل کام کا ہو جائے گا
واقفِ آدابِ تسلیم و رضا ہو جائے گا
ذرّہ ذرّہ پر یونہی مشقِ جبیں سائی رہے
اے حسامی کوئی سجدہ تو ادا ہو جائے گا

مرضیٔ دوست کا گر پاس نہ ہوتا اے دوست
کون یہ زندگیٔ تلخ گوارا کرتا؟
میں سمجھتا تھا کہ پھر فصلِ بہار آئے گی
چار دن کے لئے دامن کو رفو کیا کرتا
شکر کر شکر حسامی، یہ شکایت کیسی؟
وہ جفا بھی جو نہ کرتے تو کوئی کیا کرتا؟

ردیف ن

اِس درجہ نامرادِ تمنّا رہا ہوں میں
اب ان کی آرزو سے بھی کترا رہا ہوں میں
الجھا رہا ہوں مدّتوں زلفِ دراز میں
اب گتھیاں حیات کی سلجھا رہا ہوں میں

ردیف و

لے رہی ہیں پھر ادائیں حُسن کی انگڑائیاں
پھر سکون و ضبط کی دنیا تہ و بالا نہ ہو
تیرے سجدے ہیں ودیعت آستانِ یار کی
نا سمجھ ہر ایک در پر ناصیہ فرسا نہ ہو
کام ہے جو آج کا کل پر اٹھا رکھّا ہے کیوں
اے حسامی! کل خدا معلوم کیا ہو کیا نہ ہو

ہمہ وقت پیشِ نظر زلفِ پُر خم
پریشاں خیالات! ارے کچھ نہ پوچھو
حسامی! دکھائے محبت نے کیا کیا
مجھے سبز باغات ارے کچھ نہ پوچھو

ردیف ے

زلفِ سیاہ میں نہ رخِ سیم بر میں ہے
کہتے ہیں جس کو حسن ہماری نظر میں ہے

طفلی، شباب، شیب، محبت کے واقعات
کس درجہ طول زندگی مختصر میں ہے

اے حسامی! جس پہ ابنائے جہاں کو ناز ہے
ہے وہ دنیا تو مرے قدموں کی ٹھکرائی ہوئی

زندگی کی راہ میں لازم ہے ہوش و احتیاط
درس گاہِ دہر میں اک امتحاں ہے زندگی
اے حسامی جاں نثارِ دوست ہونا کیا کمال
کام آئے غیر کے تو کامراں ہے زندگی

داستانِ حیات کچھ بھی نہ تھی
یاد رکھنے کی بات کچھ بھی نہ تھی
دے دیا ذوقِ گفتگو نے طول
سچ تو یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہ تھی

اے حسامی! دل سے کرتا ہوں میں دردِ دل کی قدر
ساری دنیا میں یہی اک چیز انساں ساز ہے

اس کے نصیب مرحبا جس پہ کریں وہ کچھ جفا
لطف و کرم کا ذکر کیا لطف و کرم تو عام ہے

رنگینیٔ بہار کا اللہ رے فریب
کہلا رہے ہیں پھول گلستاں کے خار بھی

زمانے میں لاکھ انقلابات آئے
نہ اہلِ یقیں کے قدم ڈگمگائے
حسامی عجب رنگِ اہلِ چمن ہے
کہ شبنم جو روئے تو گل مسکرائے

پیشتر اپنے ہی رونے پہ ہنسی آتی تھی
اب سمجھتا ہوں یہی دیدۂ تر سب کچھ ہے

سلطانہ سحابؔ

آدمی اِک تضادِ باہم ہے — کبھی جنّت، کبھی جہنّم ہے
غم ہے اک نعمتِ خداوندی — جتنا برتو اسی قدر کم ہے
التفات آپ کا بجا لیکن — کیا خوشی ہے کہ آنکھ پرنم ہے
بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم — دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے
اب کسی سے گِلہ نہیں ہم کو — اپنی دنیا ہی اپنا عالم ہے

سید مظفر حسن ظفرؔ زیدی، جون پوری

(الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں!)

مشاہدہ ہے شبستانِ زندگی کا یہی!! — چراغ بجھتے نہیں ہیں بجھائے جاتے ہیں
کیا کرے انساں تدارک کی کوئی صورت نہیں — غم مقدر ہے معین غم کی نوعیت نہیں
گداز غم نے جو پیدا کیا طبیعت میں — ظفرؔ یہی تو ہے معراج آدمی کیلئے

باغ میں گلگشت کب تک؟ اے نسیم جانفزا — کتنے جادے منتظر ہیں اس خرام ناز کے
ہیں رواں منزل کی جانب جن کو جانا تھا ظفرؔ — ہم ابھی جھگڑے میں ہیں انجام اور آغاز کے

ستم ہے طبیعت کا حسّاس ہونا — اگر لب کشائی کی جرأت نہیں ہے
ظفرؔ اب ہوا ہے یہ رنگ طبیعت — کوئی جیسے رنگ طبیعت نہیں ہے
عزیز ہوگی جو بے لوث دشمنی ہوگی — خیال کیجئے کیا چیز دوستی ہوگی؟

ھندی

کبیر

پریت کرے تو اَس کرے سب دن نبھت جائے
ایسی پریت نہ کیجئے بالُو اَس اُدھرائے

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
مَیں میلی پیا اوجلے کِس بِدھ ملنا ہوئے

نامعلوم

آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل ہو جل جائے
پاپی جیرا نا جلے جا میں آہ سمائے

پیارے ھمیری نیند کی بات تمہارے ہاتھ
آدت تھی تم ساتھ ہی گئی تمہارے ساتھ

سجن سکارے جائینگے اور نین مرینگے روئے
بِدھنا ایسی رَین کرو کہ بھور کبھی نا ہوئے

گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے
سُولی اوپر سیج پیا کی کِس بِدھ ملنا ہوئے

میرا بائی

کاگا سب تن کھائیو اور چُن چُن کھائیو ماس
دو نینان مت کھائیو کہ پیا مِلن کی آس

دھان نہ بھاوے نیند نہ اوے برہ ستاوے موُنھ
گھائل سی گھومت پھِروں مین میرا درد نہ جانے کوئے

ملک محمد جائسی

نینوں اندر آؤ تو نین جھانپ توہے لوں !
نا میں دیکھوں اور کا۔ نا تُو ہے دیکھن دُوں

جیسے پھول گلاب کا سُوکھے اَدھِک بِسائے
تیسے پریت سُوشیل[۲] کی دِن دِن پہ اَدھکائیے

پیتم[۱] باتی پریت کی ہم سے رکھی نہ جائے
ٹپک ٹپک انسواں چُوَت انچھر[۳] تک ہنسات[۴]

چاتک[۵] چاہت سُواتی[۶] جل۔ چکی[۷] چاہت بھور
ویسے ہم تم ملن کو جیسے چندر چکور

۱۔ محبوب۔ ۲۔ اچھی ۳۔ حروف۔ ۴۔ مٹ جانا۔ ۵۔ پپیہا۔ ۶۔ آب نیساں۔ ۷۔ سرخاب چڑیا ؛

(حضرت عباسؑ کی بیوہ کی زبان سے حضرت عباسؑ کی شہادت پر)

دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تم کو بھا گئی ۔۔۔ جاگے تمام رات کے تھے نیند آ گئی
صورت تمہیں عروسِ شہادت دکھا گئی ۔۔۔ کیا خوش نصیب تھی کہ اجل تم کو پا گئی

ہم بدنصیب ہجر کی راتوں میں روئیں گے
جاگے نصیب قبر کے آپ اسمیں سوئینگے (میر انیس)

چشم بد دور عجب خوش قد و قامت ہوگا ۔۔۔ اب تو فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگا (تراب)

وصالِ یار سے دونا ہوا عشق! ۔۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی (عشرتی)

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے ۔۔۔ میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پہ عارف

اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے ۔۔۔ کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے (نامعلوم)

خالِ رخِ یار پر فدا ہوں ۔۔۔ اتنی سی بلا میں مبتلا ہوں (نامعلوم لڑکے کا شعر ہے)

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام ۔۔۔ بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا (شیفتہ)

کل جو اٹھے تھے بٹھانے کے لئے ۔۔۔ آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لئے

ملاتے ہیں جا جا کے دریا میں آنسو ۔۔۔ جو میلا ترا پیرہن دیکھتے ہیں
(تعشق)

ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح ۔۔۔ سلگ رہے ہیں مرے استخواں اگر کی طرح
تمھارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں ۔۔۔ پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح
(انیسؔ)

پگھلا نیلم

سجاد ظہیر مرحوم کو ادبی حلقوں میں سب ہی جانتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانی کے طور پر اردو ادب کی تاریخ میں ان کا ایک مستقل مقام بھی ہے۔ مرحوم کی شاعری سے پاکستان میں بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ۱۹۶۴-۶۵ء میں انکا یہ مجموعہ ہندوستان میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سجاد ظہیر نے بحور، اوزان اور ارکان کے مروجہ طریقوں کو ارادتاً ترک نہیں کیا ہے لیکن اپنے شعری مقصود کو حاصل کرنے کے لئے نئے آہنگ اور نئے ترنم کا سہارا لیا ہے جو نہایت دلفریب ہے۔ جس خاص کیفیت کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اور جس شعری پیکر کی تخلیق انکا مدعا تھا وہ صرف اسی طرح ادا ہو سکتا تھا۔ سجاد ظہیر کی شاعری اردو کے شعری ادب میں ایک نئے انداز کو جنم دیگی۔

قیمت آٹھ روپے

سرِ وادیٔ سینا

فیض احمد فیض کے کلام کا یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہے کہ تین سال کی مختصر مدت میں اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے میں فیض کی مشہور نظمیں زنداں زنداں شورِ انا الحق، یوں سجا چاند، دلدار دیکھنا، دعا وغیرہ شامل ہیں فیض کے کلام کے بارے میں کسی اشتہاری مضمون کی ضرورت ہی نہیں، اردو ادب کی تاریخ فیض کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جا سکتی اور اردو ادب کے شائقین فیض کے کلام سے ہمیشہ محظوظ ہوتے رہیں گے۔

قیمت چھ روپے

بدن دریدہ

پتھر کی زبان کے بعد اردو کی معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض کی چھ سالہ کاوشوں کا یہ انوکھا مجموعہ اب شائع ہو چکا ہے۔ اس میں انکی مشہور نظمیں، بدن دریدہ، شہر والو سنو، اور زبان کا بوسہ بھی شامل ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری آج کل ہر ادبی محفل میں زیرِ بحث ہے، کوئی انکی جرأت اور صاف گوئی کی داد دیتا ہے اور بعض لوگ انہیں باتوں پر سیخ پا ہیں۔ فیصلہ قارئین کریں گے۔

قیمت چھ روپے پچھتر پیسے